تحریکِ آزادی
اور
مسلمان
تالیف
میرادروی
دارالمؤلفین، دیوبند

تحریکِ آزادی اور مسلمان

تالیف

اسیر ادروی

ناشر

دار المؤلفین دیوبند، یوپی

نام کتاب : تحریک آزادی اور مسلمان

تالیف : اسیر ادروی

اشاعت دہم : جنوری ۲۰۱۰ء

تعداد : ۱۱۰۰

مطبع : سٹی آفسٹ دہلی

قیمت : Rs 240.00

ناشر : دار المؤلفین دیوبند-247554 یوپی

DARUL MUALLAFEEN
Deoband 247554(U.P.)

Ph.(Off) : 01336-223266
Ph.(Res) : 01336-222469
Fax. : 01336-223266
Mob. : 09359210262
Email: kutubkhanahusainia@yahoo.com

دہلی میں ملنے کا پتہ:

کتب خانہ عزیزیہ
اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006

ترتیب

جب پڑا وقت گلستاں پہ تو خوں ہم نے دیا
جب بہار آئی تو کہتے ہیں ترا کام نہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

سخنِ اوّلیں

ہندوستان میں انگریزوں کی جابرانہ حکومت اور اُن کے ظلم و استبداد کے خلاف غیور ہندوستانیوں نے روزِ اول ہی سے اپنی مزاحمت کا سلسلہ جاری رکھا، اور یہ مزاحمت رفتہ رفتہ ایک زبردست تحریک بن گئی جو ہندوستان کی آزادی کے لئے اس قدر سرگرم ہوئی کہ انگریز جیسی ناقابلِ تسخیر طاقت اسے نہ دبا سکی، یہ اُن بیش بہا قربانیوں کا نتیجہ تھا جو اس تحریک کے شرکا نے ایک صدی کے اندر پیش کی تھیں اور انھوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اب ہندوستانی کسی حال میں غیر ملکی حکمرانوں کو قبول نہیں کریں گے۔

اس تحریک میں یوں تو ہندو اور مسلمان سب ہی شریک رہے، لیکن مسلمانوں نے اپنے مخلص رہنماؤں اور علمائے دین کی قیادت میں جو نمایاں حصہ لیا اور زبردست قربانیاں پیش کیں وہ عام طور پر نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہیں، اگر لاعلمی کا یہی حال رہا تو شاید آنے والی نسل کو یہ یاد بھی نہ رہے گا کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں ہمارا اور ہمارے اسلاف کا بھی ناقابلِ فراموش کردار تھا۔ ایسا کردار کہ جس کی بدولت انگریزوں کا اقتدار صرف ہندوستان ہی سے نہیں، بلکہ ایشیا و افریقہ کے ان مسلم ممالک سے بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا جہاں اس کا پنجہ مضبوط اور اس کا زوال موہوم تھا۔

مولانا اسیر ادروی صاحب کو تحریکِ آزادی اور اس کی تاریخ سے خاص لگاؤ اور دلچسپی رہی ہے، اسی لئے انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھا کر ایک خوشگوار فریضہ ادا کیا۔ اور ایک ایسی مختصر مگر جامع تاریخ مرتب کر دی کہ جس سے ہماری موجودہ

مسلمان نسل اپنے ماضی اور اپنے اسلاف کے مجاہدانہ کارناموں سے واقف ہوکر اُن کی طرح اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کا عزم کرتے ہوئے زندگی کے میدانوں میں رواں دواں رہے گی۔

خدا تعالیٰ مولف کی سعی کو قبول فرمائے اور مطالعہ کنندگان اس سے مستفید ہوں۔

وحید الزماں قاسمی کیرانوی
استاذ دارالعلوم و معتمد دارالمؤلفین دیوبند
۷ر محرم الحرام ۱۴۰۹ھ، ۲۱ر اگست ۱۹۸۸ء

آغازِ کلام

جو قوم اپنے ماضی سے کٹ جاتی ہے اس کا وجود بحیثیت ایک قوم کے صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے کیونکہ اس کے امتیازات، اس کی خصوصیات وکمالات، غیرت وخودداری کے جذبات اور عظمت وشرافت کا جو سرچشمہ تھا جب اس سے رشتہ ٹوٹ گیا تو اس کی رگوں میں وہ گرم خون کہاں سے آئے گا جو اس کے جسم میں زندگی کی توانائیاں اور اپنی عزت واقتدار پر کٹ مرنے کا حوصلہ اور جذبہ پیدا کرتا تھا، اسی لئے ہر زندہ اور حوصلہ مند قوم اپنی قومی تاریخ کو حرزِ جاں بنائے رکھتی ہے۔

مسلمان ہندوستان میں تاریخ کے جس دور میں آئے اس وقت یہاں کا ماحول اور اور حالات آج سے زیادہ امید افزا نہیں تھے، لیکن وہ حالات اور ماحول کی شکایت میں نہیں لگ گئے بلکہ خود عزم وہمت کو ہمرکاب لیکر انھوں نے حالات کو سازگار بنایا، اپنی عظمت وشرافت، اصول پرستی، عدل ومساوات اور انسانیت نوازی کے کارناموں سے یہاں کے لوگوں کو روشناس کرایا، اپنے بلند اخلاق، رواداری کے مخلصانہ جذبات کا مظاھرہ کرکے اتنا متاثر کیا کہ ہندوستان کی سرزمین نے ان کیلئے اپنی آغوشِ محبت کھول دی اور انکو عزت واحترام کے بلند مقام پر بٹھایا، تاریخ کی ایک لمبی مسافت ہے جو ہم نے اس سرزمین میں عظمت وسربلندی کے لہراتے ہوئے پرچم کے سایہ میں طے کی ہے، یہاں کی گلریز وادیوں نے ہمارے پاؤں چومے اور سنگلاخ پہاڑیوں نے جھک کر ہمارے قدموں کو بوسے دیئے

مئی ۱۸۵۷ء کی تاریخ ہمارے اس پر وقار سفر کی آخری سرحد ثابت ہوئی اور اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ہم خون کے دریا میں ڈوب گئے اور پھر اس سے نکلنے کیلئے ہماری کوئی چھلانگ کامیاب نہ ہو سکی۔

ہندوستان ہمارا وطن ہے

تاریخ کے اس پورے دور میں ہم نے اپنے آپ کو یہاں کی آب وہوا کے موافق بنایا، ہمارے ذہن ومزاج میں ایک جنگ آزما قوم ہونے کی وجہ سے جو درشتی وکرختگی تھی اس میں یہاں کی نرم رو اور گلبار ہواؤں نے اعتدال پیدا کیا، ہم اپنے ساتھ ادب وتہذیب، اخوت ومساوات کا سرمایہ لے کر آئے تھے اس کو ہم نے یہاں کے باشندوں میں پوری فیاضی سے لٹایا اور یہاں کی زرخیز مٹی نے علم وحکمت کے جو ذخیرے محفوظ رکھے تھے ہمارے قدموں میں ڈال دیے، ہم نے یہاں کے ذرّے ذرے سے محبت کی، یہاں کے چپہ چپہ کو اپنے جذبۂ عشق کی سجدہ گاہ بنایا، یہاں کی محبت ریز سرزمین نے ہمارے دلوں کو جیت لیا اور ہم بہت جلد بھول گئے کہ ہم کہاں سے آئے تھے اور کون سی سرزمین ہمارا وطن تھی ٹھیک ویسے ہی جیسے ہم سے پہلے آنے والی آرین قوم اپنے وطن کو فراموش کر کے یہاں رہ پڑی تھی، ہم کو ہمارے اس نئے وطن نے وہ محبت دی اور شفقت وعنایت کا ہاتھ ہمارے سروں پر رکھا، ہمارے حوصلوں ہماری اُمنگوں کو رعنائیاں اور شادابیاں دیں کہ ہم نے چند ہی دنوں بعد اس کو مادرِ وطن کا پُرعظمت مقام دے دیا، اس کی خدمت ہماری سعادت بن گئی، اس کی حفاظت اور اس کا احترام ہمارے لئے سرمایۂ افتخار بن گیا، اس کی آغوش ہمارے لئے آغوشِ شفقت ومحبت بن گئی، آج ان ساری حقیقتوں اور صداقتوں پر ڈیڑھ ہزار سال کی طویل مدت گذر چکی ہے اور ماضی کے اسکرین پر ان مناظر کی تصویریں مُرتسم ہیں جو ہمیں ہمارے سنہرے ماضی کی یاد دلاتی رہیں گی انھیں بھول جانا ہماری قومی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہوگا۔

عروج کے بعد زوال

قانونِ فطرت کا عمل خاموشی کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ کسی قوم میں زیادہ عرصہ تک اقتدار کا مُرتکز ہو جانا بہت سی کمزوریوں اور خامیوں کا باعث ہوتا ہے میر جعفر، میر صادق، الٰہی بخش جیسے افراد کا وجود اسی

قانونِ فطرت کے تحت تھا، ایک نئی قوم کا نیرِ اقبال طلوع ہو رہا تھا، اس کی روشنی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی، لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہوتی جا رہی تھی، انگریزوں کے اقتدار کا سورج بنگال کے مطلع سے طلوع ہوتا ہے، چڑھتے ہوئے سورج کی پرستش کرنیوالوں کا رخ بہت جلد اس کی جانب پھر گیا انھوں نے طلوع ہونے والے اور چڑھتے ہوئے سورج کی عظمت، آب و تاب، آنکھوں کو خیرہ کرنے والی چمک دمک کی سمت ایک نگاہ ڈالی اور پکار اٹھے ھٰذَا رَبِّیْ ھٰذَا اَکْبَرُ، ایسے ہی ضمیر فروشوں نے اپنی قوم، اپنے مذہب، اپنے وطن سے غداری کی، انھوں نے سوداگروں کی ایک قوم کے ہاتھوں اپنی قوم، اپنے مذہب اور اپنے وطن کا سودا کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری عظمت و سربلندی نے مئی ۱۸۵۷ء میں زندگی کی آخری ہچکی لی اور ہم جسدِ بے روح ہو کر رہ گئے۔

ہمارے اسلاف ہمارے آباواجداد نے ہندوستان کی عظمت اور آزادی کو پامال کرنے والی اس سفید فام قوم کو اپنی رگوں کے خون کے آخری قطرے تک برداشت نہیں کیا۔ ہندوستان میں بسنے والی ہندوستانی قوم جو مختلف مذاہب اور مکتبۂ فکر کی تہذیب اور تمدن کے مختلف و متضاد عناصر کو لے کر وجود میں آئی تھی اس کی عزت و حرمت بچانے کیلئے پہلے پہل ہم نے خود اپنی ذات کو قربانی کیلئے پیش کیا، ۱۸۵۷ء کے بعد نصف صدی تک انگریزی سامراج کو شکست دینے کیلئے ہم تنِ تنہا جنگِ آزادی کے میدان میں زور آزمائی کرتے رہے اور ہم نے اس راہ میں اپنا خون اتنا بہایا کہ پوری جنگِ آزادی میں دوسروں نے اتنا پسینہ بھی نہیں بہایا ہوگا۔ لال قلعہ کی فصیلوں سے ۱۸۵۸ء میں ہماری عظمت کا ہلالی پرچم اتار کر یونین جیک لہرایا گیا، ایک طرف انگریز ہماری عظمت و اقتدار کے قلعہ پر اپنے اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا دوسری طرف ہم جنگِ آزادی کے میدان میں اس سے مقابلہ کے لئے صف بندی کر رہے تھے ہم نے برطانوی سامراج کا مقابلہ کرنے کیلئے آگے بڑھ کر سب سے پہلے جھنڈا بلند کیا، ہم نے برادرانِ وطن کا انتظار نہیں کیا جنگِ آزادی کے میدان میں ہماری جگہ ہمیشہ صفِ اول میں رہی اس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں۔

غلط قیادت کا تباہ کن نتیجہ

آج ہم جن حالات سے گذر رہے ہیں وہ ہماری جذباتی سیاست، غلط اور غیر مخلص قیادت کا ثمرہ ہے۔ ہم نے قیادت کے انتخاب میں ہوش کے بجائے جوش سے مشورہ لیا اور اسی کی رہنمائی میں چل پڑے قائد کے خلوص اور صداقت کو پرکھا نہیں اور آگے بڑھ کر زمامِ قیادت اس کے ہاتھوں میں دے دی اور جب کوئی قوم سیاست کے میدان میں ایک قدم بھی غلط اٹھا دیتی ہے تو ایک صدی پیچھے چلی جاتی ہے اور اس کو اپنی اس غلطی کا خمیازہ نسلاً بعد نسل بھگتنا پڑتا ہے، ہم نے چالیس سال قبل قیادت کے انتخاب میں جس غلطی کا ارتکاب کیا تھا، آج تک اسی کی سزا بھگت رہے ہیں، یہ سزا قانونِ فطرت کے لازمی نتیجہ کے طور پر ہے، اس صدی کا سب سے بڑا سانحہ مسلمانوں کی قیادت کا غلط ہاتھوں میں پڑنا تھا اور اس نے جذباتی فیصلے کر کے قوم کو ایسی راہ پر ڈالدیا جس راہ میں آگے چل کر تباہیوں اور بربادیوں کے ڈیرے تھے، آفات و مصائب کی کانٹوں بھری وادیاں تھیں، آگ اور خون کے دریا حائل تھے، مسلمان آج اسی راہ کا مسافر ہے جس پر کل اس کی قیادت نے ڈالا تھا، وقت کا دھارا موڑنے کی طاقت اس میں نہیں ہے کیونکہ یہ قانونِ فطرت کے خلاف ہے کیونکہ جب قوم کوئی غلطی کرے گی تو اس کو پورا پورا خمیازہ بھگتنا ہی ہوگا، اسی وجہ سے ہم آج چالیس سال سے مسلسل آگ اور خون کے دریا میں ڈوبتے اور تیرتے گذر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال نے نئی نسل کو یاس و قنوطیت کا شکار بنا دیا ہے۔

مایوسی کفر ہے

مسلمانوں کے مذہب میں مایوسی کفر ہے، یہ ایسی بیماری ہے جو قوموں کے جسم سے عزم و عمل کی توانائیوں کو سلب کر لیتی ہے، اس قوم کے جذبات حالات کی برفیلی فضا میں ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں، زندگی کی اُمنگیں رخصت ہو جاتی ہیں اور مسلسل احساسِ کمتری میں مبتلا رہ کر بتدریج قعرِ مذلت میں گرتی چلی جاتی ہے کیونکہ وہ ہمت و حوصلہ ہار چکی ہوتی ہے۔ اور قدرت کا ضابطہ یہی ہے کہ جو قوم اپنی ذلت و نکبت پر راضی رہ کر جدوجہد کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتی ہے تو قدرت کی جانب سے وہ مدد سے محروم ہو جاتی ہے، اسلئے سب سے پہلے مسلمانوں کو اپنے ذہنوں سے احساسِ کمتری اور مایوسی

وناامیدی کو جھٹک کر دور کر دینا ضروری ہے، اور پھر حالات اب ایسے مایوس کن بھی نہیں رہے، اب بھی ہم میں مدافعت کی توانائیاں موجود ہیں مصائب کو جھیل جانے کی قوت ہمارے اندر ہے، ملک میں ذہنی وفکری انقلاب کی ایک نئی لہر پیدا ہو رہی ہے اور جن طاقتوں سے ہم خوف کھاتے ہیں انھیں سے ہماری حمایت و مدد کی ایک ایسی زبردست طاقت اُبھرنے والی ہے کہ اگر ہم نے اپنی صلاحیت و قوت کو برقرار رکھا اور اس سے کام لیتے رہے تو یقین ہے کہ راستہ کا کہرا ہمارے سروں سے بہت جلد چھٹ جائے گا، اگر کچھ دیر ہے تو اس ذہنی انقلاب کے نئے سورج کے طلوع ہونے کی ہے اور اس کا وقت اب بہت قریب آگیا ہے، ہندوستان کے سیاسی اُفق پر سرخی بڑھتی جا رہی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ ایک نئے سورج کے طلوع ہونے کا وقت بہت قریب آگیا ہے، جس سے ہمارے مستقبل کی راہیں روشن ہو جائیں گی اور اس ملک میں ہمارا ترقی کا سفر قدرتی رفتار سے شروع ہو جائے گا۔

پیشِ نظر کتاب یہ کتاب میں نے اسی سفر کیلئے بطورِ زادِ راہ پیش کی ہے میں نے حوالوں سے اس کتاب کو گرانبار نہیں بنایا ہے، البتہ تاریخ کے جن واقعات اور جدوجہد کی جن سرگرمیوں کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے وہ مستند مصنفین کی کتابوں سے ماخوذ ہیں جنگِ آزادی کا پورا دور تاریخ کے اُجالوں میں گذرا ہے اس میں غلط بیانی پر زیادہ دیر تک پردہ پڑا نہیں رہ سکتا ہے۔ ہندوستان کی نوے سالہ جنگِ آزادی کے موضوع پر ہر زبان میں اتنی زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں کہ کوئی شخص غلط بیانی سے کام لیکر حقائق پر پردہ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اس کتاب میں ہر باب کے آخر میں "شمعِ آزادی کے پروانے" کے عنوان سے ان لوگوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو اس دور میں ان مختلف تحریکات اور جدوجہد میں مصروف رہے جن کا اس باب میں ذکر کیا گیا ہے، انھوں نے جنگِ آزادی کی راہ میں قربانیاں دیں مادرِ وطن کی عظمت وحرمت اور اس کی آزادی کیلئے اپنی جانیں دی ہیں یا رؤسا وامراء علماء وفضلاء جو اپنے دور میں انتہائی معزز سمجھے جاتے رہے مگر آزادی حاصل کرنے کے جرم

میں گرفتار ہو کر جیلوں میں چکیاں پیسیں، کوڑے کھائے، کالے پانی بھیجے گئے، صفوں میں کھڑا کر کے گولی ماری گئی، پھانسی کے تختے پر چڑھائے گئے۔ برسہابرس برطانوی جیلوں میں مشقتیں اٹھائیں، ایسے افراد میں بیشتر لوگوں کے نام میں نے سٹی کالج کلکتہ کے شعبۂ تاریخ کے صدر مسٹر شانتی مے رائے کی کتاب "رُول آف انڈین مسلمس اِن دی فریڈم مووِمنٹ" (ROLE OF INDIAN MUSLIMS IN THE FREEDOM MOVEMINT) سے لئے ہیں جو انگریزی زبان میں سو صفحات کے قریب کا ایک مختصر سا رسالہ ہے اور سرکاری ریکارڈ کو پیشِ نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اور انتہائی مستند ہے، بقیہ دوسرے ناموں کا اضافہ مختلف کتابوں، رسالوں، اخباروں اور ذاتی معلومات کی بنا پر کیا گیا ہے، اس فہرست سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ میں تحریکِ آزادی میں حصہ لینے والوں کو بالاستیعاب ذکر کر دوں، ممکن ہے اس فہرست میں بہت سے مشاہیر کے نام بھی نہ ہوں کیونکہ میرا مقصد ایک مکمل فہرست بنانا ہی نہیں ہے، البتہ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ بتاؤں کہ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں ایسے لوگوں کی خاصی تعداد تھی جنھوں نے تحریکِ آزادی کی راہ میں بڑی قربانیاں دی ہیں اب اگر چند افراد کا بھی اس طبقہ کے لوگوں میں سے ذکر آ گیا تو اس طبقہ کی نشاندہی ہو گئی، میرے لئے یہی کافی تھا۔

اسلاف کے کارناموں کو آپ کے سامنے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ انکو ہمیشہ یاد رکھیں کیونکہ یہ آپ کی توانائیوں کا سرچشمہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ مسلمان اپنے ان اسلاف کے جذبات اور قوتِ عمل کا امین اور وارث بن جائے اور زندگی کی نئی راہوں پر پورے خلوص واعتماد کے ساتھ گامزن ہو جائے اور احساسِ کمتری کو اپنے صفحۂ ذہن سے کھرچ کر پھینک دے تبھی اس ملک میں عزت کی زندگی گذارنے کا حقدار ہو سکتا ہے، بس انھیں پاکیزہ جذبات کے ساتھ یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

اسیر ادردی

جامعہ اسلامیہ بنارس ۲۶ رجنوری ۱۹۸۸ء

تاریخِ آزادی پر ایک طائرانہ نظر

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ایک نئے ہندوستان نے جنم لیا، جذبات کی رَو تھم گئی اور اس کی جگہ سنجیدگی و متانت اور تدبر و فراست نے لے لی، ملک کی تعمیر نو کے لئے ہم نے بہت سے موقعوں پر تخریب کی حشر سامانیوں کو بھی اپنانے سے گریز نہیں کیا کیونکہ تخریب تعمیر کی پہلی منزل ہوتی ہے۔ لیکن اب جبکہ اپنے ملک اپنے وطن اپنی قوم کو بنانے کے اختیارات ہمارے ہاتھوں میں آگئے تو ہمارے سامنے تعمیر نو کے سوا اور کوئی پروگرام اور لائحہ عمل نہیں رہا لیکن ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ایک تلخ حقیقت جو تقسیمِ ملک کی شکل میں ہمارے سامنے آئی، اس نے بہت سے دل و دماغ میں ردِ عمل کا ایک ایسا جذبہ پیدا کر دیا جس نے آخر میں منافرت، بدگمانی اور تنگ نظری کو جنم دیا، چونکہ تقسیم کے اثرات انتہائی دلدوز اور روح فرسا ہونے کے ساتھ ساتھ دور رس اور دیرپا بھی ہوئے اسلئے اس کی لپیٹ میں ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ بھی آگئی اور واقعات کو اس ڈھنگ سے پیش کیا جانے لگا کہ مسلمان جو ایک صدی سے جنگِ آزادی کے میدان میں اگلی صفوں میں تھا، اس کو واقعات کے اسٹیج سے ہٹا دیا گیا اور اس کے عظیم کارناموں پر یا تو دبیز پردہ ڈال دیا گیا یا انکی جدّوجہد کے واقعات وحقائق کو اس ڈھنگ سے پیش کیا گیا کہ انکی اصلی صورت مسخ ہوکر رہ گئی۔

ایک سرسری جائزہ

اس لئے ضرورت ہے کہ جنگِ آزادی کا ایک سرسری جائزہ لے لیا جائے۔ پوری انیسویں صدی میں جبکہ آزادی کا صرف ایک ہی راستہ سمجھا جا رہا تھا اور وہ تھا طاقت اور تشدد کا استعمال، خلفشار اور بدامنی پیدا کرنا، بغاوت کے جذبات کو ہوا دینا، اس پورے دور میں مسلمان تنہا برطانوی حکومت سے

نبرد آزما رہا۔

انگریزوں اور انگریزی حکومت سے انتہا پسندانہ نفرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے انگریزوں کے ہر ہر اقدام کی مخالفت کو اپنا مذہبی شعار بنا لیا، حد تو یہ ہے کہ بعض انتہا پسند مسلم رہنماؤں نے انگریزوں کو کتے اور خنزیر کی طرح نجس اور ناپاک سمجھا، اور اگر سوءِ قسمت سے انھیں کسی انگریز سے ہاتھ ملانا ہی پڑا تو وہ اپنے ہاتھ کو اس طرح الگ کئے رہتے جیسے کسی گندی اور ناپاک چیز کو چھو دیا ہے اور جب تک اُسے دھو کر صاف نہیں کر لیتے تھے اس وقت تک اس سے کوئی دوسرا کام نہیں کرتے تھے۔

اس انتہا پسندانہ نفرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے انگریزی تعلیم کو حرام قرار دیکر پوری مسلمان قوم کو جدید تعلیم سے بے بہرہ کر دیا، اور آدھی صدی تک مسلمانوں پر انگریزی تعلیم کے دروازے کو پوری قوت سے بند رکھا اور پھر بھی جب کچھ لوگوں نے کسی طرح انگریزی تعلیم حاصل ہی کر لی تو خود انگریزی حکومت نے ان پر سرکاری نوکریوں کا دروازہ بند کر کے ان کے حوصلوں کو ایک دم پست کر دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پورے دور میں برادرانِ وطن کی دو نسلیں جدید تعلیم سے آراستہ ہو کر حکومت کے کلیدی عہدوں پر قابض ہو چکی تھیں اور مسلمان قوم اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود ان سے بچھڑ کر رہ گئی۔

انگریزوں کی نگاہ میں ہندو طفلِ مکتب

بنگال سول سروس کے ایک افسر کی رپورٹ کے الفاظ ہیں، اس نے لکھا ہے کہ:

"عزمِ تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور نسبتاً ہندو ان کے سامنے طفلِ مکتب معلوم ہوتے ہیں علاوہ اس کے مسلمانوں میں انتظامی کاموں کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے"

امتیازی سلوک

انگریزی حکومت نے مسلمانوں کے ساتھ جو ناروا امتیازی سلوک روا رکھا اس کی ایک جھلک سر ولیم ہنٹر کے اس بیان سے ملتی ہے جو اس نے کلکتہ کے ایک فارسی اخبار مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۸۶۹ء کے حوالے سے لکھا ہے:

"اس خبر کی کوئی تردید نہیں کی گئی کہ سُندربن کے کمشنر نے گورنمنٹ گزٹ میں

اعلان کیا تھا کہ جو ملازمتیں خالی ہوئی ہیں ان پر سوائے ہندوؤں کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے مسلمان اب اس قدر گر گئے ہیں کہ اگر وہ سرکاری ملازمت پانے کی اہلیت بھی حاصل کر لیتے ہیں تب بھی انھیں سرکاری اعلانات کے ذریعہ خاص احتیاط کے ساتھ ممنوع کر دیا جاتا ہے۔ ان کی بیکسی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا اور اعلیٰ حکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا بھی اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں، حکام کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلکتہ میں مشکل سے کوئی دفتر ایسا ہوگا جس میں بجز چپراسی یا چٹھی رساں یا دفتری کے مسلمان کو کوئی نوکری مل سکے۔"

(مسلمانوں کے افلاس کا علاج، شائع کردہ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۳۴ء)

ظاہر ہے کہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود جس قوم نے اپنے مستقبل کو صرف اس لئے تباہ کیا کہ اسے ایک غیر قوم کی غلامی منظور نہ تھی تحریکِ آزادی کے سلسلہ میں ایک بہت بڑی قربانی ہے جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

ہم نے تنہا ہی سفر کیا

تاریخِ آزادی کی یہ بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ ۱۹۰۰ء تک جتنے مسلمان مجاہدینِ آزادی پھانسی پر لٹکائے گئے یا کالے پانی کی درد ناک زندگی گذاری یا عمر قید کی سزا بھگتی، یا صفوں میں کھڑا کر کے گولی ماردی گئی یا بغاوت کے جرم میں شوٹ کیا گیا ہے تحریکِ آزادی کے پورے دور میں دوسری قوم کی قربانیوں کی مجموعی تعداد بھی اس کے برابر نہیں ہوسکتی، بیسویں صدی کی ابتدا میں جب تقریر و تحریر کی وہ آزادی نہیں تھی جو بعد کے دور میں ہوئی، اس وقت سب سے پہلا احتجاجی جلسہ کلکتہ میں تقسیمِ بنگال کے خلاف ہوا اس کے سارے مسلمان مقررین میں شاید کوئی بچا ہو جسے پولیس کی سختیاں اور قید وبند کی صعوبتیں نہ جھیلنی پڑی ہوں۔

آزادی بذریعۂ طاقت

۱۹۱۵ء میں ریشمی رومال کی تحریک مسلمانوں کا ایک اور جرأتمندانہ اقدام تھا جو بغاوت کے فردِ جرم تک جاتا ہے مگر تحریک چلانے والے خوش قسمت تھے کہ کئی سو کی تعداد میں پولیس کی عبرتناک مظالم سہے اور رہنما، قید وبند کی اذیتناک زندگی گذار کر چار پانچ سال بعد زندہ ہندوستان

واپس آگئے۔

جلیانوالہ باغ میں ۱۹۱۹ء آزادی کی تاریخ میں یادگار بن گیا کیونکہ جلیانوالہ باغ امرتسر کا واقعہ اسی سال ہوا، عوامی بیداری کا اس سے صحیح احساس پیدا ہوتا ہے آپ جلیانوالہ باغ میں شہید ہونے والوں کی فہرست پر نظر ڈالیں گے تو مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لوگوں کو بڑی تعداد میں خونِ شہادت سے سرخرو پائیں گے۔

تحریک خلافت کا زمانہ پھر اس کے بعد تحریکِ خلافت میں ترکِ موالات اور عدمِ تعاون کا جوش وخروش ابھرا تو مسلمان ہی قیادت کے فرائض انجام دیتا رہا اور مسلسل قید وبند اور پولیس کی سختیاں برداشت کرتا رہا اس طرح ۱۹۲۵ء تک آزادی کے میدان میں وہ قائدانہ رول ادا کرتا رہا، پھر ۱۹۲۷ء میں ہندوستان نے برطانوی حکومت کا چیلنج منظور کر کے ایک متفقہ دستور پیش کرنے کا تہیہ کیا مگر افسوس کہ متفقہ دستور کی کوشش نے ہندو مسلم اتحاد کے شیرازہ کو منتشر کر دیا جبکہ تحریکِ خلافت نے مثالی کردار انجام دیا تھا، اگرچہ یہ بات تلخ ہے مگر صداقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اس سلسلہ میں جن لوگوں نے مرکزی کردار ادا کیا انھوں نے صاف دلی سے اس اتحاد کو باقی رکھنے کی کوشش نہیں کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہرو رپورٹ کو اگر مولانا شوکت علی مولانا محمد علی اور مسٹر جناح نے رد کیا تو خالص قوم پرور مسلمانوں کیلئے بھی یہ رپورٹ ناقابلِ قبول ہی رہی جب کہ وہ کانگریس کے ساتھ شانہ بشانہ مل کر کام کر رہے تھے اور بعد میں وہ پوری زندگی کانگریس کے محاذ سے برطانوی حکومت کے خلاف جہاد کرتے رہے اسلئے مسلمانوں پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے آزادی کی حقیقی لڑائی سے انحراف کیا۔

آخری منزل تک بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں کانگریس کی طرف سے ستیہ گرہ اور نان کوآپریشن کے پروگرام چلائے گئے اس سلسلہ میں بھی آپ دیکھیں گے کہ مسلمان قوم ان سارے پروگراموں میں برابر کے ساتھی کی طرح سرگرمِ کار رہی اور بہت سے پرجوش مسلمانوں نے گاندھی جی کی گرفتاری پر احتجاج کرتے ہوئے بغاوت تک کر دی اور پھانسی کے تختے پر چڑھا دیئے گئے، ۱۹۳۷ء میں کانگرسی وزارت

کے موقعہ پر ہندو مسلم خلیج اور بڑھ گئی لیکن اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک جو ایک طوفانی تحریک تھی جس میں لاتعداد ہندوستانی گرفتار ہوئے اور پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے اس موقعہ پر بھی آپ دیکھیں گے کہ مسلمان نے قید و بند کی مصیبتیں ہی نہیں جھیلیں بلکہ شمعِ آزادی پر پروانہ وار نثار ہوگئے اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنی، ۱۹۴۲ء کے بعد پانچ سال کا دور ایسا ہے جس نے ہندو مسلم خلیج کو ناقابل عبور حد تک وسیع کر کے مسلمانوں کی بے مثال قربانیوں کی قدر و قیمت کو کم کر دیا اور اس کی سیکڑوں سال کی انتھک جدوجہد اور ایثار و قربانی بے وزن مانی جانے لگی مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ اس نے جنگِ آزادی میں آگے بڑھا ہوا قدم پیچھے ہٹایا ہو۔

دوسری جنگِ عظیم کا سلسلہ جاری ہی نہیں تھا بلکہ لڑائی کی آگ اور تیزی سے بھڑک اٹھی تھی اور اس کی آنچ ہندوستان میں بھی محسوس کی جانے لگی تھی جاپانی قوم ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہی تھی اس وقت سوبھاش چندر بوس کی قیادت میں مسلمانوں کے ان گنت سپاہی اور فوجی افسران برطانوی حکومت کے خلاف نبرد آزمائی میں دوسرے برادرانِ وطن سے آگے تھے اور ۱۹۴۶ء میں آزاد ہند فوج کے گرفتار شدگان میں مسلمانوں ہی کی تعداد زیادہ تھی اگر حالات سازگار ہوتے تو انگریز انھیں پھانسی سے کم سزا نہیں دیتے اس کے علاوہ آزاد ہند فوج کے مورچہ سے برطانوی فوج کے خلاف لڑتے ہوئے مسلمان فوجیوں نے جامِ شہادت نوش کیا اسی ۱۹۴۶ء میں ممبئی اور کراچی کے بحری بیڑوں نے بغاوت کا بگل بجا دیا اس بغاوت میں مسلمان فوجیوں نے مثالی کارنامہ انجام دیا اور اس بغاوت کی حمایت میں شہریوں نے جو طوفان خیز مظاہرہ کیا اس میں بھی مسلمان شہیدوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ اس طرح ۱۸۵۸ء سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں نے تسلسل کے ساتھ اتنی قربانیاں دی ہیں کہ ان پر ہزاروں صفحات کی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، اور جب بھی کوئی مؤرخ دیانتداری کیساتھ ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ مرتب کریگا تو اس کیلئے ممکن نہیں ہے کہ مسلمانوں کی بے مثال قربانیوں کو نظر انداز کر سکے ——— ہم اگلے صفحات میں مسلمانوں کی تحریکِ آزادی میں عظیم الشان قربانیوں کی ایک اجمالی تاریخ آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں ''

باب (۱)

جب لال قلعہ پر یونین جیک لہرایا

برسات کی اندھیری رات ہے آسمان پر تا حدِ نگاہ کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آتا، ہر چار طرف سیاہ چادروں میں لپٹا ہو مہیب سناٹا چھایا ہوا ہے، فضا سائیں سائیں کر رہی ہے۔ انھیں حالات میں ایک قافلہ لق و دق صحرا میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راستے کے نشانات ڈھونڈھنے کی کوشش کر رہا ہے مگر اُسے ہر طرف تاریکی کی سیاہ تنی ہوئی چادروں کے سوا اور کچھ نظر نہ آرہا ہو، اسی درمیان آسمان سے بڑے بڑے اُولوں کی دھواں دھار بارش شروع ہوجائے کہ قافلہ "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" کی حالت میں دم بخود کھڑا رہ جائے، کچھ ایسا ہی حال غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کا ہوگیا تھا، آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو مجاہدینِ آزادی کی سربراہی کے جرم میں پابجولاں رنگون کے قیدخانہ میں بھیجا جا چکا تھا، لال قلعہ سے مسلمانوں کے اقتدار کا پرچم اتار کر برطانوی استعمار کا یونین جیک لہرایا جا چکا تھا اور اب انگریزوں کی فوج ان مسلمانوں کو گرفتار کرنے میں مسلسل مصروف تھی جن کے خون کی برطانوی اقتدار کی بنیاد کو ضرورت تھی کیونکہ اُسکے بغیر استحکام ممکن نہیں تھا۔

انگریزوں نے حکومت و اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھینا تھا اسلئے قدرتی طور پر مسلمان ہی زیادہ مشتعل تھے، اسے خوبی کہیئے یا اس قوم کا عیب، کہ جب یہ قوم مشتعل ہوجاتی ہے، اس کی غیرت وحمیت کو للکارا جاتا ہے یا اس کی خودداری کو ٹھیس لگتی ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتی کہ فریقِ مخالف کی طاقت کیا ہے؟ وہ نتائج سے بے پرواہ ہوکر اس سے ٹکرا جاتی ہے، سنہ ۱۸۵۸ء میں ہندوستان میں انگریزی تسلط و اقتدار مکمل ہوچکا تھا حکومت

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر براہِ راست ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھوں میں جا چکی تھی، لال قلعہ پر یونین جیک لہرانے لگا تھا، یہ جھنڈا اس بات کا اعلان تھا کہ اب اقتدار ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے نکل کر غیر معین مدت تک کیلئے دوسروں کے فولادی ہاتھوں میں جا چکا ہے اور اب ہندوستانِ جنت نشان کی بہاروں پر ایک سفید فام قوم کی اجارہ داری قائم ہو چکی ہے یہی وہ دن ہے جب مسلمانوں نے ہندوستان میں جنگِ آزادی کا آغاز کیا، ۱۸۵۸ء کے بعد جب سارے برادرانِ وطن ایک سطح پر آ گئے اور انگریز ہندوستان پر مسلط ہو چکا تو اب ان لڑائیوں کی حیثیت عوامی ہو گئی، اس لئے اس کے بعد ہونے والی جدوجہد ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ کا پہلا باب ہے، جب یہ جدوجہد شروع کی گئی اس وقت کیا ماحول تھا؟ اُسے جانے بغیر مجاہدینِ آزادی کی خدمات اور قربانیوں کی اہمیت اور قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا، اس لئے تھوڑی دیر کے لئے ہم آپ کو اسی فضا اور ماحول میں لے چلتے ہیں۔

جب ہم خون کے دریا میں ڈوب گئے

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء درحقیقت نقطۂ آغاز ہے جنگِ آزادی کا۔ جب انگریزی فوج کے سپاہیوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی اور اپنے انگریز افسروں کو گولی مار کر دہلی پر قبضہ کرنے کیلئے چلے، لیکن یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی تحریک کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے انتقامی کارروائیوں کا آغاز کیا اور اس کے نتیجہ میں مسلمان خصوصیت کے ساتھ انتہائی طور پر کچل دیا گیا، دہلی کا چاندنی چوک ہی نہیں بلکہ شہر کے ہر چوراہے پر سولیاں نصب کر دی گئیں، دہلی اور دہلی کے باہر درختوں کی شاخوں سے پھانسی کے پھندے لٹک رہے تھے، جو بھی معزز مسلمان انگریزوں کے ہاتھ چڑھ گیا، اسے ہاتھی پر بٹھایا، درخت کے نیچے لے گئے، پھندا اس کی گردن میں ڈال کر ہاتھی کو آگے بڑھا دیا، لاش پھندے میں جھول گئی، آنکھیں اُبل پڑیں، زبان منہ سے باہر نکل آئی، ذبح کئے ہوئے مرغ کی طرح جانکنی کا وہ ہیبتناک منظر کہ الاماں والحفیظ، ایک انگریز عورت نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ بسا اوقات ان پھانسیوں پر لٹکائے جانے والوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر انگریزی ہندسے کا 8 بن جاتی تھیں۔

مسلمانوں میں خوف وہراس اور دہشت پھیلانے کیلئے وہ سزا کے نت نئے

طریقے ایجاد کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کسی سر برآوردہ مسلمان کو پکڑ کر توپ کے دہانے پر رسیوں سے جکڑ کر باندھ دیا اور توپ داغ دی، پھر کیا ہوتا تھا؟ قلم کانپ رہا ہے، دل تھرتھرا رہا ہے اور اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے زبان لرز رہی ہے اور اس کربناک صورتِ حال کے اظہار سے قاصر ہے، پورے جسم کا گوشت بوٹی بوٹی ہو کر فضا میں اُڑ جاتا تھا، جس طرح تیز ہوا میں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، دور تک خون کے چھینٹے اس طرح پڑتے تھے جیسے فضا سے زمین پر کسی نے خون کا چھڑکاؤ کیا ہے۔ لاش کا سر فضا میں میلوں بلندی پر جا کر جب زمین پر گرتا تھا تو بسا اوقات کسی راہ گیر یا جانور کی جان چلی جاتی تھی۔

یہ تمام تفصیلات اور اس طرح کے درجنوں واقعات ایک مشہور انگریز مصنف سر ایڈورڈ طامسن نے اپنی مشہور عالم کتاب "دی آدر سائڈ آف دی ماڈل" (غدر ۱۸۵۷ء تصویر کا دوسرا رخ) میں لکھا ہے۔ جس کا اُردو ترجمہ آزادی سے قبل شیخ حسام الدین نے شائع کر دیا تھا۔ یہ ایک دو نہیں سیکڑوں واقعات ہیں، یہ قیامت مسلمانوں پر ایک دو دن نہیں ٹوٹی بلکہ اس کا سلسلہ مہینوں سے گذر کر ایک سال تک چلتا رہا، ان ہولناک مناظر کو دیکھ کر پورا ہندوستان تھرا اُٹھا۔ انگریز کا نام سنتے ہی ایک خونخوار بھیڑیئے کا تصور آجاتا تھا اور خوف و دہشت سے لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ خونی ڈرامہ منظر عام پر اور ہزاروں تماشائیوں کی موجودگی میں کھیلا جاتا تھا، عام ہندوستانیوں پر اسکے کیا اثرات مرتب ہوتے رہے ہونگے؟ ظاہر ہے۔

کارواں چل پڑا

یہ تھا وہ روح فرسا اور دل دہلا دینے والا ماحول جب ہندوستان میں جنگ آزادی کے مسلمان مجاہدین نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ تاریخ کی شہادت ہے کہ یہ سفر مسلمانوں نے تنہا شروع کیا، اس کانٹوں بھری وادی میں صرف انھیں کے تلوے لہو لہان ہوتے رہے، لیکن ان کے پائے استقامت میں نہ جنبش ہوئی اور نہ لغزش پیدا ہوئی، اور نہ آگے بڑھا ہوا قدم ایک انچ پیچھے ہٹا، ہر طرف دار و گیر کا حشر برپا تھا۔ علی الاعلان مسلمان پھانسیوں پر چڑھائے جا رہے تھے، گرفتاریوں کا سلسلہ جاری تھا انگریز اب عدالت کی کرسی پر بیٹھ چکا تھا مگر یہ کرسی عدل و انصاف کے لئے نہیں تھی بلکہ وہ

اپنے واحد دشمن مسلمانوں کے دماغ سے حکومت و اقتدار کی بو باس کو ختم کرنے کیلئے اس کو استعمال کرتا تھا اور عدل و انصاف کا ڈرامہ کیا جاتا تھا، مقدمات چلائے جاتے تھے فرضی گواہ اور شہادتیں پیش کی جاتی تھیں اور فیصلہ سنا دیا جاتا تھا کہ اس کو تختۂ دار پر چڑھا دیا ان کی نگاہ میں اس مسلمان کا جرم اور بڑھا ہوا ہے تو اس کو کالے پانی کی سزا دی جاتی تھی، کیونکہ حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور کی سزا پھانسی کی سزا سے کہیں زیادہ اذیت رساں تھی، انگریز مخصوص مسلمانوں کو یہ سزا دینے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔

کالے پانی بھیجنے کا مطلب یہ تھا کہ مجرم اپنے وطن اپنے گھر اپنے دوست احباب، عزیز و اقارب اپنے خاندان اور اپنے بیوی بچوں کیلئے زندہ رہتے ہوئے بھی مرجاتا تھا اور ایسی گھٹ گھٹ کر زندگی گذارنے پر مجبور ہوتا تھا کہ موت کو اس زندگی پر ترجیح دینے لگتا تھا ہندوستان کے مشاہیر علماء و مشائخ، رؤسا و اُمراء جن کی راہوں میں عوام آنکھیں بچھاتے تھے، جنکے اعزاز و احترام کا عالم یہ تھا کہ مسلمانوں میں انکو سر اور آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا، خوشحال گھرانوں کے افراد جن کی خدمت کیلئے ہمیشہ نوکروں کی پلٹنیں رہتی تھیں ایسے معزز رؤسا، علماء و مشائخ کو جزیرۂ انڈمان، کالے پانی کی مسموم فضا میں بھیجا جاتا تھا جہاں ان سے ذلیل سے ذلیل کام لیا جاتا تھا یہ جزائر درحقیقت بڑے بڑے قید خانے تھے جس میں چہار دیواریاں اور فصیلیں تو نہیں تھیں لیکن چاروں طرف حدِ نگاہ تک سمندر لہریں مارتا رہتا تھا، ان جزیروں میں ان معزز و محترم شخصیتوں سے لکڑیاں کٹوائی جاتی تھیں، سڑکیں بنوائی جاتی تھیں نالیاں اور گندگیاں صاف کرائی جاتی تھیں کوڑے کرکٹ کی ٹوکریاں ان کے سروں پر لاد کر پھنکوائی جاتی تھیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی جو علمی دنیا میں بے تاج کے بادشاہ تسلیم کئے جاتے تھے لیکن جب ایک شخص جزیرہ انڈمان میں ان کی ملاقات کیلئے پہونچا تو دیکھا کہ علامہ غلاظت کی ٹوکری اٹھائے ہوئے پھینکنے کیلئے جا رہے ہیں، جزیرے انڈمان میں تمام مسلمان قیدیوں سے اسی طرح کے جبری کام لئے جاتے تھے، انگریزوں نے کتنے مسلمان مجاہدینِ آزادی کو جزیرۂ انڈمان بھیجا اور کالے پانی کی سزا دی! ان کی فہرست بتانی مشکل ہے، مگر تاریخ کے جستہ جستہ واقعات کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی تعداد چار ہزار سے

کسی طرح کم نہیں تھی، کیونکہ مولانا جعفر احمد تھانیسری اپنی خود نوشت ڈائری میں بتاتے ہیں کہ جب مولانا یحییٰ علی صادقپوری کی جزیرے میں وفات ہوئی ہے تو ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت کی افسران نے اجازتِ عام دے دی تھی، ان کی نمازِ جنازہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد چار اور پانچ ہزار کے درمیان تھی اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انگریزوں نے ملک بھر سے چار پانچ ہزار مسلمان مجاہدینِ آزادی کو گرفتار کرکے کالے پانی بھیجا تھا۔

آزادی بذریعۂ طاقت

انیسویں صدی کے آخر تک بلکہ بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں تک آزادی حاصل کرنے کا صرف ایک طریقہ تھا کہ مجاہدینِ آزادی تلواریں ہاتھ میں اٹھالیں اور طاقت کے ذریعہ برسرِ اقتدار طاقت کو بے دخل کر دیں، عدمِ تشدد کا اصول تو بہت بعد میں دریافت ہوا جس پر بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے عمل شروع ہوا، پھر بھی عدمِ تشدد کو بطورِ عقیدہ مسلمانوں نے کبھی بھی تسلیم نہیں کیا، ایک طریقۂ کار کے طور پر تو اس کو ضرور مانا گیا اور اس پر مسلمانوں نے عمل بھی کیا مگر عدمِ تشدد کو عقیدہ کی حیثیت کبھی نہیں دی گئی، جیساکہ ۱۹۲۲ء میں چوری چورا کے واقعہ پر جب کچھ پرجوش مسلمان مجاہدینِ آزادی نے تھانے میں آگ لگاکر داروغہ اور سپاہیوں کو بھون ڈالا تو گاندھی جی نے اپنی تحریک نان کوآپریشن واپس لے لی تھی لیکن تحریک واپس لینے اور تشدد کے استعمال پر اظہارِ ناراضگی کرنے کی وجہ سے ملک میں گاندھی سے مجاہدینِ آزادی کا اعتماد اٹھ گیا تھا جو بہت بعد میں بحال ہوا۔

اسی طرح ۱۹۴۲ء کی تحریک "کوئٹ انڈیا" کے موقعہ پر عدمِ تشدد کے اصول کو بالائے طاق رکھدیا گیا تھا اور عوام نے تشدد کی راہ اختیار کی اور ہتھیاروں سے لیس ہوکر انگریزی اقتدار پر حملہ کردیا تھا، اسی طرح ۱۹۴۴ء میں سوبھاش چندر بوس نے جاپان کی فوجی مدد سے آزاد ہند فوج بنائی اور انگریزی فوجوں سے ٹکر لی، انڈین نیشنل آرمی کے فوجی افسران کی بہت بڑی تعداد مسلمانوں پر مشتمل تھی، ان تاریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ عدمِ تشدد کی افادیت ایک محدود دائرے تک ہمیشہ رہی اور جراُتمندانہ اقدام کا موقعہ آیا تو صرف تلواریں کام آئیں مسلمانوں نے اس راہ میں اپنی قوتِ بازو پر ہمیشہ بھروسہ رکھا جب تک انکے بازوؤں میں

طاقت تھی اور انگریزوں کے خلاف کبھی بھی اپنی تلوار میان میں نہیں رکھی، ۱۸۵۸ء سے لیکر ۱۹۰۰ء تک اس ۴۲ سالہ تحریکِ آزادی میں آگ اور خون سے کھیلتے رہے۔

ایک طرف انگریز ۱۸۵۷ء کی تحریک سے آتشِ زیرپا تھا اور دہشتناک انتقامی کارروائیوں میں مصروف تھا دوسری طرف مجاہدینِ آزادی نئی جد وجہد کے لئے پر تول رہے تھے، جن لوگوں کے سینوں میں آزادی کا جذبہ موج زن تھا ان پر خوف دہراس طاری کرنے میں انگریزوں کی فوجی طاقت بھی ناکام ہو چکی تھی وہ بدستور جنگِ آزادی کے میدان میں شمشیر بکف تیار کھڑے تھے۔

جنگِ آزادی کا پہلا محاذ

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کئی برسوں تک اندرونِ ملک سیاسی جد وجہد کے میدانوں میں ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا، عوام نئے حالات سے سمجھوتہ کرنے لگے تھے تاریک مستقبل کے تصور اور برطانوی استبداد نے ہاتھ پاؤں کی طاقت سلب کرلی تھی برادرانِ وطن انگریزی اسکولوں میں داخل ہوکر اپنے اور اپنے خاندان کے مستقبل کو سنوارنے میں لگ چکے تھے، کیونکہ انگریزی حکومت کی عنایتوں اور کرم فرمائیوں کا دروازہ مسلمانوں کے علاوہ سب کے لئے کھلا ہوا تھا، اسکولوں اور کالجوں سے نکلتے ہی انکو سرکاری دفتروں میں ملازمت مل جایا کرتی تھی، اس کے برخلاف مسلمانوں کو انگریزی اقتدار سے اتنی نفرت تھی کہ انھوں نے ان کے قائم کردہ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کو بھی اپنی خودداری اور جذبۂ آزادی کے خلاف تصور کیا؛ اس لئے بہت دنوں تک انھوں نے انگریزی تعلیم کی طرف نگاہِ غلط انداز بھی نہیں ڈالی لیکن کچھ عرصہ بعد جب مسلمانوں کی ایک نسل انگریزی تعلیم حاصل کرکے نکلی تو اس پر بذریعہ حکم ملازمتوں کا دروازہ ہی بند کردیا گیا تھا، اگر بڑی عنایت ہوئی تو کسی دفتر میں چٹھی رساں اور چپراسی بنا دیا گیا۔

ناامیدی اور مایوسی کے اسی مہیب سناٹے میں ہندوستان کے سرحدی علاقوں کی طرف سے مجاہدینِ آزادی کی تلواروں کی جھنکار رہ رہ کر سنائی دیتی تھی، یہ وہ لوگ تھے جو غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے سے ایک جابر حکومت کے خلاف نبرد آزما تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد ان کا رُخ اس سفید فام قوم کی طرف مُڑ گیا جو ابھی ابھی اقتدار پر قابض ہوکر

ہندوستان پر بے پناہ مظالم توڑنے لگی تھی۔

ان مجاہدینِ آزادی کی سرگرمیوں کا آغاز سید احمد رائے بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید کی قیادت میں ہوا تھا، لیکن ان حضرات کی شہادت کے بعد یہ طاقت بکھر نہیں گئی بلکہ اس کا نظام اور مستحکم ہوا اور وسیع بھی، اس کے خفیہ کارکن بنگال سے لے کر سرحد تک مسلسل رواں دواں رہتے تھے، ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی کئی بار برطانوی فوجوں سے ان کی ٹکر ہو چکی تھی لیکن اس تاریخ کے بعد تو صرف انگریزی حکومت ہی ان کے بالمقابل تھی، ان مجاہدینِ آزادی کی انگریزوں سے آخری جنگ امبیلہ میں ہوئی، اب مجاہدینِ آزادی کے اعلانات میں صاف طور پر انگریزی حکومت کا نام لیا جانے لگا تھا اور مسلمانوں کو ان کے خلاف جوش وجذبہ دلایا جاتا تھا مگر یہ جنگ ایسے علاقے میں لڑی جاتی تھی کہ اندرونِ ملک اس کی اہمیت ونزاکت کا صحیح احساس نہیں ہوتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طرح کی جنگ کے لئے اندرونِ ملک کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کیونکہ انگریزوں کا پنجۂ استبداد پورے نظام پر اتنا مضبوط پیوست ہو چکا تھا کہ مجاہدینِ آزادی کی کہیں بھی مورچہ بندی ناممکن ہو چکی تھی، اسی لئے مجاہدینِ آزادی نے محاذِ جنگ کیلئے اس مقام کو منتخب کیا جو ہمیشہ سے فاتحین کی گذرگاہ تھی، مسلمانوں کے لئے طاقت کا سرچشمہ بھی وہی تھا، آرین قوم نے اسی درۂ خیبر کی راہ سے آکر ہندوستان پر قبضہ کیا تھا اور یہاں کے اصلی باشندوں کو اطرافِ ملک کے جنگلوں اور میدانوں میں پناہ لینے پر مجبور کیا تھا، محمود غزنوی کی فوج کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ بھی انھیں راستوں میں گونجی تھی، بابر کی تلواروں کی جھنکار بھی اسی شاہراہ پر سنائی دی تھی۔ اس لئے یہ تسلیم کیا جا چکا تھا کہ ہندوستان کی حکمراں طاقت پر اگر حملہ کیلئے یہی راہ اختیار کی گئی تو کامیابی کے زیادہ امکانات ہیں، اسلئے مجاہدینِ آزادی نے ہندوستان کے سرحدی صوبے اور آزاد قبائل کو اپنی کمینگاہ بنایا اور اپنی فوجی چھاؤنیاں انھیں علاقوں میں قائم کیں اور وہیں سے انھوں نے انگریزی فوجوں کو کئی بار زبردست شکستیں دیں اور کبھی کبھی مجاہدینِ آزادی کے حملوں کا دباؤ اتنا بڑھ جاتا تھا کہ بڑی سے بڑی فوجیں اس کے دفاع میں لگانی پڑتی تھیں۔

مجاہدینِ آزادی کی سرحدی علاقوں میں سرگرمیاں

سید صاحب کی شہادت کے بعد جماعت میں اضمحلال پیدا ہوا مگر سید صاحب کے جانشین نے بہت جلد جماعت کے نظام کو سنبھال لیا۔ اس کو استحکام بخشا اور اس کے دائرے کو وسیع کیا اور جماعت کا صحیح رُخ بھی متعین ہوا، ابتک ان لوگوں سے جنگ تھی جن کا انگریزی حکومت سے براہ راست تعلق نہیں تھا، لیکن جب برطانوی حکومت کا اس ریاست سے براہ راست تعلق ہوا تو قدرتی طور پر انگریزی حکومت از خود نشانے پر آگئی اور جنگ شروع ہوگئی۔

اب مجاہدین کے امیر مولانا ولایت علی صاحب تھے، ہزارہ میں ایک آزاد حکومت کی بنیاد ڈالی جا چکی تھی، اسی زمانے میں انگریزوں نے سکھوں سے دوآبہ بست جالندھر لے لیا تھا اور سکھ حکومت پر ڈیڑھ کروڑ تاوان بھی عائد کیا تھا چونکہ لاہور کے خزانے میں روپیہ نہیں تھا اسلئے سوداگروں کی اس قوم نے سکھوں سے سودا کیا کہ روپے کے عوض دریائے بیاس اور دریائے سندھ کے درمیان تمام کوہستانی علاقے بہ شمول کشمیر و بالائی ہزارہ ایک کروڑ روپے کے معاوضے میں انگریزوں کے حوالے کر دیئے جائیں، باقی پچاس لاکھ روپے عہدنامہ کی توثیق سے پہلے یا بعد میں فوراً نقد ادا کئے جائیں۔

اب ان علاقوں میں آزادی کی تحریک جاری تھی، زیریں ہزارہ میں سید اکبر شاہ ستھانوی کو تختِ حکومت پر بٹھایا گیا تھا اور بالائی ہزارہ میں مولانا عنایت علی کو امیر بنا دیا گیا تھا، سکھوں سے صلح کے بعد انگریزوں نے مسٹر ایبٹ کو ہزارہ بھیجا دوسری طرف ہنری لارنس جو دربارِ لاہور میں رزیڈنٹ تھا اس کو فوج دیکر جموں بھیجا گیا۔ یہ ۱۸۴۷ء کا زمانہ تھا، درۂ آب جو ایک مرکزی مقام تھا جس پر مجاہدین کا قبضہ تھا انگریزی فوج نے سکھوں کو ساتھ لے کر اس پر حملہ کر دیا، سکھوں کی فوج مجاہدین کی یلغار سے تباہ ہوگئی تھی، پھر انگریزوں کے تعاون سے جو سکھ طاقت اُبھری اس نے مجاہدین کیلئے زیادہ پریشانیاں پیدا کیں اور درۂ آب پر قبضہ رکھنا دشوار ہوگیا اور یہاں مجاہدین کو بعد میں شکست ہوگئی، کچھ نے ہتھیار ڈال دیئے اور تھوڑا سا حصہ اپنے مقام

استھانہ چلاگیا، مولانا عنایت علی اور مولانا ولایت علی گرفتار کرلئے گئے اور اپنے وطن عظیم آباد بھیجدیئے گئے اور وہاں ان سے دس دس ہزار کا مچلکہ لیاگیا اور حکم دیاگیا کہ چار سال تک شہر سے باہر نہ جائیں۔ یہ مسٹر اوکنلے کا بیان ہے، ڈاکٹر بیلیو کا بھی بیان کچھ اسی سے ملتا جلتا ہے یہی وہ زمانہ ہے جب بہت سے انگریز افسران ان علاقوں میں پہونچ گئے۔

مولانا عنایت علی پھر خفیہ طور پر سرحد پہونچ گئے اور انھوں نے انگریزوں سے باقاعدہ جنگ چھیڑ دی، انگریزوں سے انکی پہلی جنگ امب میں ہوئی کرنل میکیلین کمشنر پشاور اس مہم کا سپہ سالار بنایاگیا مجاہدین نے بہت سے مقامات پر قبضہ کرلیا امب کا حاکم بھی مجاہدین کے ماتحت ہوگیا مسٹر اوکنلے مولانا عنایت کے بارے میں لکھتا ہے:

> " اپنے ہمراہیوں کے دلوں میں انگریز کافروں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، مجاہدین روزانہ قواعد کرتے بلکہ بعض اوقات دن میں دو دو مرتبہ، قواعد میں فضائلِ جہاد بیان کئے جاتے اور نظمیں پڑھی جاتیں اور انھیں تلقین کی جاتی کہ صبر و استقامت سے اس وقت کا انتظار کرو جب برطانوی حکومت کی تسخیر کا مقررہ وقت آپہونچے "

مولانا عنایت علی نے انگریزی مورچوں میں بھی دعوتِ جہاد کا انتظام کیا تھا، سرکاری رپورٹوں میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے، ریون شا کی رپورٹ میں ہے کہ دیسی پیادہ فوج کی چوتھی رجمنٹ مقیم راولپنڈی کو راہِ وفا سے منحرف کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تحقیقات سے پتہ چلا کہ تحریکِ بغاوت کا مرکز عظیم آباد کا محلہ صادق پور ہے جو مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کا وطن ہے۔ لارڈ ڈلہوزی نے یہ رپورٹ دیکھ کر تاکید کی کہ اہلِ صادقپور کی سرگرمیوں پر بطورِ خاص نظر رکھی جائے، کچھ مدت کے بعد مذکورہ بالا رجمنٹ کے منشی محمد ولی پر بغاوت کا مقدمہ چلا ۱۲ مئی ۱۸۵۳ء کو جرم ثابت ہوگیا اور پھانسی دی گئی یہی حالات سرحد میں تھے چھوٹی بڑی لڑائیاں مجاہدین کی انگریزی فوجوں سے

ہوتی رہیں کہ پورے ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوگیا۔

اس ہنگامہ کو فرو کرنے کے بعد انگریزوں نے سرحدی علاقوں کی طرف پوری توجہ کی اور اس تحریک کو ختم کرنے کیلئے پوری طاقت لگادی کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ لڑائی تو سرحد میں لڑی جارہی ہے لیکن اس کے اثرات سے پورا ملک جوالا مکھی بنا ہوا ہے بنگال کے کمشنر پولیس کی رپورٹ ہے کہ:

"اس جماعت کے ایک ایک مبلغ کے پیرو اسّی اسّی ہزار ہیں، جن میں مکمل مساوات ہے، مشرقی بنگال کا ہر ضلع بغاوت کے رنگ میں رنگا ہوا ہے اور پٹنہ سے سمندر تک گنگا کے تمام راستہ میں مسلمان کسان باغیوں کے مرکز کیلئے ہفتہ وار امداد دیتے ہیں"

مسٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

"یوپی کے ایک انگریز نیل کے کارخانہ دار نے بتایا کہ اس کے ملازمین اپنی مزدوری اور تنخواہ کا ایک جز استھانہ کیمپ کیلئے علیحدہ کرکے رکھ لیتے تھے، جو لوگ زیادہ جری تھے وہ تھوڑے دنوں کے لئے استھانہ جاکر جہاد میں حصہ لیتے تھے، اس کے مسلمان ملازمین یہ کہکر رخصت لیتے تھے کہ انھیں فریضۂ جہاد ادا کرنے کیلئے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونا ہے"

اسی ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں ایک موقعہ پر لکھا ہے:

"پنجاب کے الحاق کے بعد مجاہدین کا جو غصہ سکھوں پر اترتا تھا اب انکے جانشین انگریزون پر اترنے لگا، اس جماعت کے مبلغین اور پٹنہ کے مسلمان پیشوا حکومتِ ہند کے خلاف بغاوت کی علانیہ تبلیغ کرتے تھے"

کیپٹن کنگھم نے بات صاف صاف لکھ دی ہے وہ کہتا ہے کہ:

وہ انگریزوں پر حملہ کرنے میں ضرور محتاط تھے مگر ایک وسیع اور

آبا دملک پر ایک دور دراز کی قوم کا اقتدار ان کی مخالفت کے لئے کافی سبب تھا،،

مسٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے اپنی مذکورہ کتاب میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ :

"اب ہمیں اس مجموعۂ قوانین کا حال مختصراً بیان کر دینا ہے جو انکے جانشینوں نے بعد میں انکی تعلیم سے اخذ کیا ہے اور جس کی مدد سے انھوں نے ہندوستان میں ایک ایسا انقلاب برپا کر دیا جسکی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، یہی وہ انقلاب ہے جس نے پچاس سال سے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی روح کو دبنے نہیں دیا،،

مجاہدین نے سب سے پہلے لفٹنٹ ہاون کے کیمپ پر شبخون مار کر اپنی جنگ کا آغاز کیا، اس کے بعد جہاں بھی انگریز فوجوں کا وجود تھا اس پر انھوں نے حملہ کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا اور نہ تاخیر کی اور یہ سلسلہ برابر پانچ سال تک جاری رہا، مجاہدین کی یہ تحریکِ آزادی انگریزی حکومت کیلئے دردِ سر بن گئی، اسلئے حکومت نے اسے شکست دینے کیلئے اپنی بہت بڑی طاقت داؤ پر لگادی، انگریز مصنفین، شاہدین اور تحقیقاتی رپورٹ مرتب کرنے والوں کے قول کے مطابق مجاہدین کی طاقت کو توڑنے کیلئے سولہ مہمیں بھیجنی پڑیں، جن میں ۲۳ ہزار باقاعدہ سپاہی تھے، یہ وہ تعداد ہے جو ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک سرحدی علاقوں میں بھیجی گئی جو مجاہدینِ آزادی کا محاذِ جنگ تھا۔ ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۳ء تک علیحدہ علیحدہ مہموں کی تعداد بیس تک پہونچ گئی، جن میں بے قاعدہ مددگاروں اور پولیس کے علاوہ ساٹھ ہزار باقاعدہ سپاہی تھے۔ آخر آخر میں ۱۸۶۳ء میں ۲۸ر اکتوبر کو ایک برطانوی فوج مجاہدین کی طاقت کو توڑنے کیلئے بھیجی گئی، انگریزی فوج کو علاقے میں پہونچ کر معلوم ہوا کہ قبائل، مجاہدین کے ساتھ مل گئے ہیں اور حکومتِ پنجاب کے نام تار پر تار آرہے ہیں کہ امداد اور مزید امداد فوراً بھیجی جائے، فیروز پور سیالکوٹ اور لاہور کے دستے فوراً روانہ کر دیئے گئے۔

دو ہفتے کے اندر پنجاب کی چھاونیاں خالی ہوگئیں، ۱۱ر نومبر ۱۸۶۳ء کو مجاہدین نے حملہ کر دیا اور انگریزی فوج کو پسپا ہونا پڑا، چمبرلین خطرناک حد تک زخمی ہوا

اور ۱۸۴۷ انگریزی سپاہی مارے گئے، سرحدی علاقوں میں مجاہدینِ آزادی کی انگریزوں سے یہ جنگ مسلسل جاری رہی، انگریزی رپورٹوں کے مطابق ایک ایک مقابلہ میں کئی کئی سو مجاہدین شہید ہوتے رہے لیکن ان کے پائے استقامت میں کبھی جنبش نہیں ہوئی اور وہ ہمیشہ آگے بڑھتے رہے، آزادی کی یہ تحریک یا بغاوت کا جذبہ بنگال سے پشاور تک یکساں تھا، ۱۸۰۰ء سے ۱۸۷۰ء تک تنہا مسلمان مجاہدینِ آزادی نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی لڑائی کو جاری رکھا اور انقلاب کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتے رہے، اس زمانے میں دوسرے برادرانِ وطن انگریز دوستی کو حاصلِ زندگی سمجھتے رہے اور انگریزی تعلیم حاصل کر کے حکومت کی نوکری کو سرمایہ حیات تصور کرتے رہے، انھیں انقلاب یا آزادی کا ہلکا سا تصور بھی نہیں تھا بلکہ اسکے برعکس ان کا اعلیٰ اور متوسط طبقہ جس میں کلکتہ بار کونسل کے ارکان، اخبار نویس اور دوسرے پیشوں کے لوگ تھے۔ نہ یہ کہ مسلمانوں کی اس انقلابی تحریک سے اپنے کو علیحدہ رکھا بلکہ آزادی کے دیوانے مسلمانوں پر انگریزی مظالم کی تائید کرتے رہے اور انگریزوں کی حمایت میں رزولیشن پاس کرتے رہے اور اخباروں میں اداریے لکھتے رہے۔

بغاوت کا جذبہ عام تھا

مجاہدینِ آزادی نے مسلمانوں کے ہر طبقے میں انقلاب و بغاوت کی روح پھونک دی تھی کسانوں، فنکاروں، خانقاہوں کے پیروں، مدارس میں کام کرنے والے اساتذہ، تاجر اور نوکریاں کرنے والے کندھے سے کندھا ملاکر آزادی کی لڑائی لڑتے رہے، ۱۸۵۷ء کی تحریک کی ناکامی کے بعد انگریزوں کی انتہائی وحشیانہ انتقامی کارروائیوں کے باوجود مسلمان انقلابیوں نے بغاوت و انقلاب کا جھنڈا بلند رکھا، اور ہندوستانی غیرت کو ہمیشہ للکارتے رہے، مگر جب انگریزوں نے یکسو ہو کر بڑے پیمانے پر فوجی پیشقدمی کی تو مجاہدین کے پاس ان کے مقابلے کی طاقت نہیں رہی، کیونکہ سامانِ رسد کی کمی اور اسلحہ کا فقدان اور قبائل کا بہتر تعاون نہ ملنے کی وجہ سے حکومت مجاہدین پر فتح پاتی چلی گئی ۱۸۶۵ء کے بعد حکومت کی ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ:

"پنجاب گورنمنٹ کو افسوس ہے کہ یہ مہم ختم ہوگئی اور ہندوستان کے مذہبی مجنون نہ نکالے جا سکے، اور نہ ہم انھیں مطیع کر سکے اور نہ انکے گھروں کو واپس کر سکے۔"

۶ر فروری ۱۸۷۷ء کو سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر نے ایک موقعہ پر کہا:

"لوگوں کی عادت ہے کہ وہ مسلمانوں کو بے جان اور ضعیف بیان کرتے ہیں شاید ایسا ہو، مگر بہت سے شکاریوں کو خطرہ برداشت کرنے کے بعد یہ بات معلوم ہوگئی کہ اگر کسی عالی نسب شیر کو زخم لگایا جائیگا تو گو وہ کیسا ہی ضعیف و ناتواں بلکہ قریبِ مرگ ہی کیوں نہ ہو مگر پھر بھی اپنی اصلی جرأت و حرارت کے ساتھ ایک مرتبہ جست کرے گا اور چاروں طرف ہلاکت اور تہلکہ مچادے گا۔"

ہنگامۂ دار و گیر

غرضیکہ مسلمان مجاہدینِ آزادی نے تحریکِ آزادی کا آغاز بھی کیا اور کچھ کم و بیش آدھی صدی تک تنِ تنہا اس تحریک کو جاری بھی رکھا اور اس مدت میں برطانوی حکومت کو ہندوستان کے تختِ اقتدار پر چین سے نہ بیٹھنے نہیں دیا، انھوں نے اپنے جسم کا ایک ایک قطرہ خون دے کر جذبۂ آزادی کے اس چراغ کو روشن رکھا، انگریزی حکومت کی انتقامی کارروائیوں اور وحشت و بربریت کی تیز و تند ہواؤں میں بھی یہ چراغ جلتا رہا لیکن ۱۸ر اکتوبر ۱۸۶۳ء کی جنگ کے بعد حالات بدل گئے، تباہیوں اور بربادیوں نے گھر دیکھ لیا، حکومت کی طرف سے اندرونِ ملک بڑے پیمانے پر ان تمام مرکزوں پر چھاپے مارے گئے جہاں سے مجاہدینِ آزادی کو مدد ملتی تھی۔

مجاہدین کی فوج میں بھرتی اندرونِ ملک سے ہوتی تھی، رقوم اور رسد کا انتظام بھی یہیں سے ہوتا تھا، اسلحہ کی فراہمی اور خریداری کیلئے بھی اندرونِ ملک ہی سے بندوبست کیا جاتا تھا پھر اس کو خفیہ طور پر سرحد تک پہونچایا جاتا تھا، ان کا ایک بہت ہی خفیہ نظام تھا، انتہائی ایمانداری اور رازداری کے ساتھ رقمیں پہونچائی جاتی تھیں

اور اسلحہ سرحدی علاقوں میں بھیجے جاتے تھے، پورے ملک میں بڑے پیمانے پر چھان بین شروع ہوئی پولیس، سی آئی ڈی اندرونِ ملک ایک ایک آدمی کو سونگھتی پھرتی تھی اور جہاں کوئی آدمی مشتبہ نظر آیا اس کو گرفتار کر لیا جاتا تھا، مجاہدین کے مرکزوں کا سراغ حکومت کو چار آدمیوں کی اتفاقی گرفتاری سے لگا، مئی ۱۸۶۳ء میں ضلع کرنال میں چار آدمی جاتے ہوئے پولیس والوں کو ملے جن کی شکل وصورت درویشوں کی تھی، ان کے چہروں پر چھوٹی چھوٹی ڈاڑھیاں تھیں، پولیس افسر کو شبہ ہوا کہ ہو نہ ہو یہ بنگالی ہیں اس نے گرفتار کر لیا، پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ ہم تھانیسر میں منشی محمد جعفر سے ملیں گے پھر آگے نکل جائیں گے، پولیس نے ان چاروں کو پانی پت تھانے میں پہونچا دیا لیکن شہادت ناکافی ہونے کی وجہ سے بعد میں پولیس کو انھیں رہا کرنا پڑا، پولیس افسر کو ان کی رہائی پر سخت غصہ آیا اور اس نے مجاہدینِ آزادی کی جڑ بنیاد کھود دینے کا پلان بنایا اس نے اپنے لڑکے کو تیار کیا کہ تم ملکا (مجاہدین کا ایک مرکزی مقام) چلے جاؤ وہاں ایک شخص عبد اللہ رہتا ہے اس کی مسجد میں جا کر ٹھہر جاؤ اور اس کے ذریعہ پوری معلومات حاصل کرو کہ جماعتِ مجاہدین کو کہاں کہاں سے مدد ملتی ہے، پولیس افسر کے لڑکے نے جا کر مسجد میں قیام کیا، اس زمانے میں مجاہدین استھانہ پیش قدمی کی تیاریاں کر رہے تھے، یہ بھی ان کے ساتھ استھانہ گیا اور پوری معلومات حاصل کر کے باپ کے پاس لوٹ آیا اور پوری تفصیل بتا دی کہ مجاہدین اور اسلحہ کی فراہمی اور روانگی کا ذمہ دار محمد جعفر تھانیسری ہے، اس پولیس افسر نے اپنے افسر کپتان موزلی کو مفصل حالات بتائے اس نے رپورٹ، انسپکٹر جنرل پولیس کے پاس بھیجدی اور ضلع انبالہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کپتان پارسنز کو اس سلسلہ میں مزید تحقیقات کا حکم ملا۔ U-14361 U

انبالہ سازش کیس

مولانا محمد جعفر تھانیسری نے اس مقدمہ پر اپنی کتاب تواریخِ عجیب عرف کالا پانی میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ان کا بیان ہے کہ ۱۱ر دسمبر ۱۸۶۳ء کو پولیس افسر ڈپٹی کمشنر کو مفصل اطلاع دیکر جب بنگلہ سے نکلا تو ان کے ایک ہمدرد نے اپنے ملازم کو تھانیسر بھیج کر اطلاع کرائی

چاہی لیکن رات زیادہ گذر چکی تھی اس نے سوچا کہ صبح اطلاع کروں گا اسی رات کو کپتان پارسنز ایک بڑی پولیس فورس لے کر مولانا محمد جعفر تھانیسری کے گھر پر پہونچ گیا اور گھر کو گھیر لیا اور انکو جگا کر تلاشی کا وارنٹ دکھایا، اسی شب مولانا محمد جعفر نے مجاہدین کو روپے کے متعلق ایک خط محمد شفیع ٹھیکیدار انبالہ کے نام لکھ رکھا تھا اور وہ خط بیٹھک میں موجود تھا تلاشی میں وہ خط پولیس کو مل گیا جس میں چند ہزار اشرفیاں روانہ کرنے کا ذکر تھا، بعض دوسرے خطوط بھی پولیس کو ملے، چونکہ مولانا جعفر کی گرفتاری کا وارنٹ نہیں تھا اسلئے کپتان انکو گرفتار نہ کر سکا، البتہ منشی عبدالغفور اور ایک بنگالی لڑکے عباس کو گرفتار کر کے لے گیا، مولانا جعفر تھانیسر سے دہلی اور وہاں سے علی گڈھ پہنچ گئے کپتان پارسنز نے انکے بھائی محمد سعید کو زدوکوب کر کے مولانا جعفر کا پورا پتہ حاصل کر لیا، دوسرے دن علی گڈھ سے گرفتار کر کے انبالہ لایا، اس دوران محمد شفیع ٹھیکیدار، منشی عبدالکریم اور بعض دوسرے لوگ گرفتار کر لئے گئے، مولانا جعفر کے ایک خط سے عظیم آباد کے مرکز کا پتہ چل گیا تھا اسلئے وہاں مولانا احمد اللہ، مولانا محمد یحیٰی اور مولانا عبدالرحیم بھی گرفتار کر لئے گئے، اسی دوران مجاہدین کیلئے رقم لے جاتے ہوئے حسینی تھانیسری بھی گرفتار ہو گیا، ان سب کو انبالہ پہونچایا گیا، گرفتاری کے بعد جو اذیتیں ان حضرات کو پہونچائی گئیں اس کا کچھ اندازہ مولانا محمد جعفر کی خود نوشت آپ بیتی سے ہوتا ہے، یہ لوگ اپنے وقت کے نہایت معزز، خوشحال رئیس افراد تھے ان کو ہتھکڑیاں اور طوق پہنائے گئے، انگریز افسران دائیں بائیں بھرے ہوئے پستول لے کر بیٹھے مولانا محمد جعفر حسینی عظیم آبادی اور معظم سردار کو علیحدہ پھانسی کی کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا، یہ مقدمہ انبالہ میں کپتان ٹائی ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں پیش ہوا۔

مندرجہ ذیل اصحاب اس مقدمۂ سازش و بغاوت کے ملزم بنائے گئے۔

۱۔ شیخ محمد شفیع ٹھیکیدار جو ایک رئیسِ کبیر آدمی تھے انکی جائداد پچاس لاکھ سے کم نہیں تھی۔
۲۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری، تجارت اور زمینداری کا کاروبار خاصا وسیع تھا

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں شریک تھے۔

۳۔ مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی عمر ۴۷ سال رازداری کے خیال سے نام بدل کر محی الدین رکھ لیا گیا تھا۔

۴۔ مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی عظیم آباد کے رئیس، جاگیردار، عمر تقریباً ۲۸ سال تھی۔

۵۔ میاں عبدالغفار، مجاہدین احتراماً انکو سیدی میاں عبدالغفار کہا کرتے تھے۔

۶۔ قاضی میاں جان ساکن کمارکھلی ضلع پٹنہ؛ انکے متعدد نام تھے اور ممتاز کارکنوں میں سے تھے۔

۷۔ عبدالکریم انبالوی۔ عمر ۳۵ سال یہ شفیع ٹھیکیدار کے مختار تھے۔

۸۔ حسینی ابنِ محمد بخش۔ عمر ۲۵ سال مولانا محمد جعفر کے معاون تھے۔

۹۔ عبدالغفور شاہ آبادی۔ عمر ۲۵ سال

۱۰۔ حسینی عظیم آبادی عمر ۳۵ سال

۱۱۔ الٰہی بخش۔ ابنِ کریم بخش، یہ مولانا احمد اللہ عظیم آبادی کے مختار تھے، مجاہدین کو رقمیں زیادہ تر انھیں کے ذریعہ بھیجی جاتی تھیں۔

مشہور انبالہ سازش کیس کے سلسلہ کا یہ پہلا مقدمہ تھا، پولیس نے کچھ لوگوں کو پکڑ کر اور پھانسی کی دھمکی دیکر سرکاری گواہ بنالیا تھا اور ان سے جبراً شہادتیں لے کر ابتدائی کاروائی کے بعد مقدمہ سیشن سپرد ہوا، توسب کو جیل میں اکٹھا کر دیا گیا، ملزمین کے وکلا نے عدالت میں معرکۃ الآرا بحثیں کیں مگر حکومت کی ہدایات کے زیرِ اثر سخت سزاؤں کا پہلے ہی فیصلہ کیا جا چکا تھا، اسلئے ہربرٹ ایڈورڈز نے جو فیصلہ لکھا وہ روداد کے ایک سو پانچ صفحات پر مشتمل ہے، ہربرٹ ایڈورڈز کے فیصلہ کی اجمالی کیفیت درج ذیل ہے۔

۱۔ محمد شفیع ٹھیکیدار، سزائے موت، مع ضبطی جائداد اور لاش گورستانِ جیل میں دفن کی جائے۔

۲۔ مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی، سزائے موت مع ضبطیِ جائداد، لاش جیل کے قبرستان میں دفن کی جائے۔

۳۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری سزائے موت مع ضبطیِ جائداد۔

۴ - مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی ، حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور، مع ضبطیِ جائداد۔
۵ - قاضی میاں جان " " " "
۶ - میاں عبدالغفار " " " "
۷ - منشی عبدالکریم " " " "
۸ - عبدالغفور " " " "
۹ - الٰہی بخش " " " "
۱۰ - حسینی عظیم آبادی " " " "
۱۱ - حسینی تھانیسری " " " "

فیصلہ ۲ رمئی ۱۸۶۴ء کو سنایا گیا، جوڈیشنل کمشنر پنجاب کی عدالت میں اپیل کی گئی اس وقت رابرٹس جوڈیشنل کمشنر تھا، اس نے ۶۸ صفحات میں اپنا فیصلہ لکھا۔ جسمیں مولانا یحییٰ علی، مولوی محمد جعفر اور شیخ محمد شفیع کی سزائے موت کو حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور میں بدل دیا۔

یہ فیصلہ اور سازش وبغاوت کے مقدمہ کا ڈرامہ سب کچھ سراسر منتقمانہ جذبات کے زیرِ اثر دحشت وبربریت کا مظاہرہ تھا، ان پر جو فردِ جرم لگائی گئی یہ تھی کہ ملزمان استھانہ اور ملکا کے ہندوستانی مجاہدین حکمرانِ برطانیہ کے دشمن ہیں اور اس کے خلاف جنگ کر چکے ہیں۔ ملزم برطانوی رعایا ہیں لیکن ان کے ذریعہ سے مجاہدین کو روپے اور آدمیوں کی مدد ملتی ہے اس طرح دانستہ اور غدارانہ اس عہدِ وفا واطاعت کی خلاف ورزی کی جو رعایا کے ہر سچے اور وفادار فرد کے دل میں اپنے حکمراں کیلئے موج زن رہنا چاہیے۔

فیصلہ کے بعد کچھ ملزمان کو انبالہ جیل میں رکھا گیا، مولانا یحییٰ علی، عبدالغفار اور مولانا جعفر کو دوسرے قیدیوں کے ساتھ انبالہ سے پیدل روانہ کیا گیا لدھیانہ، پھلور، جالندھر اور امرتسر کے راستے لاہور پہونچایا گیا، اس پورے سفر میں ان کے بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں چندماہ لاہور جیل میں گذرے، پھر وہاں سے ملتان وہاں سے کوئٹہ پھر کراچی بھیجے گئے، پھر بادبانی جہاز سے بمبئی تھانہ جیل میں بھیج دیے گئے، ۸ ردسمبر

۱۸۶۵ء کو بمبئی سے جمنا جہاز سے چل کر ۱۱؍جنوری ۱۸۶۶ء کو کالے پانی (جزیرۂ انڈمان) پہونچے، مولانا عبدالرحیم صاحب کو علیحدہ سے دوسرے جہاز کے ذریعہ کالے پانی بھیجا گیا۔

عظیم آباد کا سازش کیس

سازش و بغاوت کا دوسرا مقدمہ عظیم آباد کے معزز و محترم صاحبِ علم و فضل رئیسِ کبیر مولانا احمد اللہ صاحب پر چلایا گیا، ان کے بھائی مولانا یحیٰ علی پر جب انبالہ سازش کیس چلایا گیا اس دور میں مولانا احمد اللہ صاحب نے جماعت کے کاموں کو کچھ دنوں سنبھالا تھا بس اسی بنیاد پر ان پر بغاوت کا مقدمہ قائم کر دیا گیا، اس میں سب سے اہم رول ولیم ٹیلر نے ادا کیا، کیونکہ مولانا موصوف کی وجہ سے اسکو کمشنری کے عہدے سے استعفا دینا پڑا تھا۔ وہ عظیم آباد ہی میں وکالت کر رہا تھا، کچھ لوگوں کی فرضی گواہیوں پر اس مقدمہ کی ساری بنیاد تھی مگر حکومت پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی کہ مجاہدین کے اس اہم مرکز کو تباہ و برباد کر دے اسلئے ۲۷؍فروری ۱۸۶۵ء کو ضبطیِ جائداد کے علاوہ پھانسی کا فیصلہ سنایا گیا، پھر اس کو حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور میں بدل دیا گیا۔

مولانا موصوف کو جب پھانسی کا حکم سنایا گیا تو ان پر کوئی پریشانی طاری نہیں ہوئی اور جبینِ استقامت پر کوئی شکن نہیں آئی مگر اسی کے ساتھ ضبطیِ جائداد نے اس رئیس اور امیرِ کبیر خاندان کے افراد کی جو حالت بنادی اس نے ہر ایک حساس انسان کی آنکھوں میں آنسو بھر دیے، عین عید الفطر کے دن ان کو انکے گھروں سے نکال کر بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا اور گھر سے ایک سوئی بھی لے جانے کی اجازت نہیں دی گئی، مولانا موصوف کو ۱۵؍جون ۱۸۶۵ء کو کالے پانی بھیجدیا گیا۔

بغاوت کے دوسرے مقدمات

مولانا یحیٰ علی اور مولانا احمد اللہ جیسی عظیم شخصیتیں جماعتِ مجاہدین کے نظام کو جان پر کھیل کر چلا رہی تھیں، رقوم کی فراہمی، انقلابیوں کی بھرتی، اسلحہ کا انتظام اور ان تمام چیزوں کی سرحدی علاقوں میں روانگی انتہائی خفیہ طریقے سے مسلسل جاری رہی، مگر انبالہ سازش کیس اور عظیم آباد کے مقدمۂ بغاوت میں ان بزرگوں کو دل دہلانے والی سزائیں دیکر

کمزور دل والوں کو ہلاکر رکھدیا تھا، اس صورت حال میں بہت ممکن تھا کہ یہ نظام کار معطل ہوکر رہ جائے اور انگریزوں کے خلاف جد وجہد ختم ہوجائے لیکن مسلمانوں میں اب بھی ایسے افراد موجود تھے جو اپنی جانوں پر مقصدِ آزادی کے حصول کو ترجیح دیتے تھے اور اس نظام کو معطل ہونے سے بچانے کیلئے اپنی جانوں کو داؤ پر لگانے کیلئے تیار تھے، چنانچہ ان لوگوں کے بعد مولانا مبارک علی میدان میں آئے جو حاجی پور ضلع مظفر پور (بہار) کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنا وطن چھوڑ کر عظیم آباد میں سکونت اختیار کرلی اور اپنی جان جوکھم میں ڈالکر تنظیم جماعت کے کاموں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا خود انگریزوں کو اعتراف تھا کہ ان عبرتناک سزاؤں کے بعد بھی جماعت کا کام بدستور جاری رہا، ڈبلو ڈبلو ہنٹر کا بیان ہے کہ:

> "۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۸ء تک روپے کی فراہمی اور مجاہدین کی بھرتی بدستور جاری رہی اور سازش سے عہدہ برآ ہونے کیلئے حکومت کو ایک خاص محکمہ قائم کرنا پڑا، یہ سطریں قلمبند کرنے کے وقت مجاہدین کی دیکھ بھال کرنے اور ان کو جائز حدود میں رکھنے پر صرف ایک صوبے میں جو کچھ خرچ ہو رہا ہے وہ اتنا ہے کہ ایک ایسے برطانوی ضلع کے دیوانی وفوجداری انتظامی مصارف کیلئے کفایت کرے جس کی آبادی اسکاٹ لینڈ سے ایک تہائی ہو، فتنہ اس درجہ پھیل چکا تھا کہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ انسداد کا کام کہاں سے شروع کیا جائے، ہر ضلع کا مرکز (تنظیم مجاہدین کا مرکز) ہزاروں کنبوں میں بے چینی اور بدامنی پھیلاتا ہے، ناظمِ مرکز کے خلاف شہادت انھیں لوگوں سے مل سکتی ہے جو اسکے ہاتھ پر بیعت کرچکے ہیں اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ اپنے مرشد کا راز فاش کرنے کے بجائے مرجانے کو ترجیح دیں گے (ہندوستانی مسلمان ص ۹۲)"۔

مالدہ کا مقدمۂ بغاوت

یہ مرکز مولانا ولایت علی کے ایک خلیفہ مولانا عبدالرحمٰن لکھنوی نے قائم کیا تھا وہ اس ضلع کے ایک گاؤں میں ٹھہر گئے، یہ بڑے پرجوش اور موثر انداز میں لوگوں کو جہاد کی تعلیم دیتے تھے ان سے باقاعدہ

اعانتی رقمیں وصول کرتے اور سال بہ سال جمع کردہ رقمیں اور فراہم شدہ آدمی عظیم آباد بھیج دیتے کہ انھیں سرحد پہونچانے کا انتظام کر دیا جائے، انھیں کے ساتھ کام کرنیوالے مالدہ کے رفیق منڈل بھی تھے، ان کے بعض خطوط سے سی، آئی، ڈی کو ان پر شبہ ہوا اور رفیق منڈل گرفتار کر لئے گئے لیکن ثبوت ناکافی ہونے کی وجہ سے کچھ دنوں کے بعد رہا کر دیئے گئے تو یہ کام ان کے لڑکے مولوی امیرالدین نے سنبھال لیا، انھوں نے جماعت کے نظام کو اور زیادہ وسیع کر دیا، پورے ضلع مالدہ کے علاوہ دوسرے اضلاع مرشدآباد اور راج شاہی میں بھی مجاہدین میں بھرتی کا کام شروع کر دیا، مولوی امیرالدین اور ان کے رفقارِ کار کا راز مولانا احمداللہ صاحب عظیم آبادی کے مقدمہ کے دوران فاش ہو چکا تھا مولوی امیرالدین صاحب کو پٹنہ میں گرفتار کر لیا گیا، ان کے خلاف بغاوت پھیلانے اور سازشیں کرنے کا مقدمہ چلایا گیا حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور اور ضبطی جائداد کی سزا دی گئی، اور مارچ ۱۸۶۲ء میں وہ کالے پانی بھیج دیئے گئے، اس سے پہلے انکو ہندوستان میں ایک سال سے زائد مدت تک مختلف جیلوں میں منتقل کرتے رہے اسکے بعد جزیرۂ انڈمان روانہ کیا گیا۔

راج محل کا مقدمۂ بغاوت

مالدہ کے مقدمۂ بغاوت کے فوراً بعد ابراہیم منڈل ساکن اسلام پور راج محل کے خلاف بغاوت کا مقدمہ قائم کیا گیا، بزرگانِ عظیم آباد سے ان کا تعلق تھا جماعتِ مجاہدین کا کام بڑی سرگرمی اور خلوص سے کرتے تھے، ابراہیم منڈل کو اکتوبر ۱۸۷۰ء میں حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور مع ضبطیِ جائداد کی سزا ہوئی مگر ان کو کالے پانی نہیں بھیجا گیا بلکہ ہندوستان کے اندر ہی مختلف جیلوں میں رکھا گیا ایک روایت کے مطابق نو برس جیل میں گذارنے کے بعد لارڈ لٹن کے حکم سے ۱۸۷۸ء میں رہا کر دیا گیا ان کا انتقال بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا

عظیم آباد کا دوسرا مقدمۂ بغاوت

مجاہدینِ آزادیِ ہند کے خلاف عظیم آباد میں ایک اور بڑا مقدمۂ بغاوت قائم کیا گیا، یہ مقدمہ ۱۸۷۱ء میں قائم ہوا اسکے ملزمان میں پیر محمد، امیر خاں، حشمت داد خاں مولوی مبارک علی، مولوی تبارک علی، حاجی دین محمد اور امین الدین تھے، مولوی تبارک علی

کے خلاف الزام یہ تھا کہ انھوں نے مولانا عبداللہ امیر المجاہدین کے ساتھ انگریزی فوجوں سے جنگ کرنے میں حصہ لیا تھا اور ایک فوجی دستہ کی کمان کی تھی، پیر محمد، دین محمد اور امین الدین پر یہ جرم عائد کیا گیا تھا کہ یہ لوگ مجاہدین کی مدد کرتے تھے، امیر خاں اور حشمت داد خاں پر مالی اعانت کا الزام تھا، مقدمہ کی ابتدائی سماعت مسٹر بار بر منصرم جائنٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں یکم مارچ ۱۸۷۱ء کو شروع ہوئی، ۲۷ مارچ ۱۸۷۱ء کو ملزمان کو سیشن سپرد کر دیا گیا، یکم مئی ۱۸۷۱ء سے مقدمہ کی سماعت، مسٹر پرنسپ سیشن جج کی عدالت میں شروع ہوئی۔

حکومت کی طرف سے ۱۳۶ گواہ تھے، اسی سال کے آخر میں کسی تاریخ کو فیصلہ سنا دیا گیا امیر خاں اور حشمت داد خاں اس زمانے کے کروڑپتی تھے، بہت بڑا کاروبار تھا کپتان پارسنز نے ان کے مکان کی تلاشی لی تھی جس میں ایک ہُنڈی اہلِ عظیم آباد کی اس کو مل گئی۔ یہی ان لوگوں کو گرفتار کرنے کی بنیاد بن گئی اور جولائی ۱۸۵۹ء کو انکو گرفتار کرلیا گیا۔ نہ کوئی وارنٹ دکھایا گیا اور نہ گرفتاری کا سبب بتایا گیا، بس دو انگریز پولیس افسران آئے اور اچانک ان کو گرفتار کر کے لے گئے، یہ تو امیر خاں کے ساتھ ہوا، حشمت داد خاں کو بورسی پٹنہ میں گرفتار کیا گیا اور ویلدگا جیل میں ڈال دیا گیا، امیر خاں کو ہوڑہ سے گیا لے گئے جہاں ان کو ۱۸۵۹ء سے ۱۸۶۹ء تک دس سال جیل میں رکھا گیا بعد میں افسران نے بتایا کہ ان کو ملکہ وکٹوریہ کے حکم سے گرفتار کیا گیا ہے، امیر خاں اور حشمت داد خاں نے مشہور انگریز وکلاء کو مقدمہ کی پیروی کیلئے بلایا، بڑی معرکۃ الآرا عدالت میں بحثیں ہوئیں، ملزمان کی طرف سے حبسِ بے جا کی درخواست جسٹس نارمن کلکتہ کی عدالت میں پیش کی گئی، مسٹر نارمن نے ۱۹ اگست ۱۸۷۱ء کو درخواست نا منظور کر دی، اس کے علاوہ درخواستِ ضمانت جو دی گئی تھی وہ بھی خارج کر دی گئی اور نا منظور ہو گئی، مگر حشمت داد خاں اور پیر محمد کے خلاف جرم ثابت نہ کیا جا سکا اسلئے جولائی ۱۸۷۱ء میں ان کو رہا کر دیا گیا، باقی پانچ ملزمان کو حسبِ معمول حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور مع ضبطیٔ جائداد کا فیصلہ سنا دیا گیا، فیصلہ کے بعد امیر خاں کی کروڑوں کی جائداد ضبط کر لی گئی، البتہ ان کو کالے پانی نہیں بھیجا گیا۔

مولوی مبارک علی جزیرۂ انڈمان بھیجے جانے سے قبل ہی جیل میں انتقال کر گئے امیر خان کو ۱۸۸۱ء میں کسی وجہ سے رہا کر دیا گیا جب وہ کروڑوں کی جائداد کی تباہی کے بعد نانِ شبینہ کے محتاج ہو چکے تھے، دس سال کے قریب مقدمہ اور جیل میں گذارے اُسی سال نومبر ۱۸۸۱ء میں کلکتہ میں وفات پائی اور عظیم آباد میں دفن کئے گئے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

چیف جسٹس نارمن کا قتل

اسی مقدمۂ بغاوت کے سلسلہ میں کلکتہ ہائیکورٹ کے جسٹس مسٹر نارمن پر قاتلانہ حملہ ہوا، جب اس مقدمہ میں ملزموں کی سخت سزاؤں کا فیصلہ سنایا گیا، یہ فیصلہ سنانے والے جج مسٹر نارمن تھے، اس ظالمانہ فیصلہ نے لوگوں کے دلوں کو غم و غصہ سے بھر دیا، جذبات سے مغلوب ہو کر ایک شخص عبداللہ پنجابی نے احاطۂ عدالت میں ان پر قاتلانہ حملہ کیا اور کاری زخم آئے، جس کی وجہ سے ۲۱ ستمبر ۱۸۷۱ء کو جسٹس نارمن فوت ہو گیا عبداللہ گرفتار ہوئے اور انکو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

وائسرائے ہند لارڈ میو کا قتل

لارڈ میو ۱۸۶۹ء میں ہندوستان کا گورنر جنرل اور وائسرائے ہو کر آیا، وہ جزیرۂ انڈمان بچشمِ خود معائنہ کرنے کیلئے گیا، وہ فروری ۱۸۷۲ء میں جزیرۂ انڈمان پہونچا، جب مسٹر نارمن کا قتل اور اس کی سزا میں عبداللہ پنجابی کو پھانسی پر چڑھایا جا چکا تھا اور اس کی خبر جزیرے میں پہونچ چکی تھی، بعض مسلمانوں کو اس سے سخت رنج پہونچا تھا اور اپنی مظلومیت کا انکو شدید احساس ہوا تھا۔

جزیرہ کے چیف کمشنر نے وائسرائے کی حفاظت کے انتظام کو اطمینان بخش قرار دیا کیونکہ حفاظت کی پوری تیاری کر لی گئی تھی، وائسرائے کی حفاظت کے پیشِ نظر یہ انتظام کیا گیا تھا۔

"تمام قیدیوں کو حکم دیا گیا کہ ہر شخص اپنے اپنے کام پر موجود رہے کوئی قیدی غیر حاضر نہ رہے، دوسرے یہ کہ پولیس کی گارد وائسرائے کے دائیں بائیں

آگے اور پیچھے ہمہ وقت رہیگی، گارد کے ہر سپاہی کی بندوق بھری ہوئی رہیگی۔ تیسری بات یہ کہ جن جزیروں میں زیادہ سنگین مجرم رہتے ہیں ان جزائر میں مسلح پولیس کے علاوہ فوج بھی وائسرا کی حفاظت پر مامور ہوگی۔"

اس طرح پولیس اور فوج کے مکمل پہرے اور حفاظت میں وائسرائے نے چل پھر کر جزیروں کے حالات سے واقفیت حاصل کی، آخر میں ماؤنٹ ہیریٹ کو دیکھنے کیلئے گیا جہاں ایک سینی ٹوریم بنانے کی تجویز تھی اب اس کے بعد کا واقعہ مولانا جعفر احمد تھانیسری کی زبانی سنیے جو اس زمانے میں جزیرۂ انڈمان میں سزا کے دن کاٹ رہے تھے، انھوں نے اپنی کتاب تواریخِ عجیب عرف کالا پانی میں اس واقعہ کے بارے میں لکھا ہے:

"لارڈ صاحب ہل ہوپ ٹاؤن پر پہونچے، دو مشعل والے لارڈ صاحب کے آگے سپرنٹنڈنٹ صاحب اور پرائیویٹ سکریٹری لارڈ صاحب کے دائیں جانب اور بائیں جانب اور ایک لفٹنٹ اور ایک کرنل تھوڑے فاصلے پر پیچھے کی طرف لارڈ صاحب کے دائیں بائیں چلتے تھے، مسلح گارد فری پولیس کا لارڈ صاحب کے پیچھے پاؤں سے پاؤں ملا ہوا چلتا تھا، لارڈ صاحب نے مع پرائیویٹ سکریٹری آہستہ آہستہ چل کر گھاٹ کی سیڑھیوں کی طرف جاکر بوٹ میں اُترنا چاہا اس وقت یک بیک لارڈ صاحب کے پیچھے کچھ ضرب کے کھٹکے کی آواز سنی گئی اور جب اس طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ لارڈ صاحب کی پشت پر کوئی ہاتھ مع چھری کے وار کر رہا ہے اور ایک آدمی لارڈ صاحب کی پشت سے چمٹا ہوا ہے دس بارہ آدمی ایک دم اس شخص پر گر پڑے، ایک قیدی نے پکڑ کر چھری اسکے ہاتھ سے چھین لی، افراتفری میں مشعلیں گل ہو گئیں پرائیویٹ سکریٹری نے قیدی کو مار پیٹ سے چھڑایا۔

لارڈ میو چھری کی ضرب کھا کر سمندر میں گر پڑے جب دیکھا تو وہ

گہرے پانی میں کھڑے اپنا منہ صاف کر رہے ہیں، پانی سے نکالا گیا
تو چند منٹوں بعد گر پڑے اور ختم ہو گئے"

بہادر شیر علی

جسٹس نارمن کے قاتل عبداللہ کو پھانسی دی گئی تھی، اسی دن شیر علی نے قسم کھالی تھی کہ وہ کسی بڑے انگریز کو ضرور قتل کریگا وہ اکثر روزے رکھتا تھا، محنت مزدوری کر کے جب کچھ پیسے مل جاتے تھے تو ہر مہینے کھانا پکوا کر مسکینوں میں تقسیم کرتا تھا اور جزیرہ میں وہ بڑا نیکنام اور ممتاز تھا، اسی نیک چلنی کی وجہ سے اس کی زیادہ نگرانی بھی پولیس نہیں کرتی تھی، وائسرائے کے قتل کے بعد اس پر مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا ہوئی، تختہ پر کھڑے ہو کر اس نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ!

"میں نے جب اس کام کا ارادہ کیا تھا تو اپنے تئیں مردہ سمجھ لیا تھا، مسلمان بھائیو! میں نے تمہارے دشمن کو مار ڈالا، اب تم شاہد رہو کہ میں مسلمان ہوں اور پھر کلمہ پڑھا، دو دفعہ کلمہ ہوشیاری سے پڑھا تیسری دفعہ پھانسی کی رسی سے اس کا گلا گھٹ گیا اور پورا کلمہ زبان سے نہ نکل سکا"

مجاہدینِ آزادی کی کفن بردوش جماعت

مجاہدینِ آزادی کی جماعت جس کا ذکرِ خیر چل رہا ہے درحقیقت ہندوستان کو غیروں کے ناپاک قدم سے پاک کرنے کیلئے سروں سے کفن باندھ کر نکلی تھی حیاتِ مستعار کی ان کی نگاہوں میں کوئی قیمت نہیں تھی۔ بدن میں جان کی قیمت انکے نزدیک اتنی ارزاں اور کم تھی کہ جب مذہب اور وطن کی سربلندی اور اس کی عظمت و حرمت کی جنگ اس کا مطالبہ کرے تو بلا تامل اپنی جانیں قربان کر دیں، جیسے کسی فقیر کی جھولی میں چند پیسے انتہائی بے نیازی کے ساتھ کوئی ڈالدے، ان کی سیاست خالص دنیا داروں کی سیاست نہیں تھی کیونکہ ان کا رشتہ اپنے خدا سے اتنا مضبوط تھا کہ سرِ مو اس کے حکم کی خلاف ورزی سرزد نہیں ہو سکتی تھی یہی وجہ تھی کہ ان کی آواز میں جادو تھا، عوام کے سامنے انکے چند جملے

سحر بن جاتے تھے دیوانہ وار لوگ ان کے حکموں پر عمل آوری کیلئے دوڑ پڑتے تھے، وہ دین اور سیاست کو علیحدہ علیحدہ دو چیزیں نہیں سمجھتے تھے اور نہ ان دونوں کے درمیان خطِ امتیازی کھینچنے کے قائل تھے تحریک کے قائد سید احمد رائے بریلوی، مولانا اسمٰعیل شہید، مولانا عبدالحئی بڈھانوی تھے جن کے زہد و تقویٰ للہیت و خدا ترسی کی قسمیں کھائی جاتی تھیں ان کے اخلاص، بے لوثی، بے غرضی پر عوام ایمان رکھتے تھے، اسلئے پورے ہندوستان میں وہ معزز و محترم تھے اگر وہ اپنی اس جنگ میں کامیاب ہوجاتے تو اندرونِ ملک ان کے فداکاروں کی ایسی منظم جماعت وجود میں آجاتی کہ برطانوی حکومت کی توپ و تفنگ بھی اس آہنی دیوار کو نہیں توڑ سکتی تھی اور انگریزوں کا زمانۂ حکومت سمٹ کر چند سالوں میں ختم ہوجاتا۔

انگریزی حکومت جب اس تحریک کی روحانی طاقت کا تصور کرتی تھی تو پاگل ہوجاتی تھی اور ہر امکانی طاقت لگاکر اس کو شکست دینے کیلئے میدان میں آتی تھی وہ دیکھتی تھی کہ اس تحریک کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت شعلۂ جوّالہ بنی ہوئی ہے کبھی اس آگ کی لپٹ بنگال میں نظر آتی ہے، کبھی بہار میں اور اتر پردیش میں انگارے دہکنے لگتے ہیں تو کبھی پنجاب میں، اس طرح ہندوستان میں مشرق سے مغرب تک انگریزی حکومت کی راہوں میں شعلے ہی شعلے بچھے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں، حکومت نے اس آگ کو بجھانے اور ان دہکتے ہوئے شعلوں کو سرد کرنے میں جتنی طاقت صرف کی اس کا نتیجہ برعکس نکلا، تب مدبرینِ برطانیہ نے اپنا طریقۂ جنگ بدلا آگ اور بارود کا کھیل ختم کرکے ڈپلومیسی کی راہ اختیار کی اور انھوں نے ایک فارمولہ دریافت کیا۔

ڈیوائڈ اینڈ رول

یعنی لڑاؤ اور حکومت کرو، ،تصادم کی راہ چھوڑ کر ہندوستان میں ذہنی و فکری تصادم پیدا کردو، ان کی طاقت آپس میں ٹکرا ٹکرا کر اپنا وجود خود کھودے گی پھر پوری سرگرمی سے اس پالیسی پر عمل کیا گیا درجنوں کتابیں لکھی گئیں، پروپیگنڈہ کیا گیا کہ سرحد اور آزاد قبائل میں برطانوی اقتدار کے خلاف جنگ کرنے والے عبدالوہاب نجدی کے بقیۃ السیف ہیں، وہابیوں کی یہ ایک

جماعت ہے جو ہندوستان میں وہابی تحریک چلاکر ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب دیکھتی ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کو اس راہ پر لے جانا چاہتی ہے جس راہ پر عبدالوہاب نجدی نے حجاز کو لے جانا چاہا تھا اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں تمام مقدس مزارات اور گنبدِ خضراء کو ڈھاکر اسلامی روایات کا خون کرنے کا ارادہ کیا تھا اور عربوں نے وہابی تحریک کی اسلام دشمنی کے خلاف نبردآزما ہوکر حجاز کی سرزمین میں دفن کردیا، اب ہندوستان میں اسی وہابی تحریک کی نشاۃِ ثانیہ کی جارہی ہے، یہ پروپیگنڈہ انھوں نے عالمی پیمانے پر کیا اس مقصد کے لیۓ درجنوں کتابیں لکھی گئیں جن میں سے چند نام بطورِ مثال پیش ہیں:

۱- بدوزاینڈ وہابیز" مصنف برک ہرڈس
۲- "ہسٹری آف دہابیز" مصنف براِنچ بریف
۳- "پولیٹیکل مشن ٹو نجد" مصنف سرلیوس پیلس
۴- "مسلمس آف انڈیا" مصنف ڈبلوڈبلو ہنٹر
۵- "سنٹرل اینڈایسٹرن عربیہ" مصنف پیلگریو
۶- "امام اینڈ سید آف عمان" مصنف دی، آر بیڈجرس
۷- "پیلگریج ٹو نجد" مصنفہ لیڈی امنس پلنٹس
۸- "فیوچر آف اسلام" مصنفہ پلنٹس

ان تمام کتابوں میں قدرِ مشترک کے طور پر جو افسانہ تراشا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"اگرچہ وہابیوں کی جنگی اور ملکی طاقت چکناچور ہوگئی اور سید کے خاندان کی حکمرانی حدودِ نجد میں محدود ہوکر رہ گئی مگر پھر بھی وہ اصولِ مذہبی جو محمد بن عبدالوہاب نجدی نے بنائے تھے اب تک مساجد میں نہایت مذہبی جوش وخروش سے بیان کیے جاتے تھے، اسی تحریک نے ہندوستان کے ایک بزرگ کی بےآرام روح میں مذہبی ولولے کی نئی روح پھونک دی جب یہ بزرگ مکہ شریف حج کرنے کیلئے آیا تو اس نے وہابیوں کے

بڑے فاضل سے وہابی مذہب کی تعلیم حاصل کی، سید احمد رائے بریلی کے قزاق اور رہزن نے ۱۸۲۶ء میں حجِ بیت اللہ کرکے چاہا کہ شمالی ہند کو یک تحت وہابی اصول منوادوں، پیغمبر اسلام کے براہِ راست اولاد میں ہونے سے (برخلاف وہابیانِ نجد کے) اس نے اپنے اندر امیر المومنین بننے کی ضروری صفات ملاحظہ کیں، مسلمانانِ ہند نے اُسے سچا خلیفہ یا مہدی تسلیم کرلیا، انگریزی حکام کی لاعلمی میں وہ ہمارے صوبوں میں گشت لگاتا پھرا اور بیشمار لوگوں کو اپنا مُرید بنالیا اس نے اپنے کارندے پٹنہ میں مقرر کئے اور پھر دہلی کی طرف رخ کیا، یہاں خوش قسمتی سے ایک بڑا مولوی محمد اسمٰعیل اس کا مرید ہوگیا اور آخر میں اپنے پیر کا ایسا والہ و شیدا ہوا کہ اس نے خلیفہ کے اصولِ مذہبی کی ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "صراطِ مستقیم" ہے، ۲۰ ستمبر ۱۸۲۶ء میں اس نے رنجیت سنگھ کے خلاف جہاد کا جھنڈا بلند کیا، پشاور اور حدودِ پشاور میں اس نے قیامت برپا کردی، جہاں چار برس جنگیں ہوتی رہیں جس میں سید احمد ہی کو برابر کامیابی ملتی رہی، اب وہابیہ لشکر کی قوت اور بھی خوفناک ہوگئی تھی، وہ ابھی اور بڑھتی مگر اتفاق سے بالاکوٹ کی جنگ میں مئی ۱۸۳۱ء میں اسکے قتل ہوجانے کی وجہ سے رک گئی ہزیمت یافتہ لشکر کا بقیہ حصہ حدود پار کرکے استھانہ میں جاکر آباد ہوگیا ۱۸۶۳ء کی جنگ میں برٹش گورنمنٹ نے ان کا مکمل صفایا کیا۔"

انگریزی ترکش کا ایک تیر سید احمد رائے بریلوی اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید کی تحریک اور ان کے جانشینوں کی جدوجہد اور ان کی جاں فروشیوں اور قربانیوں کو وہابی تحریک کہکر ان کی قدر و قیمت کو گھٹانے کے علاوہ تاریخی حقائق کو منہ چڑاتا ہے اور اس صریح جھوٹ اور افسانہ تراشی

کی وہی شخص جرأت کرسکتا ہے جس کی بے حیائی اس حد تک پہونچ چکی ہو کہ اسکا جھوٹ اس کے منہ پر کھول بھی دیا جائے تو اس کو ندامت وشرمندگی محسوس نہ ہو، وہابیت کا الزام درحقیقت انگریزی سیاست اور ڈپلومیسی کے ترکش کا ایک زہریلا تیر تھا جو ان فرشتہ صفت انسانوں کی ایک مقدس جماعت کے سینوں میں پیوست کردیا گیا ہے تاکہ ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو شکست دیا جاسکے اور ان کی جد وجہد سے برطانوی اقتدار کو جو شدید خطرہ لاحق ہے اس کا ایک صدی تک کیلئے ضرور سدِ باب ہوجائے، ان کو خطرہ پیدا ہوگیا کہ اگر اس تحریک نے سرحدی علاقوں میں طاقت پکڑلی اور افغانستان کی ہمدردیاں حاصل کرلیں تو پھر وہ شاہراہ کھل جائے گی جس سے گذر کر تاریخ ہند کے ہر دور میں فاتحین آتے رہے اور اس سرزمین پر اپنا اقتدار قائم کرتے رہے اگر مجاہدینِ آزادی کو افغانستان، ترکی، ایران اور دوسرے ممالک کی فوجی مدد حاصل ہوگئی تو انگریزوں کا وجود ان کے رحم وکرم پر منحصر ہوکر رہ جائے گا، کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ تمام فوجی کارروائیوں کے باوجود یہ تحریک زندہ ہے اور اس کی سرگرمیوں میں برابر اضافہ ہوتا جارہا ہے، اسلئے انگریزوں نے اس تحریک کو دبانے اور اس کا زور توڑنے کیلئے اپنی پالیسی بدل دی اور سازش اور فریب کاری کا رویہ اپنایا اور اس جماعت کے خلاف پہلا بم وہابیت کا پھینکا جس کا دھواں پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔

اس الزام کے پسِ پردہ ان کی وہ فطرت کام کررہی ہے جس سے کام لے کر سوداگروں کی یہ قوم جو مچھلی، بھُس اور بانس اور نیل بیچتی پھرتی تھی اور نیل کی کاشت کرکے گندے حوضوں میں تیل بنایا کرتی تھی ہندوستان کی حکومت پر قابض ہوگئی۔

سچائی کیا ہے؟

انگریزوں نے وہابیت کا پروپیگنڈہ اتنے بڑے پیمانے پر کیا کہ اب اس کو جھوٹ، بے اصل اور فرضی الزام کہدینے سے کسی سچائی کا یقین نہیں دلایا جاسکتا، کیونکہ وہابیت کے پروپیگنڈہ نے خود ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک جماعت کو انگریزوں نے اپنا ہم نوا بنالیا ہے اور جو ایک مشن کے طور پر برابر اس کا پروپیگنڈہ کرتی رہی ہے اور انگریزوں سے ایک قدم آگے بڑھکر

ان کو دائرہ اسلام سے خارج کرکے انگریزوں کے مقصد کو پورا کر دیا اور پوری ایک صدی سے مسلسل یہ الزام دُہرایا جارہا ہے اور انگریزی سیاست کو زبانِ حال سے خراجِ تحسین پیش کیا جارہا ہے۔

ہندوستان میں وہابی کا لفظ اس وقت تک نہیں سنائی دیا جبتک سید احمد اور مولانا اسمٰعیل شہید کی جنگ رنجیت سنگھ کی فوجوں سے ہوتی رہی کیونکہ وہ خود مختار ریاست تھی اور ابھی تک اس کا الحاق انگریزوں نے نہیں کیا تھا، اس وقت تک انگریز کارخانہ داروں کے مسلمان ملازمین اپنے انگریز مالکوں سے باقاعدہ رخصت لے کر اس جہاد میں شرکت کرتے تھے اور وہ بخوشی اس کی اجازت دیتے تھے کیونکہ انگریز خود رنجیت سنگھ کی طاقت کو کمزور کرنا چاہتے تھے تاکہ یہ لقمۂ تر بھی ان کے حریص حلق کے نیچے اُتر جائے لیکن سید صاحب کے بعد جب انکے خلفاء اور جانشینوں نے ۱۸۵۳ء میں انگریزی فوج پر حملہ کر دیا تو انگریزوں کے کان کھڑے ہوئے اور چاہا کہ طاقت کے بل پر اس تحریک کو دبا دیں لیکن پندرہ بیس برسوں کی جدوجہد بھی ناکام ہوئی تب اس نے اپنے ترکش کا آخری تیر نکالا اور وہ تھا ایمان اور ضمیر کی خریداری کا، سوداگر سوداکرنا خوب جانتا ہے اس نے زر و دولت کے حریص لوگوں کے ضمیر کی خریداری شروع کی یہ کام انتہائی رازداری کے ساتھ ہوا اور پھر انھوں نے پالیسی بنائی کہ مجاہدین کو ہندوستان میں اتنا بدنام کر دیا جائے کہ اندرونِ ملک سے جو رسد، رقوم اور افراد ملتے ہیں وہ از خود بند ہو جائے اس کے لئے اس نے اس تحریک کا رشتہ عبدالوہاب نجدی کی تحریک سے جوڑ دیا اور انکو وہابی کہنا شروع کیا جو کبھی حجاز میں طوفان برپا کر چکے تھے اور پوری اسلامی دنیا نے ان وہابیوں کی مذمت کی تھی۔

انگریزوں نے انھیں جذبات کے پیشِ نظر سید صاحب کی تحریک کو وہابی تحریک کا نام دیا اور پھر تمام سرکاری کاغذات، رپورٹوں میں ان مجاہدینِ آزادی کو وہابی لکھنا شروع کر دیا، عدالتوں میں ان مجاہدین پر جو بغاوت کے مقدمات چلائے جاتے تھے ان کو مقدمۂ وہابیان، کے نام سے یاد کیا جاتا تھا تاکہ انکو سنگین سزاؤں کا

سزا وار ٹھہرایا جائے تو ملک میں ان کو کسی سمت سے ہمدردی نہ ملے اور انکو پھانسی کے تختہ پر بھی چڑھا دیا جائے تو پتہ نہ ہلے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں یہ پروپیگنڈہ عام ہوگیا اور پھر ہندوستان کے کچھ مسلمانوں نے بھی انگریزوں کے منہ کا چبایا ہوا یہ لقمہ چھین لیا اور وہ بھی وہی بات کہنے لگے جو اب تک مسلمانوں کا دشمن انگریز کہتا آرہا تھا، ایسی صورتِ حال میں صداقت کو پانے اور سچائی کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ اس پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈال دی جائے، سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جب سید صاحب سفرِ حج پر گئے ہیں تو کیا اس وقت حجاز میں وہابیوں کی کوئی تحریک چل رہی تھی؟ یا سرزمینِ حجاز میں اسکا کوئی اثر موجود تھا؟ تاریخ ہمیں واشگاف اور غیر مبہم لفظوں میں بتاتی ہے کہ ان میں سے کوئی بات نہیں تھی جب سید صاحب حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ پہونچے ہیں تو اس وقت سرزمینِ حجاز میں عبدالوہاب کی تحریک دفن ہوچکی تھی اور اس کا نام ونشان تک مٹ چکا تھا اب مجلسوں میں اس کا ذکر تک نہیں ہوتا تھا۔

وہابی تحریک کا پورا دور ۱۸۰۳ء سے لیکر ۱۸۱۲ء تک ہے، اسی نو برس کی مدت میں یہ تحریک پیدا ہوئی بڑھی اور اپنی موت آپ مرگئی، یہی وہ زمانہ ہے جب نجدی فاتح سعد نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پر قبضہ کرکے گنبدِ خضراء کو منہدم کرنے کا ارادہ کیا تھا، ترکی حکومت کو جب اس کا پتہ چلا تو کمانڈر علی پاشا کو اس کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دیا، اس نے ۱۸۱۲ء میں سعد کو ذلت آمیز شکست دیکر حجاز کی مقدس سرزمین سے اس کو باہر نکال دیا اور فتنہ ختم ہوگیا، دوسال بعد اس کا لڑکا عبداللہ دوبارہ حجاز پر یورش کیلئے نکلا تو ترکی فوج نے اس کو گرفتار کرکے قسطنطنیہ بھیج دیا جہاں ۱۹ دسمبر ۱۸۱۸ء کو اس کی گردن ماردی گئی، اس کے بعد عبداللہ کا لڑکا ترکوں کے خوف سے اِدھر اُدھر بھاگا پھر رہا تھا بالآخر ریاض میں گرفتار ہوکر قتل ہوا، پھر اس کے بعد سرزمینِ حجاز میں ان کا کوئی نام لیوا بھی نہیں رہا اور نہ کسی کو ان کے خیالات ونظریات کی اشاعت کی ہمت وجرأت ہی تھی کیوں کہ ایک طرف ترکی حکومت پورے حجاز پر حکمراں تھی، دوسرے وہابیوں کے طرزِ عمل سے عربوں کی نفرت اتنی

بڑھی کہ وہ عبدالوہاب نجدی کے ماننے والوں ہی سے نہیں بلکہ ان کے وطن نجد سے ہی متنفر ہو گئے۔
ایسے ماحول اور حالات میں مکہ و مدینہ ہی نہیں پوری سرزمینِ حجاز میں کسی کو وہابیوں کا نام تک لینے کی ہمت نہ تھی، ان سے ہمدردی ظاہر کرنے یا حمایت کرنے کا تو سوال ہی نہیں ہے، اس تحریک کو دفن ہوئے پندرہ سولہ سال کا زمانہ گذر چکا تھا تحریک کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا اور اس کا ذکر تک زبانوں پر نہیں تھا اس وقت ۱۸۲۵ء میں سید صاحب نے سفرِ حج کیا ہے، ان حالات میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ سید صاحب وہابی تحریک سے متأثر ہوے؟ اور اسی نہج پر کام شروع کیا یہ انگریزوں کا جھوٹا پروپیگنڈہ ہے اور کچھ نہیں۔
ایک غور طلب امر یہ ہے کہ ہم نے انگریزوں کی جن کتابوں کا ذکر کیا ہے اور جو وہابی تحریک سے متعلق ہیں یہ سب کتابیں اس وقت معرضِ تحریر میں آئی ہیں جب ہندوستان میں دو اہم ترین اور انقلاب انگیز واقعات ظہور پذیر ہو چکے تھے۔ تاریخ کے ان دونوں واقعات نے انگریزوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا، انگریزی قوم جوشِ انتقام میں پاگل ہو گئی تھی جیسا کہ مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے اپنی مشہورِ عالم کتاب " تصویر کا دوسرا رخ " میں انگریزوں کے وحشیانہ انتقام کی کارروائیوں کے سیکڑوں واقعات کا ذکر کیا ہے، ہندوستانیوں پر انگریزوں نے جو بے پناہ مظالم توڑے ہیں اور جس درندگی و بہیمیت کا مظاہرہ کیا ہے اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ اس قوم نے انسانیت کا جامہ اُتار دیا ہے۔
ان واقعات میں ایک تو ۱۸۵۷ء کا خونیں حادثہ ہے جس کو انگریز غدر کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس نے ہندوستان سے انگریزوں کے قدم اکھاڑ دیئے تھے اور انتہائی مایوسی کے بعد دہلی پر دوبارہ اپنا تسلط قائم کرنے میں وہ کامیاب ہو سکے، دوسرا واقعہ وہ ہے جسے انگریزوں نے وہابی تحریک کا نام دے کر مجاہدینِ آزادی کو بدنام کرنا چاہا ہے جس کی سرگرمیاں سرحد میں مسلسل جاری تھیں اور انکی قوت کو توڑنے کیلئے انگریزوں کو ۳۶ مہمیں بھیجنی پڑیں اور ایک لاکھ سے زائد فوجیوں کو ان پر قابو پانے کیلئے لگانا پڑا، اس کے باوجود اسکے استیصال میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے تھے، ان حالات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جوشِ انتقام، غیظ و غضب اور اندھے تعصب کے نتیجہ میں انھوں نے حق و صداقت کا کہاں تک

پاس کیا ہوگا، اور تاریخی صداقتوں کا کیا لحاظ کیا ہوگا، غصہ میں پاگل انسان اپنے مخالف پر ہر وہ الزام لگا دیتا ہے جس کا واقعاتی دنیا میں کوئی وجود بھی نہیں ہوتا ہے یہی انگریزوں نے سید صاحب اور ان کے ہم نواؤں کے ساتھ کیا۔

انگریز قوم تلوار سے زیادہ ڈپلومیسی پر بھروسہ کرتی آئی ہے، اسی ڈپلومیسی نے سوداگروں کی قوم کو ہندوستان جیسے وسیع وعریض اور زرخیز ملک پر قبضہ وتسلط دلا دیا، انگریزوں نے اس دور میں اگر صرف تلوار پر بھروسہ کیا ہوتا تو ابھی ہندی تلواروں میں اتنی کاٹ موجود تھی کہ سوداگروں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے وجود کو ہندوستان کی سرزمین سے فنا کر دیتی اور ان کی حکومت کا سورج ہندوستان کے افق پر کبھی طلوع نہ ہوتا، انگریزوں نے اہم اور انتہائی نازک موقعوں پر اور بے انتہا مجبور ہوکر تلوار استعمال کی، ان کی زیادہ توجہ ہندوستان کے مختلف طبقات میں اور ریاستوں میں تشتت وافتراق پیدا کرکے آپس میں لڑا کر کمزور کر دینے کی پالیسی پر تھی۔

الزام کا مقصد کیا تھا

انگریز دیکھ رہے تھے کہ عبدالوہاب نجدی کی تحریک عرب اور ترکی خلافت دونوں کے نزدیک انتہائی مبغوض ومذموم ہے اسی وجہ سے اپنی پوری طاقت اس تحریک کے دفن کرنے میں انھوں نے لگائی۔ ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو وہابیت کے الزام سے متہم کر دیا جائے گا اس کا عالم اسلام میں کیا حشر ہوگا؟ پوری اسلامی دنیا اس جماعت کی دشمن ہوجائے گی عام مسلمانوں میں انکی عظمت ووقعت ختم ہوجائے گی اور ان کی ہمدردیوں اور ان کے ہر طرح کے تعاون سے وہ محروم ہوجائے گی، مجاہدین کی بھرتی، رقوم کی فراہمی بند ہوجائے گی اور یہ تحریک از خود مرجائے گی۔

انگریز یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ مسلمان قوم جس کے ہاتھ سے اقتدار چھن چکا ہے، ان کی مرکزیت ختم ہوچکی ہے اور ان کی طاقت کا سرچشمہ خشک ہوچکا ہے اس کے باوجود مذہب کے نام پر دیوانوں کی طرح تلوار ہاتھ میں اٹھا لیتی ہے اور بڑی سے بڑی طاقت کو تہس نہس کرنے اور اس سے ٹکرا جانے کیلئے میدان میں آجاتی ہے، اسلئے انگریزوں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر ہندوستان پر قبضہ رکھنا ہے تو اس انگریز دشمن طبقہ کو کچل کر اس کی طاقت کو ختم کرنا انتہائی ضروری ہے۔ لیکن طاقت کے استعمال سے ردِعمل کا خطرہ وہ مول لینا نہیں چاہتے تھے، اس طبقہ کو کچل کر

اس کی طاقت کو کمزور کرنے کا راستہ ان کیلئے ایک تھا وہ یہ کہ اس گروہ کو ہندوستان کے مسلمانوں میں اس طرح اور اتنا بدنام کر دیا جائے کہ انکی مقبولیت و مرجعیت ختم ہو جائے اور اسلامی ممالک عرب ترکی افغانستان اور آزاد سرحدی علاقوں میں انہیں اتنا رسوا کر دیا جائے کہ یہ انگریز دشمن طبقہ ہندوستان کے عوام اور اسلامی ممالک کے تعاون سے یکسر محروم ہو جائے اور ان کے تعاون سے ملک میں جس خوفناک بغاوت کا ہمیشہ خدشہ لگا رہتا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے، انگریز یہ کام تلوار سے نہیں لے سکتا تھا اس لئے اس نے دوسری تدبیر اختیار کی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ کامیاب ہو گیا، وہ الفاظ و بیان کی جادوگری سے لوگوں کی ذہنیتیں بدل دیتا ہے ایک قوم کے مختلف طبقوں میں نفرت و عداوت اور اختلاف کا وہ زہر بھر دیتا ہے کہ پورا معاشرہ زہر آلود ہو جاتا ہے، اس نے ہندوستان میں یہی کیا، سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل شہید اور انکے جانشین خلفاء اور ہم نوا اسی سازش کا شکار ہو گئے۔

یہی وجہ ہے کہ انگریزی دورِ حکومت میں لکھی جانے والی ساری کتابوں میں ان مجاہدینِ آزادی کے شاندار کارناموں کو دہابیوں کی تحریک کہکر ان کی قدر و قیمت کو کم کر دیا، برطانوی حکومت نے مجاہدینِ آزادی کو عدالتی کارروائیوں میں سرکاری کاغذات میں اپنی تصنیفات میں، اخباروں اور رسالوں میں تحقیقاتی افسران نے اپنی رپورٹوں میں ہر جگہ ان کو دہابی کے نام سے موسوم کیا ہے ان کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ اس جھوٹ کو اتنی بار دُہرایا جائے کہ یہ جھوٹ سچ بن جائے اور یہ بے بنیاد افسانہ حقیقت کی شکل اختیار کرے تاکہ مسلمانوں کا یہ بانفروش طبقہ جو انگریز دشمنی میں پیش پیش ہے مسلمانوں میں بدنام ہو جائے اور عوام کا طبقہ ان سے کٹ جائے اس طرح ان کی تحریک کا جو سلسلۂ رسد ہے بند ہو جائے گا پھر یہ تحریک اپنے آپ فنا ہو جائے گی اور انگریزی اقتدار کو ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے ہندوستان میں ہمیشہ جو خطرہ لاحق رہتا ہے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا انگریز اپنی پالیسی میں کامیاب رہا اس نے ملک میں خود مسلمانوں کا ہی ایک طبقہ ایسا پیدا کر دیا جو اس انگریز دشمن طبقہ کو دہابیت کا الزام مستقل لگاتا رہا یہانتک کہ ہندوستان میں مستقل دہابی اور غیر دہابی کی تقسیم عمل میں آ گئی اور یہ صحیح ہے کہ انگریزوں نے اس طبقہ کی انگریز

دشمنی کے بارے میں جو اندازہ لگایا غلط نہیں تھا وہ اس انگریز دشمنی میں اتنے سخت تھے کہ ان کے بعض علمار کا سچا واقعہ ہے کہ اگر سوءِ اتفاق سے کسی انگریز سے ہاتھ ملانے کی مجبوری پر ہاتھ ملالیا تو اس ہاتھ کو علیحدہ کئے رہتے جیسے کوئی ناپاک چیز چھودی ہے اور جب تک اس کو دھونہیں لیتے تھے تب تک اس ہاتھ سے کوئی کام نہیں کرتے تھے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ان کا ہاتھ ناپاک نہیں ہوتا تھا، انگریزوں سے نفرت کا یہ عالم تھا، تاریخوں میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

شمعِ آزادی کے پروانے
از ۱۸۵۸ء تا ۱۹۰۰ء

مولانا احمد اللہ۔

۱۵ رجون ۱۸۶۵ء میں جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے، جزائرِ انڈمان چھوٹے چھوٹے ایک ہزار جزیروں کا مجموعہ ہے جو کلکتہ سے سات سو اسی میل دور جنوب میں واقع ہیں، پہلی بار ۱۷۸۹ء میں اس کو آباد کرنے کی کوشش کی گئی لیکن آب و ہوا انتہائی خراب ہونے کی وجہ سے سات آٹھ برس بعد ۱۷۹۶ء میں آبادی ترک کر دی گئی، غدر ۱۸۵۷ء کے ملزمان انگریزوں کی نگاہ میں اتنے بڑے مجرم سمجھے گئے کہ غدر میں پکڑے گئے لوگوں کو یا تو سرِ عام پھانسی دیدی گئی یا بہت سے لوگوں کو اسی جزیرے میں موت سے بدتر زندگی گذارنے کیلئے بھیج دیا گیا، انگریزوں نے بہت سے معزز و ممتاز مسلمانوں کو جزیرۂ انڈمان بھیجا، انھوں نے وہاں کس طرح زندگی گذاری اس کا ایک ہلکا سا اندازہ "کالا پانی" مؤلفہ مولانا جعفر احمد تھانیسری کی کتاب کے ایک اقتباس سے ہو سکتا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں:

"غدر ۱۸۵۷ء کی بدولت بیسوں راجے، مہاراجے، نواب و زمیندار، مولوی، مفتی، قاضی، منصف، صدر امین، صدر الصدور، رسالدار، صوبیدار، جمعدار وغیرہ یہاں قید ہیں، مگر یہ معزز اور شریف و رئیس خاندانوں کے افراد جن کے آگے سیکڑوں نوکر چاکر رہتے تھے بوجہ سیاہ پوست اور جنم ہند کے دوسرے چوہڑے چماروں کی طرح موٹا جھوٹا کھانا پکاتے کھاتے اور عام لوگوں کے ساتھ سخت مشقت کرتے ہیں مگر یورپین گورے بلکہ اکثر دو غلے کالے کلوٹے بھی نقط بوجہِ شرف کوٹ پتلون یا کلمۂ عیسائی

کے پلٹن کے گوروں کے برابر کھانا کپڑا پاتے تھے ایک علیحدہ بنگلیا انکے رہنے کو، ایک نوکر بلا تنخواہ خدمت کو۔ (کالا پانی ص ۳۹)

مولانا احمد اللہ صاحب مجاہدینِ آزادی میں سب سے پہلے کالے پانی بھیجے گئے ابتداءً انکو ایک کچہری میں تحریر کا کام سونپا گیا اور پانچ سال اسی کام میں گذرے لیکن وائسرائے ہند لارڈ میو کے جزیرے میں قتل ہو جانے کے بعد وہ بھی ایک مسلمان کے ہاتھ سے، اسلئے جزیرے میں تمام مسلمان قیدیوں پر انگریزوں کا غصہ اُترا اور تمام مسلمان قیدیوں پر بلا امتیاز سختیاں شروع کر دی گئیں اور اکثر مسلمان قیدیوں کو دور افتادہ خطرناک جزیروں میں بھیج دیا گیا، مولانا احمد اللہ کو وائپر آئی لینڈ اسی وجہ سے بھیجا گیا اور وہاں اسپتال کے ایک شعبے میں رکھا گیا، سرکاری کام سے فرصت کے بعد تمام وقت تلاوتِ قرآن، نماز اور ذکر و دعا میں صرف کرتے تھے، جزیرہ میں رہنے والے قیدیوں کو نصیحت فرماتے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام قیدی اور پولیس اور پلٹن کے زیادہ افراد پابندِ صوم و صلوٰۃ ہو گئے، ۱۷ برس اس جزیرے میں گذار کر ۱۲ رنومبر ۱۸۸۱ء کو رہگرائے عالم آخرت ہو گئے۔ اور سمندر کے کنارے ایک وحشتناک مقام ڈنڈاس پائنٹ میں دفن کیے گئے۔

مولانا یحییٰ علی ۔

مولانا یحییٰ علی کو انبالہ سازش کیس میں کالے پانی کی سزا ہوئی تھی۔ عدالت کے فیصلہ سنانے کے بعد مولانا موصوف کو انبالہ سے لاہور، ملتان، کراچی اور بمبئی کی جیلوں میں منتقل کرتے ہوئے ۱۱ رجنوری ۱۸۶۶ء کو جزیرۂ انڈمان بھیجا، ان کو زوس آئی لینڈ، میں رکھا گیا مولانا موصوف بھی سرکاری کام کے بعد تلاوت اور ذکر و دعا میں مصروف رہتے تھے، اور قیدیوں کو نیک کاموں کی تلقین کرتے رہتے تھے۔

کالے پانی پہونچنے کے دو سال بعد بیمار ہو گئے، بیماری شدید ہوتی گئی، حلق سے پانی اترنا بھی دشوار ہو گیا پھر بھی ذکر اللہ زبان پر جاری تھا۔ ۲۰ رفروری ۱۸۶۸ء کو جان، جانِ آفرین کو سپرد کر دی، انڈمان میں دو سال ایک ماہ اور نو دن گذارے، مولانا کی وفات کا تمام جزیروں میں اعلان کر دیا گیا، ہر جزیرے سے تجہیز و تکفین میں شرکت کے خیال سے بہت سے لوگ آئے، اندازہ کیا جاتا ہے کہ آپکے جنازہ میں چار پانچ ہزار کے قریب

مسلمان شریک ہوئے تھے، کئی مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور وہیں پردس آئی لینڈ" میں سپردِ خاک کئے گئے، مسلمانوں کے امیر، رئیس و خوشحال خاندان کے فرد، علم وفضل اور زہد و تقویٰ مثالی جہادِ آزادی اور اسلام کی سربلندی کی راہ میں طرح طرح اذیتیں برداشت کرتے ہوئے وطن سے ہزاروں میل دور ایک ویران جزیرہ میں آسودۂ خواب ہوئے۔

مولانا عبدالرحیم۔

مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی پر بھی سازش وبغاوت کا مقدمہ چلایا گیا عدالت کی طرف سے کالے پانی کی سزا ہوئی تھی، یہ مولانا احمد اللہ صاحب اور مولانا یحییٰ علی کے بعد انڈمان پہونچے، اُن کو گھاٹ پر محرری کی جگہ دی گئی، جس کی تنخواہ چھ روپے ماہوار تھی۔ سید انشار اللہ خان باندوی جو غدر ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے انڈمان بھیجے گئے تھے وہ بہت ضعیف اور کمزور ہو گئے تھے مولانا عبدالرحیم ان کی ہر طرح کی مدد کرتے رہتے تھے، تین سال گھاٹ پر رکھنے کے بعد کمشریٹ کے محکمے میں منتقل کر دیا گیا، لارڈ میو کے قتل کے بعد معزز مسلمان قیدی ہدفِ عتاب بنے تو مولانا موصوف کو بھی مرکز سے ہٹا کر ایک دور افتادہ جزیرے میں بھیج دیا گیا جس انگریز افسر کے ماتحت آپ کو لگایا گیا تھا وہ حد درجہ بد دماغ اور درشت مزاج تھا لیکن مولانا پر دینداری کا غلبہ تھا اسلئے سرکاری ڈیوٹی کو بھی پوری دیانتداری سے انجام دیتے تھے اس دیانتداری نے اس بد دماغ انگریز کے دماغ میں بھی ایک نرم گوشہ پیدا کر دیا، اتفاق سے اس کے جسم پر کالے کالے داغ پڑ گئے اگرچہ وہ خود ڈاکٹر تھا لیکن خود اپنی بیماری کا کوئی علاج اس کے پاس نہیں تھا اس کے خانساماں نے بتایا کہ مولانا کے پاس اس کی دوا ہے، انگریز نے مولانا سے کہا کہ آپ وہ دوا مجھے تیار کر دیں، آپنے وہ دوا تیار کر کے دیدی، اس دوا سے اس کے تمام داغ صاف ہو گئے اس کے بعد وہ مولانا پر بہت مہربان ہو گیا بلکہ اس نے اس دوا کو سرکاری اسپتال میں رکھنے کی اجازت مانگی مگر حکام نے اس کی اجازت اسلئے نہیں دی کہ اس طرح ایک قیدی کا اعزاز وقت کے تمام ڈاکٹروں پر فائق ہو جاتا۔

لارڈ لارنس گورنر جنرل نے مولانا کی اپیل پر حبسِ دوام کا حکم منسوخ کر دیا تھا اور

تا صدورِ حکمِ ثانی انڈمان میں رکھے جانے کا فیصلہ صادر کیا تھا، مولانا کی اہلیہ کی طرف سے لارڈ رپن کے پاس رہائی کی درخواست پیش ہوئی اور اس نے درخواست کو منظور کر لیا چنانچہ مولانا عبدالرحیم ۱۰ر مارچ ۱۸۸۳ء کو سوا اُنیس سال جزیرۂ انڈمان میں گذار کر رہا ہوئے اور اپنے وطن آئے، ان کا خاندانی مکان منہدم کر کے میونسپلٹی کے حوالے کیا جا چکا تھا اور اس پر بازار اور میونسپل بورڈ کی عمارت بن گئی تھی، اہل وعیال موضع نمو ہبیہ میں مقیم تھے پٹنہ پہونچنے کے بعد اپنے مکان کی جگہ پہونچے تو انقلابِ زمانہ کا نقشہ نگاہوں میں پھر گیا اور وہاں کھڑے ہو کر انتہائی درد کے ساتھ عربی کے چند اشعار پڑھے اس کے دو شعر یہ تھے ؎

يَا مَنْزِلاً لَعِبَ الزَّمَانُ بِأَهْلِهِ ۔ فَأَبَادَهُمْ بِتَفَرُّقٍ لَا يَجْمَعُ
ذَهَبَ الَّذِيْنَ يُعَاشُ فِي أَكْنَافِهِمْ ۔ بَقِيَ الَّذِيْنَ حَيَاتُهُمْ لَا تَنْفَعُ

مولانا موصوف کا بیان ہے کہ یہ انقلابِ زمانہ دیکھکر دل درد سے بھر آیا، دل میں یہ حسرت بیدار ہوئی کہ کاش میں بھی اسی جزیرے میں پیوندِ زمین ہو جاتا تو یہ روزِ حشر اپنے دونوں ساتھیوں مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی کے ساتھ محشور ہوتا۔

عظیم آباد پہونچنے پر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پابندی عائد کر دی تھی کہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو کچہری میں حاضری لکھوایا کریں اور بلا اجازت شہر سے باہر نہ جائیں، اگر سرکاری اجازت کے بعد جائیں تو جائے قیام سے قریب ترین پولیس چوکی یا تھانے میں اپنی آمد کی اطلاع درج کرائیں ہندوستان آنے کے بعد سات برس تک یہ پابندی عائد رہی، اسکے بعد بیرونِ ملک سفر کرنے پر پابندی قائم باقی رہی، مولانا ابوالکلام آزاد مولانا موصوف سے پٹنہ میں ملے تھے عمر تقریباً نوّے سال کی ہو چکی تھی ۲۴ر اگست ۱۹۲۳ء کو قبلِ مغرب اس دارِ فانی کو چھوڑ کر دارِ بقا کی طرف کوچ کر گئے رحمہ اللہ۔

مولانا محمد جعفر تھانیسری۔

"انبالہ سازش کیس" کے بڑے ملزمان میں آپ کا شمار تھا، تھانیسر میں بڑی خوشحالی کی زندگی گذار رہے تھے، بہت بڑی جائداد اپنی محنت سے پیدا کر لی تھی، جماعتِ مجاہدین میں انکا بڑا اعزاز تھا، رقوم اور مجاہدین انھیں کے ذریعہ سرحد بھیجے جاتے تھے غدر ۱۸۵۷ء میں قومی

وطنی جذبات کے تحت دس بارہ آدمیوں کو لے کر دہلی گئے تھے تاکہ انگریزوں سے جنگ میں براہِ راست شرکت کریں لیکن جب دہلی پہونچے تو وہ چمن ہی لٹ چکا تھا جس میں بہار آنے کو تھی دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا، آپ خاموشی سے واپس آکر اپنے کاموں میں لگ گئے۔

انبالہ سازش کیس میں پہلے پھانسی کی سزا تجویز ہوئی اور بعد میں پھانسی کی سزا کو "عبورِ دریائے شور" اور حبسِ دوام میں بدل دیا گیا اور آپ کو کالے پانی بھیج دیا گیا آپ نے جزیرۂ انڈمان کی زندگی پر بہت مفصل آپ بیتی "کالا پانی" کے نام سے لکھی ہے، جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مجاہدینِ آزادی نے کتنی عبرتناک اور اذیت بھری زندگی گذاری ہے اور کیسی کیسی ان پر قیامتیں ٹوٹی ہیں اس کے باوجود ان کے دماغ سے آزادی کا نشہ نہیں اترا اور یہ صبر واستقامت کے پیکر بنے رہے۔

مولانا محمد جعفر ۱۱ر جنوری ۱۸۶۶ء کو مولانا یحییٰ علی اور میاں عبدالغفار کے ہمراہ جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے، انڈمان میں چیف کمشنر کی کچہری میں محرر سکشن دار میر منشی بنا دیا گیا اور ایک گھر رہنے کو اور ایک نوکر خدمت کیلئے مل گیا، جہاں چاہتے جاتے آتے، جزیرے میں ان پر کوئی پابندی نہیں تھی، کوشش کی کہ بیوی کو بھی جزیرے میں بلالیں لیکن یہ کوشش رائیگاں گئی توجزیرے میں ایک کشمیری خاتون سے نکاح کر لیا ۳۰ر اپریل ۱۸۸۱ء میں یہ بیوی فوت ہوگئی تو دوسری شادی الموڑہ کی ایک خاتون سے کی، اس سے آٹھ بچے پیدا ہوئے، لارڈ میو کے قتل کے بعد انھیں بھی مرکز سے ہٹا کر دوسرے جزیرے میں بھیج دیا گیا، انھوں نے رہائی کی کئی بار کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہوسکے، ان کا بیان ہے کہ ۱۸۸۱ء میں دل میں بطورِ الہامِ غیبی یہ خیال آیا کہ رہائی ہونے والی ہے چنانچہ ۳۰ر دسمبر ۱۸۸۲ء کو رہائی کا حکم آگیا، ۲۲ر جنوری ۱۸۸۳ء کو یہ حکم انڈمان پہونچا، پھر وہ انڈمان والی بیوی کی رہائی کے انتظار میں رُکے رہے، اس اثنا میں اپنا سارا سامان فروخت کیا، مکان کو وقف کر کے مسجد بنانا چاہتے تھے لیکن ڈپٹی کمشنر نے منظور نہیں کیا ۹ر نومبر ۱۸۸۳ء کو ۱۷ سال دس مہینے کے بعد انڈمان سے روانہ ہوئے ۱۳ر نومبر ۱۸۸۳ء کو کلکتہ پہونچے پھر الہ آباد، کانپور، علی گڈھ، سہارنپور ہوتے ہوئے ۲۱ر نومبر ۱۸۸۳ء کو رات کے ۹ بجے انبالہ چھاؤنی اسٹیشن پر پہونچ گئے ۱۲ر دسمبر ۱۸۶۳ء کو تھانیسر سے فرار

ہوئے تھے کچھ کم بیس سال کے بعد دوبارہ وطن میں آزادی کی زندگی نصیب ہوئی، وطن آنے پر ان کا ایک انگریز شاگرد کپتان ٹمپل چھاؤنی میں ڈپٹی کمشنر تھا، اس نے آپ کے لئے اپنے پاس قیام کا بندوبست کر دیا اور بیس روپے ماہوار ان کی تنخواہ مقرر کر دی، بعض دوسرے لوگوں کو ٹیوشن کرنے سے تیس روپے مزید مل جاتے تھے، ہر طرح کی پابندی سے آزاد تھے، لیکن ٹمپل کے چلے جانے کے بعد آپ پر پابندیاں عائد کر دی گئیں فروری ۱۸۸۸ء میں یہ پابندیاں اٹھائی گئیں، مسلمان مولانا جعفر کا بڑا احترام کرتے تھے، مولانا عبدالحی رائے بریلوی نے ہندوستان کی اہم ترین شخصیتوں سے ملنے کیلئے جو سفر کیا تھا اس میں انبالہ میں مولانا محمد جعفر سے بھی ملنے گئے تھے، اتفاق سے ملاقات نہ ہوسکی، غالباً ۱۹۰۵ء میں وفات پائی انھیں کے لڑکے مولوی محمد اسمٰعیل وکیل تھے جو ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں شہید ہوئے۔

میاں عبدالغفار۔

میاں عبدالغفار عظیم آبادی بھی انبالہ سازش کیس کے ملزمان میں تھے، تمام ملزمان کے ساتھ آپ کو بھی حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا دی گئی تھی، مولانا یحییٰ علی اور مولانا محمد جعفر تھانیسری کے ساتھ ۱۱ر جنوری ۱۸۶۶ء کو انڈمان پہونچے، مارچ ۱۸۷۲ء میں انھوں نے درخواست دیکر اپنی اہلیہ اور دو لڑکوں کو اپنے پاس بلالیا تھا، ایک لمبی مدت کالے پانی میں گذار کر رہائی کے بعد وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ عظیم آباد واپس آئے اور ۱۹۱۴ء کے آس پاس وفات پائی۔

مولوی امیرالدین۔

انھیں مالدہ کے مقدمۂ بغاوت میں حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور اور ضبطیِ جائداد کی سزا ہوئی تھی، مارچ ۱۸۷۲ء میں انڈمان پہونچے، اس وقت جزیرے میں نیا قانون جاری ہوچکا تھا ان میں قیدیوں کیلئے وہ رعایتیں باقی نہ رہی تھیں جن سے پہلے قیدی مستفید ہوتے تھے اسلئے مولوی صاحب کو ایک مدت تک سخت مشقت کرنی پڑی، بہت بعد میں وہ ایک مدرسہ میں مدرس بنائے گئے ۳ر مارچ ۱۸۸۳ء کو مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی اور میاں عبدالغفار کے ساتھ رہائی نصیب ہوئی اور آپ ہندوستان واپس آئے اور اپنے وطن پہونچے۔

مولوی تبارک علی ۔

انھیں عظیم آباد کے دوسرے مقدمہ بغاوت میں حبسِ دوام اور ضبطیِ جائداد کی سزا دی گئی تھی ان کے والد مولوی مبارک علی انگریزی قید ہی میں فوت ہو چکے تھے، مولوی تبارک علی کو کالے پانی بھیجا گیا، جزیرۂ انڈمان میں پہونچنے کے بعد ابتدأً سخت مشقت کرنی پڑی بعد میں سیشن محرر مقرر ہوئے اور پھر رہا ہو کر ۲ مارچ ۱۸۸۳ء کو انڈمان سے وطن آئے ۔

میاں مسعود گل ۔

یہ ضلع بوگرا بنگال کے رہنے والے تھے ۱۸۶۰ء میں گرفتار ہوئے اور کالے پانی کی سزا ہوئی اور انڈمان بھیجے گئے۔ بعد میں ۲۰ اپریل ۱۸۸۳ء کو انڈمان سے رہائی نصیب ہوئی اور وہاں سے اپنے وطن واپس آئے ۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی

مشہور محدث شاہ محمد اسحاق دہلوی کے شاگردوں میں تھے، منصفی کے عہدے پر فائز تھے فیصلے بھی لکھتے تھے اور موقعہ نکال کر وہیں طلبہ کو پڑھاتے بھی تھے، آپ پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا کالے پانی کی سزا ہوئی اور جزیرۂ انڈمان بھیج دیا گیا ایک انگریز کی فرمائش پر مفتی صاحب موصوف نے مشہور عربی کتاب تقویم البلدان کا ترجمہ کیا، یہی ترجمہ مفتی صاحب کی رہائی کا باعث ہوا۔ کئی سال سزا کے گذار کر اس انگریز کی خصوصی دلچسپی لینے کی وجہ سے آپ کو رہائی ملی اور ہندوستان واپس آئے صرف کی مشہور کتاب علم الصیغہ جو مدارس کے درسِ نظامیہ میں شامل ہے وہیں جزیرۂ انڈمان میں لکھی تھی ۔

مفتی صدرالدین خاں آزردہ ۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد گرفتار ہوئے اور جیل گئے، آپ نے حدیث مشہور محدث حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی محدث سے پڑھی تھی حکومت میں ایک بڑے عہدے پر تھے، امام المعقول مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے ہم سبق رہے، مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے فتویٔ جہاد پر انھوں نے بھی دستخط کئے تھے، دستخط کے ساتھ لفظ بالجبر بھی لکھ دیا تھا، مفتی صاحب جب بغاوت پھیلانے کے الزام میں گرفتار ہوئے اور مقدمہ پیش ہوا تو انھوں نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ میں نے

فتویٰ پر بخوشی دستخط نہیں کئے ہیں بلکہ مجھ سے زبردستی دستخط لئے گئے ہیں اسی لئے میں نے اپنے دستخط کے ساتھ بالجبر لکھ دیا ہے فتویٰ عدالت میں پیش کیا گیا تو مفتی صاحب کے بیان کی تصدیق ہو گئی، کئی مہینے جیل میں رہے پھر چھوڑ دیئے گئے صرف جاں بخشی کی گئی دوسری سزائیں بحال رہیں، نوکری موقوف، ساری جائداد ضبط، برسوں کی تگ و دو کے بعد نصف جائداد کی واپسی کا حکم ہوا جس سے تیس چالیس روپے ماہوار کی یافت تھی بڑی عسرت سے زندگی بسر کی، سرسید احمد خاں مولانا فیض الحسن سہارنپوری مشہور ادیب اور مولانا ذوالفقار علی دیوبندی وغیرہ آپ کے تلامذہ میں ہیں عسرت اور تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے ہوئے ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ دسمبر ۱۸۶۷ء کو راہی ملکِ بقا ہوئے، درگاہ حضرت چراغ دہلی میں دفن ہوئے۔

سید اکبر زماں اکبر آبادی۔

انگریزوں نے ان کو بھی باغی قرار دیا، مقدمہ چلا، کالے پانی کی سزا ہوئی اور جزیرۂ انڈمان بھیج دیئے گئے، بیس برس انڈمان میں رہے چونکہ یہ سرحد کے مجاہدینِ آزادی سے بہت پہلے کالے پانی بھیجے گئے تھے اسلئے بعد میں کالے پانی پہونچنے والے مجاہدینِ آزادی کیلئے وہ بہت بڑے معاون ثابت ہوئے، ابتدا ءً انکو پانچ روپیہ ماہوار کی نوکری دی گئی تھی بعد میں ستّر روپے ماہوار ملنے لگے تھے اس لئے بہت خوشحال ہو گئے تھے انھوں نے مولانا محمد جعفر تھانیسری مولانا یحییٰ علی اور دوسرے مجاہدینِ آزادی کی بڑی خدمت کی اور ہر طرح کے معاملات میں ان کے مددگار رہے، بیس سال کے بعد ان کو رہائی کا حکم ہوا، اپنے وطن آگرہ آئے اور ٹیوشن پر زندگی گذارتے رہے آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے ۱۹۰۴ء میں انتقال کیا آگرہ میں دفن ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہی۔

مشہور محدث و مرشد استاذ الاساتذہ مولانا رشید احمد گنگوہی مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہم سبق دارالعلوم دیوبند کے سرپرست، شیخ الہند اور شیخ الاسلام کے شیخ و مرشد تھے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد باغی قرار دیئے گئے، محبوب علی خاں نے مخبری کی۔ گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا مولانا رام پور چلے گئے چند دنوں کے بعد گارڈن کرنیل فرانسیسی مخبر کو لیکر ستّر سواروں کے

ساتھ گنگوہ پہونچا مولانا کے ماموں زاد بھائی جو مولانا کے ہم شکل تھے مسجد میں مراقب تھے پولیس نے ان کو مولانا رشید احمد سمجھا، گردن پر زور سے ہاتھ مار کر انکو اٹھایا اور کہا کہ گھر کی تلاشی دلاؤ کیونکہ ہتھیار گھر میں ہیں۔ ابو النصر مار کھاتے رہے اور ذلت سہتے رہے مگر یہ نہیں بتایا کہ میں کون ہوں اور مولانا کہاں ہیں۔ بعد میں پولیس کو اندازہ ہو کہ ملزم نہیں ہے پھر پولیس رام پور پہونچی۔ مولانا گرفتار ہوئے اور سہانپور جیل میں رکھے گئے۔ کچھ دنوں کال کوٹھری میں بھی رکھے گئے، پھر مظفر نگر جیل میں منتقل کر دیئے گئے۔ چھ ماہ آپ کو جیل میں رکھا گیا اور مقدمہ چلتا رہا، ثبوت و شہادت نہ مل سکی اسلئے ۶ ماہ کے بعد رہا کئے گئے۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا اور گنگوہ کی سرزمین میں آسودۂ خواب ہوئے۔

مولانا فضلِ حق خیر آبادی۔

منطق و فلسفہ کے امام تھے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا تھا اور ان سے جہاد کو فرض کہا تھا اس جرم میں ۱۸۵۹ء میں سیتا پور سے گرفتار کر کے لکھنؤ لائے گئے مقدمہ چلا، سرکاری وکیل کے مقابل مولانا خود بحث کرتے تھے، جج مولانا کی عظمت اور تبحرِ علمی سے واقف تھا وہ کسی وجہ سے چاہتا تھا کہ مولانا کو رہا کر دیا جائے لیکن بحث کے تیسرے دن مولانا نے عدالت سے کہا کہ جس مخبر نے فتویٰ کی خبر دی اب میں اس کی توثیق کرتا ہوں اس گواہ نے سچ رپورٹ لکھوائی تھی اب عدالت میں میری صورت سے مرعوب ہو کر جھوٹ بولا ہے، میں اقرار کرتا ہوں کہ فتویٰ میرا لکھا ہوا ہے اور میرے ہی مشورے سے علماء نے دستخط کئے ہیں، مجھے خدا کے حضور جانا ہے، غلط بات مذہب کے معاملہ میں میں نہیں بول سکتا ہوں ـــــــ اس اقرار کے بعد اس کے سوا اور کوئی دوسری سزا ہو ہی نہیں سکتی کہ مولانا کو حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور کی سزا دیجائے، چنانچہ عدالت نے فیصلہ سنا دیا مولانا نے بڑی خوشی سے فیصلہ سنا اور منظور کیا اور پھر مولانا کو انڈمان روانہ کر دیا گیا۔

انڈمان میں مولانا کو خدمت بہت ذلیل سپرد کی گئی، آپکے ذمہ قیدیوں کی بارکوں کی صفائی تھی۔ کہاں ہندوستان کا علامۂ زماں، اور علمی دنیا میں بے تاج کا بادشاہ اور کہاں کوڑا کرکٹ کی ٹوکری؟ مولانا جس جیل میں تھے اس کا سپرنٹنڈنٹ ایک انگریز تھا

اس نے فنِ ہیئت میں ایک کتاب فارسی زبان میں لکھی تھی ایک قیدی جو مولوی تھے انگریز نے انکو دی کہ اس کی تصحیح کر دیں لیکن یہ انکے بس کی بات نہیں تھی، مولوی صاحب نے سپر نٹنڈنٹ سے کتاب لی اور سیدھے مولانا فضلِ حق کی خدمت میں پہونچے، مولانا نے ایک ہفتہ میں کتاب کو درست کر کے مفید اضافے کئے اور اس پر جگہ جگہ حاشیہ بھی لکھا، مولوی صاحب جو کتاب لیکر آئے تھے ان کے ذریعے سپر نٹنڈنٹ جیل کو بھیج دی، اس نے سمجھا مولوی صاحب نے یہ کام کیا ہے ان کی خوب تعریف کی تو مولوی صاحب نے کہا کہ حضور یہ میرا کارنامہ نہیں ہے بلکہ مولانا فضلِ حق کا ہے جو فتویٰ جہاد کے سلسلہ میں یہاں آئے ہیں اسی وقت سپر نٹنڈنٹ مولوی صاحب کو لے کر مولانا کے ٹھکانے پر آیا، علامہ نہیں تھے وہ انتظار کرتا رہا دیکھا کہ ایک شخص ٹوکرا بغل میں دبائے چلا آرہا ہے، مولوی صاحب نے کہا یہی مولانا فضلِ حق ہیں، یہ منظر دیکھ کر انگریز کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور مولانا سے معذرت کر کے اپنی پیشی میں لے لیا۔

علامہ کے صاحبزادے نے ولایت میں اپیل کر رکھی تھی اور افسرانِ بالا سے تعلق رکھنے والوں نے سفارشیں کی تھیں جسکے نتیجہ میں مولانا کی رہائی کا پروانہ آگیا، صاحبزادے مولوی شمس الحق رہائی کا پروانہ لیکر انڈمان گئے تاکہ والد صاحب کو اپنے ساتھ لائیں، جب جہاز سے جزیرے میں اترے اور شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر آیا، جنازہ کے ساتھ ہزاروں آدمیوں کی بھیڑ چل رہی ہے، اعلیٰ حکام جنازہ کے ساتھ چل رہے ہیں مولوی شمس الحق نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ مولانا فضل حق خیر آبادی کا جنازہ ہے کل ۱۲ر صفر ۱۲۷۸ھ (اکتوبر ۱۸۶۱ء) کو انتقال ہوا ہے اب پیوندِ خاک کرنے کیلئے جنازہ جا رہا ہے، مولوی شمس الحق اپنے ہاتھوں باپ کو جزیرہ میں دفن کر کے تنہا وطن واپس لوٹ آئے۔

قاضی عنایت خان۔

آپ تھانہ بھون کے رئیسوں میں سے تھے انگریزوں کے خلاف بغاوت میں مردانہ وار حصہ لیا، ان کے علاقے سے انگریزی فوج کے کچھ افراد کارتوس کی بہنگیاں لے کر جا رہے تھے آپ نے کچھ جوانوں کو لے کر سارے کارتوس لوٹ لئے پھر تحصیل شاملی پر حملہ کر کے اس کو بھی لوٹا پولیس برسوں انکی تلاش میں رہی، آپ تھانہ بھون سے نجیب آباد چلے گئے سرکاری فوج نے

تھانہ بھون کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور قصبہ کو کھنڈر بنا دیا مگر قاضی صاحب کو گرفتار نہ کرسکی پوری زندگی روپوشی میں بسر کی اور انگریز انتقام کی پیاس نہ بجھا سکے۔

مرزا عاشور بیگ۔

یہ بھی انگریزوں کے باغیوں میں سے تھے، بہت سے انگریزوں کو دست بدست جنگ میں قتل کیا ۱۸۵۷ء میں وہ اپنے لڑکے اور خاندان کی مستورات اور بچوں کو لے کر کسی پناہ کی تلاش میں جا رہے تھے کہ سر تھا فلس مٹکاف ایک دستہ فوج کے ساتھ سامنے آگیا، اس نے باپ بیٹے اور دوسرے افراد کو رسیوں سے بندھوا کر ایک صف میں کھڑا کر دیا اور فوج کو فائر کا حکم دیدیا، انگریزی بندوقوں سے ایک ساتھ کئی گولیاں نکلیں اور سینوں کو پار کر گئیں، ذبح کئے ہوئے مرغ کی طرح پورا خاندان رسیوں میں بندھا ہوا تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ مرزا عاشور بیگ حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی سے بیعت تھے، بعد میں ان کی لاش حاصل کرکے دہلی کے محلہ کشن گنج میں دفن کی گئی۔

نواب مصطفےٰ خان شیفتہ۔

شیفتہ بھی انگریزوں کے باغیوں میں شمار کئے گئے، شہرت ان کو شاعری میں ملی حالانکہ عالم فاضل تھے حدیث و قرأت کی تعلیم آپ نے مولانا نور محمد دہلوی، شیخ عبداللہ سراج حنفی مکی اور شیخ محمد عابد سندھی مقیم مدینہ سے حاصل کی تھی، اسکے علاوہ مولانا کریم اللہ محدث سے بھی بعض علوم پڑھے، غرضیکہ آپ تمام رسمی علوم و فنونِ متداولہ سے واقف تھے، ذہن و مزاج دینداری کا تھا، سنن و نوافل کی بھی حتی الامکان پابندی کرتے تھے رئیسِ کبیر تھے، جب آپ میرٹھ جیل میں تھے تو اپنے ایک شناسا انگریز کلکٹر کو اطلاع دیکر بلوایا اس نے فجر کے وقت آنے کیلئے کہا، جب وہ آیا تو فجر کی سنتوں سے فارغ ہو کر فرض کی نیت باندھ رہے تھے کہ ان کو اطلاع دی گئی کہ مسٹر ٹرمیل کلکٹر باہر موجود ہیں، آپ نے فرض کی نیت باندھ لی اور سورۂ دھر پڑھی باطمینان نماز سے فارغ ہوئے تو انگریز کلکٹر انتظار کرتے کرتے واپس جا چکا تھا حالانکہ وہ آپ کی رہائی کی سبیل پیدا کرنے کیلئے آیا تھا لیکن انھوں نے اس کی پروا نہیں کی آپکے دوسرے ساتھیوں کو یا حبسِ دوام ہوا یا پھانسی مگر آپ کو جیل میں ڈال دیا گیا، سات برس قیدِ فرنگ میں

گذارے اس کے بعد بعض اہم شخصیتوں کی مداخلت اور سفارش سے جیل سے باہر آئے، دہلی کا قیام چھوڑ دیا اپنی جاگیر پر رہنے لگے ۶۳ سال کی عمر میں ۱۸۶۹ء میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے اور حضرت محبوب الٰہی کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔

سید کرم علی۔

سید کرم علی اکبر آبادی بھی انگریزوں کے باغیوں میں سے تھے، گرفتار ہوئے ان پر باغیوں کی امداد کا الزام تھا اور خود بھی بغاوت میں حصہ لیا اور انگریزوں کو لوٹ کر جو مال و متاع ملا تھا ان کے گھر سے برآمد ہوا، گرفتاری کے بعد ان کے محلہ قاضی پاڑہ کے سارے مکانات کو بنیاد سے کھدوا کر پھنکوا دیا گیا اور اس کا نام و نشان مٹا دیا گیا اور سید کرم علی کو جیل میں ڈالدیا گیا، بغاوت کا مقدمہ چلا، موت کی سزا ہوئی، آگرہ جیل میں ان کو پھانسی دی گئی، ان کی قبر آگرہ فورٹ کے پل پر ریلوے سڑک کے پہلو میں ہے اور مرجعِ خلائق ہے۔

سید گلزار علی امروہوی۔

انگریزوں کے دشمنوں میں آپ کا بھی شمار تھا، بغاوت میں بھرپور حصہ لیا، باغیوں نے جب مراد آباد کا جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو آزاد کیا تو یہ ان کو لیکر امروہہ چلے گئے مسٹر ولسن اسپیشل کمشنر مراد آباد تحقیقات کے سلسلہ میں امروہہ آیا تو درویش علی خان اور شیخ محمد افضل صدیقی کو لے گیا ان پر بغاوت کا مقدمہ چلا دونوں کو حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور مع ضبطیِ جائیداد کی سزا ہوئی اور وہ انڈمان روانہ کر دیے گئے۔ بعض دوسرے معزز مسلمان بھی باغی قرار دیے گئے اور ان کو مراد آباد میں پھانسی دی گئی، مگر سید گلزار علی گرفتار نہ ہو سکے، مدت العمر روپوش رہے، بریلی کے دیہاتوں میں اور گمنام جگہوں میں جلاوطنی اور پریشان حالی کی زندگی گذاری انھیں روپوشی کے ایام میں راہیِ ملکِ بقا ہو گئے اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی۔

ڈاکٹر وزیر خاں بہار کے رہنے والے تھے مگر آگرہ کو اپنا وطنِ ثانی بنا لیا تھا اور یہیں کے ایک محلہ تاج گنج میں رہتے تھے، بغاوت میں حصہ لیا تھا، زخمی مجاہدین کی خبر گیری آپکی ذمہ داری تھی، جب انگریزی حکومت کی طرف سے دار و گیر شروع ہوئی تو مکہ مکرمہ ہجرت

کر گئے، مشہور عیسائی مناظر پادری فنڈر کو میدانِ مناظرہ میں شکست دینے میں آپ کا زبردست ہاتھ تھا انگریز اسی وقت سے انکو نشانہ بنائے ہوئے تھے مگر گرفتار نہ کر سکے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد بہانہ ہاتھ آیا تو ڈاکٹر صاحب مکہ جا چکے تھے، انگریزوں نے ترکی حکومت کو لکھا کہ ہمارا باغی آپ کی حکومت میں ہے، آپ اس کو گرفتار کر کے بھیج دیجئے، ترکی خلیفہ نے شریفِ مکہ کو لکھا، اس نے ڈاکٹر صاحب کو بلا کر گفتگو کی، اس نے بتایا کہ آپکی گرفتاری کا حکم آیا ہے تو آپنے کہا کہ میں حرم میں ہوں اور حرم سے کسی مسلمان کو گرفتار کر کے عیسائیوں کے حوالے کرنا جائز نہیں ہے اور کہا کہ فلاں بدو سردار سے بھی بات کر لیجئے، ڈاکٹر صاحب اس کی لاعلاج بیوی کا علاج کر چکے تھے وہ صحت مند ہو گئی تو سردار ڈاکٹر صاحب کا گرویدہ ہو گیا تھا اور جب شریفِ مکہ نے اس بدو سردار سے ڈاکٹر صاحب کی گرفتاری کا تذکرہ کیا تو اس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کی گرفتاری اسی وقت ممکن ہوگی جب میرے قبائل کے بیس ہزار جوانوں میں سے ایک ایک کٹ کر مر جائے گا اس کے پہلے ممکن نہیں، یہ سن کر شریفِ مکہ نے خلیفہ کو لکھ دیا کہ صورتِ حال یہ ہے، خلیفہ نے انگریزوں کو صاف جواب دیدیا کہ حرم سے کسی مسلمان کو گرفتار کر کے کسی کافر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا، اس طرح ڈاکٹر صاحب انگریزوں کے شر سے محفوظ رہے، ڈاکٹر صاحب ۱۸۷۲ء کے لگ بھگ راہیِ ملکِ بقا ہوئے اور جنۃ البقیع میں آسودۂ خواب ہیں۔

مُنیر شکوہ آبادی۔

مُنیر شکوہ آبادی بھی انگریزوں کے باغیوں میں سے تھے، ان کو گرفتار کر کے ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا، عدالت نے کالے پانی کی سزا دی اور جزیرۂ انڈمان بھیج دیئے گئے جزیرۂ انڈمان میں آٹھ برس گذارنے کے بعد ایک معزز شخصیت کی سفارش پر رہائی کا حکم ہوا، آزاد ہو کر ہندوستان واپس آئے اور رام پور میں قیام کیا اور یہیں ۱۲۹۷ھ ۱۸۷۹ء میں انتقال کیا اور اسی سرزمین میں مدفون ہوئے۔

مرزا ولایت حسین۔

مرزا ولایت حسین مُنیر شکوہ آبادی کے ساتھیوں میں سے تھے، مرزا صاحب بھی

گرفتار ہوئے اور ان پر بھی بغاوت کا مقدمہ چلا، حسبِ معمول انگریزی عدالت نے جبسِ دوام بعبورِ دریائے شور کی سزا سنا دی اور کالے پانی بھیج دیئے گئے، وطن کا منہ دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہوا پوری زندگی اسی جزیرے میں گذار کر ربِ حقیقی سے جا ملے، وہیں کے زمین میں آسودۂ خواب ہیں۔

نواب تفضل حسین خان۔

بڑے رئیسِ کبیر تھے، اس کے ساتھ علم و فضل میں بھی کمال تھا، انگریزوں کے باغیوں میں سے تھے ۱۸۵۹ء میں گرفتار ہوئے، ان پر بغاوت اور قتل کا مقدمہ چلایا گیا، میجر بیزور انگریز نے گرفتاری کے وقت وعدہ کیا تھا کہ اگر آپ نے کسی یوروپین کو قتل نہیں کیا ہوگا تو جاں بخشی کیجائے گی، اتفاق سے وہی اسپیشل کمشنر مقرر ہوا اور باغیوں کے مقدمات کی سماعت اسکے سپرد ہوئی، اسی کی عدالت میں نواب تفضل حسین خاں کا بھی مقدمہ پیش ہوا اور فردِ جرم قائم کر کے پھانسی کا حکم سنا دیا، اس کو وعدہ یاد دلایا گیا تو سنی ان سنی کر دی، نواب صاحب کی طرف سے گورنر جنرل کے یہاں اپیل کی گئی، گورنر جنرل نے سزائے موت ختم کر دی اور حکم دیا کہ نواب صاحب برطانیہ کے علاقے سے خارج البلد ہو جائیں، اور اگر کبھی بھی لوٹ کر آئے تو پھانسی کی سزا بحال رہے گی ۱۸۵۹ء میں نواب صاحب کو جہاز میں بٹھا کر عدن روانہ کر دیا گیا، وہاں سے آپ حجاز چلے گئے، مکہ میں قیام کیا، کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں تھا فاقہ کشی کی زندگی گذارتے تھے، نواب صدیق حسن خاں (بھوپالی) ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں حج کے لئے گئے تو نواب صاحب کو دیکھا کہ مکہ کے فقرا کی صف میں کھڑے ہیں، مکہ کے غربا میں ان کا شمار تھا، اسی تنگدستی، معاشی تنگی اور نیم فاقہ کی زندگی گذارتے ہوئے ۱۸۸۴ء میں مکہ معظمہ میں انتقال کیا وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

نواب سخاوت حسین۔

یہ نواب تفضل حسین خاں کے بھائی تھے، ان کو بھی گرفتار کر کے ان پر بھی قتل و بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا، عدالت نے انکو پھانسی کی سزا دی اور تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا۔

نیاز محمد خاں۔

یہ باغیوں کے قائد تھے اور بڑی بہادری کے ساتھ انگریزی فوجوں سے لڑے، برگیڈیر ہوپ گرانٹ کی فوج نے ان پر حملہ کر دیا ان کے ساتھ تین ہزار آدمی تھے مگر پسپا ہوئے نیاز محمد خاں کو فرار ہونا پڑا، مکہ معظمہ چلے گئے، ۱۸۷۲ء میں آکر نواب جوناگڈھ کے یہاں ملازمت کر لی اسی سلسلہ میں بمبئی آئے ہوئے تھے جہاں گورنر جنرل کا قیام تھا، یہ پہچان لئے گئے اور گرفتار ہوئے، وارنٹ پہلے سے تھا، مقدمہ چلا بغاوت کا جرم ثابت ہوا، سزائے موت کا فیصلہ سنایا گیا، ہائیکورٹ میں اپیل کی گئی وہاں سے سزائے موت ختم کر کے حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا ملی، انڈمان بھیجے گئے اور وہیں پیوندِ خاک ہیں۔

مولانا امام بخش صہبائی۔

عالم فاضل آدمی تھے مولانا فضلِ حق خیرآبادی مفتی صدرالدین خاں آزردہ وغیرہ آپ کے ساتھیوں میں سے ہیں یہ سبھی لوگ انگریزوں کے شکنجۂ عذاب میں جکڑے گئے مولانا صہبائی کیسے بچ سکتے تھے، گوروں کی زد پر جو آیا وہ نشانہ بنا، کہا جاتا ہے کہ کوچہ چیلان کے ۱۴سو مسلمان گرفتار ہوئے تھے ان میں مولانا صہبائی اور ان کے دو جوان بیٹے بھی تھے، ان سب کو جمنا پار لے جاکر صف میں کھڑا کر کے گولیاں ماردی گئیں اور لاشوں کو جمنا میں پھنکوا دیا گیا، مولانا صہبائی اور ان کے دونوں لڑکوں کو نہ کفن نصیب ہوا نہ قبر۔

مولوی رضی اللہ بدایونی۔

مولوی رضی اللہ ایک علمی گھرانے کے فرد تھے خود بھی عالم فاضل تھے، مشاہیر علمائے وقت سے علم حاصل کیا تھا درس و تدریس مشغلہ تھا، کئی انگریزوں نے بھی آپ سے عربی اور فارسی پڑھی تھی، مسٹر کارمیکل جو بدایوں کا کلکٹر تھا وہ بھی آپ کا شاگرد تھا، جب انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوئی تو آپ بذاتِ خود بھی اس میں شریک رہے، جب انگریزوں نے قابو پایا تو گرفتاریاں شروع ہوئیں، مولوی رضی اللہ بھی گرفتار ہو کر جیل خانے گئے۔ مقدمہ مسٹر کارمیکل کلکٹر بدایوں کی عدالت میں پیش ہوا۔ جرم ثابت ہوا بلکہ خود مولوی صاحب موصوف نے عدالت میں اپنے جرم کا اقبال کر لیا، کلکٹر کو چونکہ آپ سے ہمدردی تھی اسلئے

چاہتا تھا کہ مولوی صاحب اس جرم سے انکار کردیں تو میں چھوڑ دوں، مقدمہ ملتوی کر دیا اور مولوی صاحب کو اطلاع کرائی کہ کل جب آپ پیش ہوں تو جرم سے انکار کر دیں دوسرے دن عدالت میں لائے گئے تو پھر اقبالِ جرم کر لیا۔ مجبور ہو کر کلکٹر نے سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا، پھر جب انکو کھڑا کر کے گولی مارنے کا وقت آیا تو کلکٹر اپنے جذبات کو نہ روک سکا مولوی صاحب سے روتے ہوئے کہا کہ اب بھی آپ شرکت سے انکار کر دیں تو میں آپ کو موت سے بچالوں گا، مولوی صاحب نے بڑی ترشروئی سے جواب دیا کہ میں تمہاری وجہ سے اپنا ایمان اور اپنی عاقبت خراب کر لوں اسکے بعد کوئی چارہ نہیں رہ گیا، سامنے کھڑا کر کے گولی ماردی گئی۔

منشی رسول بخش۔

منشی رسول بخش کاکوروی بھی انگریزوں کے باغی تھے اور انکو زک پہونچانے کی جدوجہد میں شریک رہتے تھے، ایک مخبر نے مسٹر کارنگی کو منشی رسول بخش کی سرگرمیوں سے مطلع کیا کوتوال شہر پہونچا اور انکو گرفتار کر لیا، ان پر سازش اور بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا عدالت نے مجرم قرار دیا اور ان کو پھانسی اور ضبطیِ جائداد کا فیصلہ سنا دیا گیا ان کی ساری جائداد کوڑیوں کے بھاؤ نیلام کر دیا گیا اور منشی رسول بخش کو تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا۔

نواب عبدالرحمٰن خاں۔

ریاست جھجر کے جاگیر دار تھے، انکے خسر عبدالصمد خاں انگریزوں سے دست بدست جنگ کرتے رہے لیکن انگریز انکو گرفتار نہ کر سکے وہ کہاں گئے؟ کسی کو پتہ نہ چل سکا، گمنامی کی زندگی گذار کر راہیِ ملکِ بقا ہو گئے، خود نواب عبدالرحمٰن خاں بھی انگریزوں سے نفرت رکھتے تھے اور ان کے خلاف عملی جدوجہد کرتے رہتے تھے بالآخر گرفتار ہوئے، سازش وبغاوت اور قتل کا مقدمہ چلایا گیا، کچھ دنوں دیوانِ عام میں قید رہے، فیصلہ کے بعد چوراہے پر سولی نصب کر کے مجمع عام میں پھانسی دی گئی، انکی جانکنی کا روح فرسا منظر مجمع اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، تمام جاگیر، مال واسباب بحقِ سرکار ضبط کر لیا گیا۔

محمد علی خاں ۔

نواب شیر خاں کے صاحبزادے تھے، دہلی کوچہ چیلان میں رہتے تھے ان پر بھی بغاوت کا الزام تھا گرفتار ہوئے سازش و بغاوت کا جرم عائد کر کے مقدمہ کا ڈرامہ کیا گیا، سزائے موت کا فیصلہ ہوا، میدان میں کھڑا کر کے گولی مار دی گئی۔

نواب اکبر خاں ۔

یہ فیض اللہ خاں بنگش کے لڑکے تھے، عام بغاوت کے بعد الوَر میں انگریزوں کی پولیس نے انکو گرفتار کیا کچھ دنوں جیل میں رکھا، پھر فرضی مقدمہ قائم کر کے بغاوت کا مجرم قرار دیا گیا اور سزائے موت کا فیصلہ ہوا اور گوڑ گاؤں لے جاکر پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

نواب مظفر الدولہ ۔

لال قلعہ سے متعلق تھے مگر بغاوتِ عام میں الوَر چلے گئے تھے، پولیس ان کے پیچھے تھی، الور میں پولیس انکو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگئی، پھر انکو گوڑ گاؤں لے جایا گیا اور جیل میں ڈال دیا گیا، ان پر سازش و بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا اور معمول کے مطابق سزائے موت کا فیصلہ ہوا، گوڑ گاؤں ہی میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا، ان کے بھتیجے طالع یار خاں کو بھی الور سے گرفتار کر کے دہلی لائے اور دو ماہ یہاں جیل میں رکھا پھر تختۂ دار پر چڑھا دیا۔

میر محمد حسین ۔

میر محمد حسین خلف میر خیراتی سر رشتہ دار محکمہ ایجنسی الور کا شمار بھی باغیوں میں تھا پولیس انکو الور سے گرفتار کر کے دہلی لے آئی اور جیل میں ڈال دیا پھر جرم بغاوت عائد کر کے چند ماہ بعد ان کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

حکیم عبد الحق ۔

حکیم عبد الحق ابنِ حکیم حسن بخش ریاست بلب گڈھ کے دیوان تھے، ان کو بھی باغیوں میں شمار کیا گیا اور بلب گڈھ میں گرفتار کر کے پہلے جیل میں رکھا پھر بغاوت کے مقدمہ کا ڈرامہ کر کے سزائے موت کا فیصلہ کر کے پھانسی دے دی گئی۔

قاضی فیض اللہ۔

قاضی فیض اللہ کشمیری، صدر الصدور کی کچہری میں سر رشتہ دار تھے، ہنگامہ کے زمانے میں کوتوالِ شہر بنائے گئے صرف یہی جرم ان کی پھانسی کیلئے انگریزوں کے واسطے کافی تھا، گرفتار کرکے سیدھے پھانسی کے تختہ پر لے گئے اور پھانسی دیدی۔

نواب محمد حسین خاں۔

نواب محمد حسین خاں ابنِ نواب ارتضا خاں، مرزا خضر سلطان کے نائب تھے ان کو ریاست جھجّر میں گرفتار کیا گیا، سزائے موت پہلے ہی سے طے تھی، اسلئے بلا مقدمہ پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

مولوی مبارک علی۔

مولانا احمد اللہ عظیم آبادی کے بعد جماعتِ مجاہدین کے نظام کو جاری رکھنے کیلئے مولوی مبارک علی میدان میں آئے، آپ کا وطن حاجی پور ضلع مظفر پور (بہار) تھا مجاہدینِ آزادی پر جو سازش و بغاوت کے مقدمات چل رہے تھے مولوی مبارک علی، مولوی محمد حسن ذبیح کے ساتھ پوری جرأت سے انکی پیروی کرتے تھے، انبالہ سازش کیس کے بعد عظیم آباد میں سازش و بغاوت کے دو مقدمات چلائے گئے، مجاہدین کے خلاف آخری بڑا مقدمہ ۱۸۷۰ء میں چلایا گیا اس میں سات ملزم تھے، انھیں میں مولوی مبارک علی بھی تھے اور ان کے صاحبزادے مولوی تبارک علی بھی تھے ۱۸۷۰ء کے آخر میں مقدمہ کا فیصلہ ہوا مولوی مبارک علی کو تو جیل بھیجدیا گیا اور جیل ہی میں جان جاں آفریں کو سپرد کی ان کے صاحبزادے کو کالے پانی کی سزا ہوئی اور وہ جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے۔

ابراہیم منڈل۔

محمد جعفر تھانیسری نے اپنی سرگذشت تواریخ عجیب عرف کالا پانی میں لکھا ہے کہ ایک بوڑھے اور ضعیف شخص ابراہیم منڈل کو اسلام پور میں گرفتار کیا گیا اور معمول کے مطابق برائے گواہوں سے جو چاہا گواہیاں دلواکر بے چارہ کو کالے پانی بھیجدیا اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم منڈل کو بھی کالے پانی کی سزا ہوئی تھی، مالدہ میں جو سازش کیس مولوی امیرالدین

وغیرہ پر چلایا گیا تھا اسی وقت ابراہیم منڈل ساکن اسلام پور نواح راج محل کے خلاف بھی مقدمہ قائم کیا گیا تھا یہ بزرگ بڑے غیور دیندار تھے اور بزرگانِ عظیم آباد سے ان کا گہرا تعلق تھا راج محل کے پورے علاقے میں ان کے تقویٰ، دینداری اور جوشِ حمیتِ اسلام کا بڑا شہرہ تھا انگریزوں نے ان کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا اور اکتوبر ۱۸۷۰ء میں حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور اور ضبطی جائداد کی سزا دی، بعض تذکروں میں ہے کہ انکو کالے پانی نہیں بھیجا گیا اور انھیں لارڈ ڈلٹن کے حکم سے ۱۸۸۰ء میں رہا کر دیا گیا، انکا انتقال بیسویں صدی کی ابتدا میں ہوا، ۱۹۴۷ء تک ابراہیم منڈل کا پوتا زندہ تھا اور ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے ابراہیم کو دیکھا تھا۔

پیر محمد۔

سازش وبغاوت کے مقدمات کا جو سلسلہ انبالہ سے شروع ہوا تھا ان میں کا آخری مقدمہ ۱۸۷۱ء میں بمقام عظیم آباد چلا گیا ان میں سات ملزمان تھے پیر محمد، امیر خاں، حشمت داد خاں، مولوی مبارک علی، مولوی تبارک علی، حاجی دین محمد اور امین الدین، ان لوگوں پر سازش وبغاوت کا الزام تھا، ان میں سے پانچ افراد پر اعانتِ جرم کا الزام تھا مقدمہ کی ابتدائی سماعت مسٹر باربور منصرم جائنٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں یکم مارچ ۱۸۷۱ء کو شروع ہوئی، ۲۷ رمارچ کو مقدمہ سیشن سپرد ہوا، یکم مئی سے مقدمہ کی سماعت مسٹر پرنسپ سیشن جج نے شروع کی حکومت کی طرف سے ۱۲۶ گواہ تھے لیکن ۱۱۳ گواہ پیش ہوئے ۱۸۷۱ء کے آخر میں مقدمہ کا فیصلہ ہوا، حشمت داد خاں اور امیر خاں میوات کے رہنے والے تھے، کلکتہ میں چمڑے کا کاروبار تھا، انبالہ سازش کیس کے وقت امیر خاں بھی گرفت میں آئے تھے اور ان کی تلاشی لی گئی تھی اور مجاہدین کی ایک ہنڈی ان کے یہاں سے برآمد ہوئی تھی اسلئے انکو گرفتار کیا گیا تھا ۴ رجولائی ۱۸۷۱ء کو فیصلہ سنایا گیا پانچ ملزمان کو پچھلے مقدمات کے مطابق حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور و ضبطی جائداد کی سزا دی گئی آخر میں اتنی بات اور بتا دینی چاہئے کہ اسی مقدمہ میں ایک موقعہ پر کلکتہ کے جسٹس نارمن نے مجاہدینِ آزادی کی حبسِ بے جا کی درخواست کو نامنظور کر دیا تھا جس پر لوگوں میں بڑا اشتعال تھا، اسی موقعہ پر عبداللہ پنجابی نے کمرۂ عدالت میں جسٹس نارمن پر قاتلانہ حملہ کیا اور اسی ضرب سے ۲۱ رستمبر ۱۸۷۱ء کو وہ مر گیا ہنٹر نے اپنی کتاب

"ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے عبداللہ کو گرفتار کر کے پھانسی دیدی گئی، مقدمہ میں بقیہ دو آدمیوں کو رہا کر دیا گیا جس میں پیر محمد بھی تھے۔

تیتومیاں۔

تیتومیاں کا نام میر نثار علی تھا، تیتومیاں کے نام سے مشہور تھے، سید احمد رائے بریلوی کے منتسبین میں سے تھے، چاند پور کے ایک خوشحال زمیندار خاندانکے چشم و چراغ تھے مسلمانوں میں اصلاح و دعوت کی انھوں نے تحریک شروع کی اوران تمام ظلم و زیادتی کا مقابلہ کرنے کا لوگوں میں حوصلہ پیدا کیا جو حکومت اور اسکے کارندوں کی طرف سے کسانوں پر توڑی جارہی تھی، یہ تحریک بنگال کے تین ضلعوں چوبیس پرگنہ، ندیا، اور فرید پور میں ایک طاقتور تحریک بن گئی، ایک ہندو زمیندار کشن رائے کی زیادتی کو انھوں نے عدالت کے ذریعہ روکنا چاہا لیکن جب انصاف نہ مل سکا تو انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ ظلم کے خلاف پوری طاقت سے لڑائی چھیڑ دی جائے چاہے اس میں انکی جان ہی کیوں نہ چلی جائے انھوں نے انگریزی نظام کے خلاف جنگ چھیڑنے سے پہلے رسد اور روپیہ فراہم کیا اور چاول کی بہت بڑی مقدار نرکل برما میں معزالدین بسواس کے پاس جمع کر دی گئی، اگرچہ بظاہر یہ لڑائی زمینداروں کے خلاف تھی لیکن اس کے پس پردہ انگریزی حکومت کی طرف سے دلوں میں بیٹھی ہوئی نفرت بھی کارفرما تھی، کیونکہ حملہ کے وقت اعلان کر دیا گیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہوگئی ہے، جب اقدامات کا سلسلہ شروع ہوا تو نیل کے کاروبار کے مرکز کے ایک کارخانہ کا نائب مہتمم مسٹر پیرول نے اپنے مالک مسٹر سٹارم کو کلکتہ لکھ کر قلع قمع کرنے کیلئے فوجی مدد مانگی چنانچہ مسلح پولیس کی ایک جمعیۃ الگزینڈر کی زیرِ سرکردگی بھیج دی گئی، مجاہدینِ آزادی نے غلام معصوم کی قیادت میں انگریزی سپاہیوں کو شکست فاش دی، الگزینڈر جان بچا کر بھاگا۔

ایک دوسرے کارخانہ دار نے اپنے تین سو آدمیوں کو لیکر مجاہدین پر حملہ کیا لیکن پرجوش مجاہدین کے مقابلہ میں زیادہ دیر تک وہ نہ ٹک سکے اور شکست کھائی، ایک ہفتہ کے بعد پھر کچھ انگریز ہاتھیوں پر سوار ہو کر نرکل برما پہونچے اور ان کے ساتھ بھی فوجیوں کی ایک جماعت تھی لیکن مجاہدین نے انکو بھی شکست دیدی اور وہ بری طرح پسپا ہوئے، ندیا کی عدالت کا ناظر اور

دو برقندا زمارے گئے، آخر میں کلکتہ سے ایک بڑی فوج بھیجی گئی جس میں سوار اور پیادے دونوں تھے، ان کے ساتھ دو توپیں تھیں، تیتومیاں نے چھ سو آدمیوں کو لے کر ان کا سخت مقابلہ کیا، اس جنگ میں انکے بہت سے ساتھی شہید ہوئے، خود تیتومیاں نے بھی اسی مقابلے میں جامِ شہادت نوش کیا، غلام معصوم اور ساڑھے تین سو آدمی گرفتار ہوئے، علی پور جیل میں مقدمہ چلا، غلام معصوم کو پھانسی دی گئی باقی قیدیوں میں سے ایک سو چالیس کو مختلف المیعاد سزائیں دی گئیں۔

ودود میاں۔

محمد محسن عرف ودود میاں بڑے پرجوش اور سرگرم آدمی تھے، انھوں نے گردوپیش کے کسانوں کو سچا مسلمان بنا کر منظم کر دیا تھا، ان کی پنچائتیں قائم کر دی تھیں اور اس پنچایتی نظام کو اتنے بڑے پیمانے پر پھیلایا کہ مشرقی بنگال کے ایک بڑے حصے میں ایک طرح کا متوازی نظامِ حکومت بن گیا، کسانوں کی تنظیم اور ان کو آپریشن کی یہ پہلی کامیاب تحریک تھی جو مشرقی بنگال میں وجود میں آئی، اس تحریک کی کامیابی کا سہرا ودود میاں کے سر ہے، اس جدجہد میں حکومت کے ساتھ ساتھ تمام زمیندار بھی انکے دشمن ہوگئے کیونکہ ان کے مظالم پر بھی اس کی زد پڑتی تھی جسکی وجہ سے انکو تا زندگی طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن انھوں نے انگریزی اقتدار کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا اور وہ اپنے مشن کے آخری دم تک وفادار رہے، کوئی مصیبت، کوئی لالچ ان کے دل سے آزادی کے جذبے کو کھرچ کر نہیں نکال سکا، یہاں تک کہ جان جان آفریں کو سپرد کردی یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آزادی کا پہلے پہل علَم بلند کرکے مسلمانوں کا نام روشن کیا۔

شیر علی۔

۱۸۶۷ء میں ایک مقدمہ کے سلسلے میں شیر علی کو پھانسی کا حکم ہوا تھا لیکن بعد میں سزائے موت دینے کے بجائے اسکو کالے پانی بھیجدیا گیا، اس طرح وہ جزیرۂ انڈمان پہنچ گیا، اسنے دل میں یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ کسی بڑے انگریز کو قتل کرکے ضرور انتقام لے گا، اتفاق سے چار پانچ سال کے بعد اسکو موقعہ مل گیا، وائسرائے ہند لارڈ میو، کالے پانی معائنہ کی غرض سے گیا شیر علی نے پولیس کے گھیرے میں گھس کر چھری اس کی پیٹھ میں گھونپ دی لارڈ صاحب چند منٹوں میں

اپنے انجام کو پہونچ گئے، شیر علی کو گرفتار کر لیا گیا، اس نے اپنے جرم کا عدالت میں صاف لفظوں میں اقرار کر لیا اور پھانسی کے تختہ پر چڑھ گیا۔

امیر خاں۔

یہ کلکتہ کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے چمڑے کا بہت بڑا کاروبار تھا، مجاہدین کی ایک ہنڈی انکے یہاں سے برآمد ہوگئی یہ جرم انگریزوں کیلئے سزا دینے کے واسطے کافی تھا فرضی گواہوں سے جھوٹی گواہیاں دلواکر کالے پانی بھیجدیا گیا اور انکی کروڑوں کی جائداد بحق سرکار ضبط کرلی گئی

مولانا محمد حسین۔

سید احمد رائے بریلوی کے مشن کے سرگرم کارکن تھے اور بہت ہی پرجوش تھے اپنی آتش نوائی شعلہ بیانی اور باغیانہ تقریروں سے مجمع کے دلوں میں آگ لگادیتے تھے اور عوام میں بغاوت کے جذبات پیدا کر دیتے تھے، ان کی انھیں تقریروں کی بنیاد پر مقدمہ چلایا گیا اور بغاوت پھیلانے کے جرم میں کالے پانی کی سزا دی گئی، جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

مولانا ریاض الحق۔

یہ بھی بنگال کے مشہور لیڈر تھے، ان پر بھی سازش اور بغاوت پھیلانے کا جرم عائد کرکے مقدمہ چلایا گیا اور عدالت کی طرف سے حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا ملی اور جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے، وہیں پوری زندگی گذار کر ربِ حقیقی سے جاملے۔

پیرالی۔

نام کچھ اور تھا مگر اپنے دیار میں وہ اسی نام سے مشہور تھے، بہار کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے پڑھے لکھے نوجوان تھے انھوں نے اپنے علاقے میں کسانوں کی تنظیم کی اور انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرتے رہے ایک انگریز افسر نے اس کے ساتھ بدسلوکی کی، پیرالی نے اس کو قتل کر دیا پولیس نے پیرالی کو گرفتار کیا، مقدمہ میں سزائے موت تجویز کی گئی اور پھانسی پر چڑھا دیئے گئے۔

مراد علی۔

ضلع فرخ آباد کے رہنے والے تھے، فوج میں ملازم تھے، پیرالی کی پھانسی کی سزا سن کر پولیس میں بغاوت پھیلانے کی جدوجہد کرتے رہے، آخر میں اپنے افسروں کا حکم ماننے سے

انکار کر دیا گرفتار ہوئے اور کورٹ مارشل ہوا، پھانسی کے بجائے کالے پانی بھیجے گئے تازندگی وطن کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔

حسین خاں۔

یہ آگرہ کے رہنے والے تھے، پولیس میں ملازم تھے، پرالی کے واقعہ کے بعد جن لوگوں نے پولیس میں بغاوت کے جذبات پھیلائے ان میں حسین خاں بھی تھے جب راز فاش ہوا تو گرفتار کر لئے گئے مقدمہ چلا عدالت نے حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا دی اور انڈمان بھیجے گئے۔

حشمت علی۔

یہ چندیلا کے باشندے تھے پولیس میں ملازم تھے پرالی کے واقعہ کے بعد بغاوت پھیلانے کے الزام میں گرفتار کئے گئے مقدمہ چلا، بغاوت پھیلانے کا جرم ثابت ہوا عدالت نے حسبِ معمول ان کو بھی حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا دی اور کالے پانی بھیجے جانے سے پہلے انہوں نے اپیل کر دی، اور اس میں کامیابی کے بعد سزا سے بچ گئے مگر نوکری سے برطرف کر دیئے گئے۔

منصب علی۔

یہ چندیلا کے باشندے تھے پرالی کے واقعہ سے جو لوگ متاثر ہوئے ان میں منصب علی بھی تھے انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ پولیس میں بے اطمینانی اور بغاوت کے جذبات پھیلائے جسکے نتیجہ میں گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، بغاوت پھیلانے کا جرم ثابت ہونے پر عدالت نے انکے ساتھیوں کے ساتھ حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا دی اور انڈمان بھیجے گئے۔

مہدی حسین۔

یہ ضلع سلطانپور کے رہنے والے تھے پولیس میں ملازم تھے پرالی کو سزا دیئے جانے پر انگریزوں کے خلاف پولیس کے جذبات بھڑکا رہے تھے، مخبری کے بعد گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا عدالت میں بغاوت پھیلانے کے جرم میں کالے پانی کی سزا ہوئی اور انڈمان بھیجے گئے۔

غلام حسین۔

غلام حسین جونپور کے رہنے والے تھے یہ بھی پولیس میں ملازم تھے، ان پر بھی پولیس میں بغاوت پھیلانے کا الزام تھا گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، عدالت نے حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے

شور کی سزا دی، اور جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے۔

مولوی علاء الدین۔

یہ حیدر آباد کے بہت پرجوش لیڈر اور بہترین خطیب و مقرر تھے حکومت کیخلاف گرم تقریریں کرتے تھے جب انگریزی حکومت کیلئے یہ تقریریں ناقابلِ برداشت ہوگئیں اور سی آئی ڈی نے مسلسل رپورٹیں دیں، اسکے نتیجہ میں گرفتار کرلئے گئے ان پر عوام میں بغاوت پھیلانے کا الزام عائد کیا گیا، مقدمہ چلا، عدالت نے پھانسی کی سزا دی اور وطن پر قربان ہوگئے

مولوی علاء الدین۔

مولوی علاء الدین پٹنہ (بہار) کے معززین میں سے تھے آپ کی سیاسی سرگرمیوں کیوجہ سے گرفتار کرکے ان پر بغاوت پھیلانے کا لگایا گیا عدالت نے حبسِ دوام بعبورِ دیائے شور کی سزا دی اور کالے پانی بھیجے گئے

عبداللہ پنجابی۔

کلکتہ کے رہنے والے تھے۔ پنجابی کہے جاتے تھے جن دنوں عظیم آباد کا سازش کیس چل رہا تھا اسی دوران کلکتہ ہائیکورٹ کے جسٹس مسٹر نارمن کو گولی ماردی تھی، اس جرم میں گرفتار ہوئے، سرسری مقدمہ کی کارروائی ہوئی سزائے موت کا فیصلہ ہوا اور پھانسی پر چڑھا دیئے گئے

مولانا عبدالغفار۔

سرگرم سیاست میں حصہ لیتے تھے جس کی وجہ سے اپنے علاقے میں بڑے احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے، جنگِ آزادی میں پرجوش سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار کرلئے گئے عدالت میں مقدمہ چلا اور انکو بغاوت پھیلانے کا مجرم قرار دیا اور حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور کی سزا ہوئی اور کالے پانی بھیجے گئے۔

رفیق منڈل۔

مالدہ (بنگال) کے کسانوں کی تنظیم کا جو سینٹر تھا اسکے انچارج تھے، نیل کے کسانوں کو لے کر انگریز کارخانہ داروں کے خلاف باقاعدہ جدوجہد اور جنگ کرتے تھے اور

کسانوں کے مسائل کو لے کر ہمیشہ انگریز کارخانہ داروں کے خلاف نبرد آزمائی کیلئے تیار رہتے تھے ان تیز تر سیاسی سرگرمیوں کیوجہ سے بالآخر پولیس نے گرفتار کرلیا، عدالت میں مقدمہ چلا، بغاوت کا الزام ان پر لگایا گیا، عدالت نے عمر قید کی سزا دی اور جیل میں ڈالدیئے گئے پوری زندگی جیل میں بسر ہوئی۔

حاجی مبارک علی۔

حاجی مبارک علی حاجی پور ضلع مظفر پور (بہار) کے رہنے والے تھے، سید صاحب کی تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے مولانا احمد اللہ عظیم آبادی کے کالے پانی چلے جانے کے بعد جماعت کے لیڈر منتخب کئے گئے مارچ ۱۸۷۱ء میں پکڑے گئے، مختلف دفعات میں سخت سے سخت سزائیں دی گئیں، جیل میں پولیس نے اتنا مارا کہ ان چوٹوں کی تاب نہ لاکر انتقال کرگئے

حاجی دین محمد۔

سید احمد رائے بریلوی کی تحریک سے وابستہ تھے، پولیس نے انکو گرفتار کرکے ان پر بغاوت پھیلانے کا الزام لگایا، فرضی اور کرایہ کے گواہوں سے گواہی دلواکر فردِ جرم ثابت کیا اور حسب معمول حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا دی اور حاجی صاحب جزیرۂ انڈمان بھیج دیئے گئے، وہیں پوری زندگی گذار کر راہیِ ملکِ بقا ہوگئے۔

امین الدین۔

سید صاحب کی تحریک سے وابستہ تھے، مجاہدینِ سرحد کیلئے کام کرتے تھے پولیس نے انکو گرفتار کیا اور ان پر بغاوت پھیلانے کا جرم عائد کرکے مقدمہ چلایا، فرضی گواہیوں کے بعد جرم ثابت مان لیا گیا اور حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا سنادی گئی، جزیرۂ انڈمان بھیج دیئے گئے پھر وطن آنا نصیب نہ ہوا۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی۔

دارالعلوم دیوبند کے بانی، علماء دیوبند کے سرخیل، اسلامی ہند کے فلاسفر اور متکلم، بہت پرجوش، بہت ہی ذہین وفطین، جسمانی لحاظ سے نہایت چاق وچوبند، تصوف وطریقت اور زہد وورع میں کامل، شاملی کے محاذ پر انگریزی فوج سے دست بدست جنگ کرنیوالے، مدتوں انگریزی حکومت کی طرف سے آپکے نام وارنٹ رہا آپ نانوتہ اور دیوبند آتے جاتے رہے لیکن

گرفتار نہ ہوسکے یہاں تک کہ عام معافی کا اعلان ہوگیا۔

حاجی امداد اللہ۔

علماء دیوبند و اکابرِ دیوبند کے پیر و مرشد تھے انگریزوں کے خلاف انکی مساعی بھی علماء دیوبند کے شامل حال رہیں، آپ پر بھی حکومت کیطرف سے وارنٹ تھا لیکن پولیس گرفتار نہ کرسکی، قدرت کو بچانا منظور تھا اسلئے وسائل فراہم ہوگئے اور آپنے خفیہ طور پر ہندوستان چھوڑدیا اور مکہ معظمہ ہجرت کرگئے اور ساری زندگی وہیں گذار کر اسی مقدس سرزمین میں دفن کی سعادت حاصل کی۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کیرانہ ضلع مظفر نگر کے بہت معزز جاگیردار اور امیر کبیر گھرانے کے فرد جلیل تھے انکے آبا و اجداد کو شاہان مغلیہ کیطرف سے بڑی بڑی جاگیریں دی گئی تھیں انکی حویلی عالیشان تھی انکے محلات و باغات تھے اس دولت و ثروت کے ساتھ آپ بہت جلیل القدر عالم و فاضل بھی تھے، انگریزوں نے حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد ہندوستان کو عیسائی بنانے کی مہم چلائی پادری فنڈر کو اسکی الہامی کتاب کے ساتھ ہندوستان بھیجا وہ دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر مسلمانوں کو مناظرے کا چیلنج کرنے لگا انگریزوں کی دہشت کیوجہ سے کسی کو اسکے جواب دینے کی ہمت نہیں تھی آپ نے اسکو للکارا اور آگرہ میں انگریز افسران کی موجودگی میں اس سے مناظرہ کیا اور ذلت آمیز شکست دی پادری فنڈر ذلت کیوجہ سے راتوں رات ہندوستان سے فرار کرگیا غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مولانا رحمت اللہ صاحب کے نام وارنٹ جاری کیا گیا آپنے خفیہ طور پر ہندوستان چھوڑ دیا اور مکہ مکرمہ پہنچ گئے، مولانا کیرانوی کی جرأت و ہمت اور کوششوں کا ثمرہ ہے کہ انگریزی حکومت نے ہندوستان کو عیسائی بنانے کی مہم بدل دی اور عیسائیت کی تبلیغ پادریوں کو سپرد کرکے حکومت کو اس سے علیحدہ کرلیا۔

آپنے مکہ مکرمہ میں جاکر مدرسہ صولتیہ قائم کیا جو آج تک آپکے نامِ نیک کی یاد دلا رہا ہے، ساری زندگی اسی حرمِ محترم کے سایہ میں بسر کی عیسائیت کے خلاف معرکۃ الآرا کتابیں تصنیف کیں جس کا جواب آج تک پوری عیسائی دنیا نہ دے سکی مکہ مکرمہ میں آپ کی وفات ہوئی اور اسی مقدس سرزمین میں محوِ خواب ہیں۔

باب (۲)

آزادی کے دیوانے آزادی کی تلاش میں

۱۸۵۸ء سے لے کر انیسویں صدی کے آخری لمحات تک مسلمان تنِ تنہا جنگِ آزادی کے میدان میں برطانوی سامراج سے لڑتا رہا، اس راہ میں کتنے مجاہدینِ آزادی کا مقدس خون بہا، کتنوں نے میدانِ جنگ میں اپنے خون سے ارغوانی فرش بچھا دیئے اور زمین کو لالہ زار بنا دیا اس کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا، یہ وہ زمانہ تھا کہ اس راہ میں قدم رکھنے کا معنی اپنی جان و مال، آل اولاد، وطن اور گھر بار سب داؤ پر لگا دیا گیا۔

اس راہ میں تہجد گذار صوفیا و مشائخ بھی آئے، شعلہ بیان آتش نوا علماء بھی اس میں غربا بھی تھے اور رؤسا و اُمرا بھی، لیکن برطانوی سامراج کی زد پر جو آگیا اس کا وجود گرد ہو کر فضاؤں میں اُڑ گیا، انگریزوں کی معمولی سزا پھانسی تھی، اگر اس سے کوئی بچ گیا تو اس کو کالے پانی بھیج دیا گیا جو انگریزوں کا سب سے بڑا عذاب خانہ تھا، اس عذاب خانے میں علما و مشائخ، رؤسا و اُمرا نواب و جاگیرداروں کو کیسی کیسی روحانی و جسمانی اذیتیں بھگتنی پڑیں آج بھی پڑھ کر دل کانپ جاتا ہے اور درد سے بھر آتا ہے۔

اس مسموم جزیرے میں کتنے مسلمان مجاہدینِ آزادی ۱۸۵۸ء کے بعد بھیجے گئے اسکی اب تک کوئی مکمل فہرست شائع نہیں ہو سکی ہے لیکن تخمینہ لگانے والوں نے ۲۰ر فروری ۱۸۶۸ء تک جب مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی کا جزیرۂ انڈمان میں انتقال ہوا ہے ان کے جنازے میں شریک ہونے والے مسلمانوں کا چار اور پانچ ہزار کے درمیان تخمینہ لگایا ہے، یعنی اس وقت تک مسلمان مجاہدینِ آزادی کم از کم پانچ ہزار بھیجے جا چکے تھے، مجاہدینِ آزادی کی یہ تعداد ان ہزاروں مسلمانوں کے علاوہ ہے جن کو گرفتار کر کے انگریزوں نے جوشِ انتقام میں پھانسیاں دیدی ہیں یا

صفوں میں کھڑا کرکے گولیاں ماردی ہیں، اس تفصیل سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ۱۹۰۰ء تک مسلمان مجاہدینِ آزادی نے اپنا کتنا خون آزادی کی راہ میں بہایا ہے، مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں نے آزادی حاصل کرنے کا سہرا اپنے سروں پر باندھ رکھا ہے انھوں نے اتنا پسینہ بھی نہیں بہایا ہوگا جتنا مسلمانوں نے اپنا خون بہایا ہے۔

اس سے دردناک وہ عذاب ہے جو ان مجاہدینِ آزادی کو بھگتنا پڑا جوان کی لاکھوں لاکھ کی جائدادوں کو مفت کے دام حکومت نے نیلام کرکے انکے معصوم بچوں، پردہ نشین عصمت مآب خواتین کو نانِ شبینہ کا محتاج بنا دیا، یہ تصور ہی مجاہدینِ آزادی کیلئے بڑا روح فرسا تھا انھوں نے اپنی پھانسی کا حکم سن کر مسکرا دیا تھا لیکن ان کی آل واولاد کو دردربھیک مانگنے پر مجبور کردینا خون کے آنسو رلا گیا جیسا کہ عظیم آباد کے امیر کبیر مولانا احمد اللہ صاحب کے ساتھ ہوا کہ انکی ساری جائداد پر انگریزی حکومت نے قبضہ کرکے انکے خاندان کے ایک ایک فرد کو عین عید کے دن گھر سے اس حال میں نکال باہر کیا کہ ایک سوئی بھی اُٹھانے کی اجازت نہیں دی، یہ دردناک تفصیل انکے صاحبزادے حکیم عبدالحمید صاحب نے اپنی کتاب میں دی ہے۔

آزادی کا صرف ایک راستہ

انیسویں صدی کے اخیر تک بلکہ بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں تک ہندوستان کی آزادی کی صرف ایک راہ تھی یعنی آزادی بذریعۂ طاقت اسکے علاوہ اور دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا، اور نہ ابتک کوئی دوسرا طریقۂ جنگ ایجاد ہوا تھا، اسلئے اس پورے دور میں صرف قوتِ بازو پر بھروسہ کیا گیا، اگرچہ تمام جدوجہد کا نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ نکلا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ہندوستان والوں کے دلوں میں غلامی سے نفرت بیٹھ گئی اور آزادی حاصل کرنے کا جذبہ دلوں میں موج زن ہوا، یہ آگ کبھی شعلۂ جوالہ بنی، کبھی مدھم ہوکر چنگاری بن گئی لیکن یہ آگ بالکل سرد کبھی نہیں ہوئی ان قربانیوں کی یہی دین کچھ کم نہیں ہے۔

انھیں خوں نابہ بار حالات سے گذر کر تحریکِ آزادی بیسویں صدی میں داخل ہوتی ہے اب بھی وہی نقطۂ نگاہ ہے کہ آزادی کی دیوی صرف خون کا مطالبہ کرتی ہے، تلوار ہاتھ میں اٹھالینے کی تلقین کرتی ہے، بیسویں صدی نے دوسری دہائی میں قدم رکھا یورپ میں پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی

اس نے کچھ اور راہیں کھولدیں، برادرانِ وطن کے بعض افراد بھی جدوجہدِ آزادی کے میدان میں نظر آنے لگے، ان کا بھی نقطۂ نگاہ یہی تھا کہ ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ انتشار پھیلایا جائے، بغاوت کے وسائل و ذرائع فراہم کیے جائیں، مسلمانوں کے علاوہ دوسرے حریت پسندوں نے امریکہ اور یورپ کے مختلف ملکوں میں بیٹھ کر آزادیٔ وطن کیلئے کوششیں شروع کیں، انہیں لالہ ہردیال کی غدر پارٹی کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی، پہلی جنگِ عظیم کے آغاز میں ایک شخص چمپاکرن پلائے زیورچ میں مقیم تھا اس نے جرمنی میں ایک انجمن قائم کی جس کا نام "انڈین نیشنل پارٹی" رکھا، لالہ ہردیال، مولانا برکت اللہ بھوپالی، ڈاکٹر تارک ناتھ درس، چندرائے چکرورتی، ہرمبالال گپتا وغیرہ اس میں شریک ہوگئے یہ لوگ حکومتِ جرمنی کی وزارتِ خارجہ سے متعلق تھے۔

جنگِ عظیم کے موقعہ پر جرمنی کی پالیسی یہ ہوئی کہ ہندوستان میں کسی شکل سے ہنگامہ برپا کردیا جائے تاکہ انگریز ہندوستان کے مسائل میں اُلجھ کر رہ جائے اور فوجی جوانوں کو بھرتی کرکے محاذِ جنگ پر بھیجنے کی پوزیشن میں نہ رہ جائے اس کیلئے جرمنی نے دو منصوبے بنائے ایک یہ کہ بنگالیوں کو زیادہ سے زیادہ اسلحہ پہونچادیئے جائیں جو وہاں دہشت انگیز سرگرمیوں میں مشغول تھے دوسرا منصوبہ یہ تھا کہ افغانستان سے ہندوستان پر حملہ کرادے اور یاغستانی قبائل کیلئے فوجی تربیت اور اسلحہ کا انتظام کردیا جائے، اس طرح ہندوستان کے شمالی و مغربی سرحد پر خوں ریز جنگ کا آغاز ہوجائے گا اور یورپ کے محاذ پر انگریز یکسوئی کے ساتھ پوری توجہ نہیں کرسکے گا۔

ہندوستان میں اسلحہ پہونچانے کی کوشش

بنگال میں اسلحہ پہونچانے کی ذمہ داری بٹاویہ، شنگھائی اور بنکاک کے جرمن قونصلوں کی تھی، انھوں نے ایک جہاز میں تیس۳۰ ہزار بندوقیں، بے شمار کارتوس اور دو لاکھ روپے بھیجنے کا پروگرام بنایا، اور خلیجِ بنگال میں اُسے پہونچانے کا ارادہ کیا، اور یہ طے کیا کہ بنگال میں انقلابی پارٹی ان اسلحہ کو فوراً اپنے کارکنوں کو تقسیم کردے وہ تمام ریلوے پل کو توڑدیں جن سے بنگال میں ٹرینیں آتی ہیں، اس طرح بنگال کو ہندوستان

سے کاٹ دیں اور اس پر قابض ہو جائیں اور جب اطمینان کی ایک محفوظ جگہ بن جائے تو جرمنی سے باقاعدہ اسلحہ اور گولہ بارود اور روپیہ بنگال میں آتا رہے گا اور پھر پورے ہندوستان میں انقلاب کی لہر پیدا ہو جائے گی ۔

جرمنی نے تین مرتبہ اسلحہ بھیجنے کی کوشش کی لیکن ہر بار ناکامی ہوئی پھر اس اسکیم پر اتنا وقت گذر گیا کہ سازش کا راز فاش ہو گیا اور وہ تمام بنگالی گرفتار ہو گئے جو اسلحہ جہاز سے اتروانے کے ذمہ دار تھے ، پھر انگریزی حکومت نے پورے ساحلی علاقے میں ایسے انتظامات کر دیئے کہ کوئی جہاز ہندوستان تک پہونچ ہی نہ سکے ، ایک جہاز میں تھوڑا سامان آیا وہ راستہ ہی میں پکڑا گیا ۔

اس پلاننگ میں انڈین نیشنل پارٹی تھی جو جرمنی میں ہندوستانیوں نے بنائی تھی اسی کے صلاح ومشورہ کو اس میں دخل تھا اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ کچھ افراد ہندوستان کی آزادی کیلئے اپنی جان ہتھیلیوں میں لے کر میدان میں نکل آئے تھے لیکن یہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہوا ۔

انیسویں صدی کا جائزہ

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد انیسویں صدی کے آخر تک تحریکِ آزادی میں صرف سید احمد رائے بریلوی کے خلفاء اور جانشینوں اور انکی قائم کردہ جماعت ہی کی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے ، یہ سوال آپ کے ذہن میں آسکتا ہے کہ کیا دوسرے ہندوستانی اس وقت تک خاموش تھے ؟ ان میں آزادی کی کوئی تڑپ نہیں تھی ؟ انھوں نے اپنی بے چینیوں کا اظہار کبھی نہیں کیا ؟ جب کہ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہو چکی تھی جس نے آگے چل کر ہندوستان کی آزادی میں کلیدی رول ادا کیا اور اسکی بے پناہ قربانیوں کے نتیجہ میں ملک کو آزادی نصیب ہوئی ۔

اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ بات کچھ ایسی ہی ہے ، سوائے چند پرجوش نوجوانوں کے اُن کارناموں کے جو انھوں نے بعض انگریزوں کو قتل کر کے یا ان پر بم پھینک کے انجام دیے ہیں اجتماعی طور پر انکی کسی سرگرمی کا تاریخوں میں ذکر نہیں ملتا ہے ، مسلمانوں کے اس جدوجہد کے میدانوں میں آنے کے کچھ قدرتی اسباب پیدا ہو گئے اور مسلمان مجبور تھا کہ وہ

انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں اپنی پوری کائنات داؤ پر لگا دے کیونکہ اب صرف اس کی آزادی اور غلامی کا مسئلہ نہیں تھا، اور عزت وذلت کا سوال نہیں رہ گیا تھا بلکہ بات اسکے دین وایمان تک آپہونچی تھی اور علی الاعلان حکومت مسلمانوں کے دین ومذہب پر قزاقی کیلئے آمادہ ہوگئی تھی اور مسلمان اپنی ذات پر مصائب کے پہاڑ اٹھا سکتا ہے لیکن جب بات دین و مذہب کی آجائے گی تو ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر وہ میدان میں اتر جائے گا یہ اس قوم کی پوری تاریخ رہی ہے، ۱۸۵۷ء کے معًا بعد جو صورتِ حال پیدا ہوئی بلکہ اس سے چند سال پہلے ہی سے مسلمان جس ذہنی کشمکش اور روحانی کرب کے دن گذار چکا تھا اسی نے سب سے پہلے میدانِ جہاد میں اسکو صف بندی پر مجبور کیا اور تلوار لے کر وہ میدانِ عمل میں آگیا۔

حکومت کی پالیسی

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ۱۸۵۸ء سے ۱۹۰۰ء تک بیتالیس سال کا یہ زمانہ غلام ہندوستان کا بدترین دور تھا، انگریزوں کی وحشت وبربریت پورے شباب پر تھی اور ان کا دماغ سونے کی اس چڑیا پر قابو پانے کے بعد آسمان پر تھا، برطانوی حکومت کے استحکام کیلئے نئی نئی تدابیر سوچی جارہی تھیں، انھیں ہندوستانیوں کے جذبات کی قطعاً پرواہ نہیں تھی، وہ ہر ممکن طریقے سے ملک میں خوف ہراس کی فضا بنائے رکھنے میں دلچسپی رکھتے تھے، وہ عام ہندوستانیوں سے الگ تھلگ رہتے تھے کبھی کسی سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے، اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ انکے رعب داب اور ہیبت میں کوئی کمی نہ آنے پائے، مزید ستم یہ کہ انھوں نے مشقِ ستم کیلئے مسلمانوں کو چھانٹ رکھا تھا اور پورے اس دور میں کون ساز ہریلا تیر ہے جو ان پر نہیں چلایا گیا؟ کون سی عبرتناک سزا ہے جو انکو نہیں دی گئی؟ کیونکہ مسلمانوں کے احساسِ برتری کو ان کے دماغوں سے کھرچ کر نکال دینا ان کا مقصد تھا، تجربات نے انکو یہ پالیسی سکھائی تھی، وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کے حاکمانہ اقتدار کی مرکزیت دہلی پر قبضہ کے بعد تو ختم ہوگئی لیکن مذہب ایک ایسا نقطۂ اتحاد ہے جو اس قوم کی شیرازہ بندی کئے ہوئے ہے اور ان کو منتشر نہیں ہونے دیتا اس لئے انھوں نے ضروری سمجھا کہ مسلمان قوم سے ان کے مذہب کی گرفت کو کمزور کر دیا جائے یا تو ان میں ذہنی وفکری ارتداد کی تخم ریزی کر دی جائے اور انکو انگریزی تعلیم دے کر انگریزی

معاشرت اور تہذیبِ جدید کی چمک دمک کو ان کے گھروں میں داخل کر دیا جائے تاکہ دین سے ان کا رشتہ کمزور ہوجائے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ہندوستان سے اسلام کا جنازہ ہی نکال دیا جائے، مسٹر مینگلس ممبرِ پارلیمنٹ نے دارالعلوم میں اُن دنوں جو تقریر کی تھی وہ انگریزوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی تھی، انھوں نے کہا :

> "خداوندتعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیرِنگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا بلند ہو اور ہندوستان میں اِس سرے سے اُس سرے تک لہرائے، ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت ہندوستان میں عیسائیت پھیلانے کے عظیم الشان کام میں لگا دینی چاہیئے اس میں کسی طرح کا تساہل نہیں ہونا چاہیے ۔"

اسی منصوبے کے تحت دہلی کی شاہجہانی جامع مسجد کو گرجا گھر بنانے کا منصوبہ، پادری فنڈر اور پادریوں کی ہندوستان میں فوج در فوج آمد، جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر مسلمانوں کو چیلنج کرنا، مناظرہ کی دعوت دینا، اسلام کے خلاف دریدہ دہنی کرنا، حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر عیسائی مشنریوں کو مقرر کرنا اسکولوں میں عیسائیت کی تبلیغ کرنا، بہت سے معزز ہندو اور مسلمانوں کا عیسائی ہوجانا، پادریوں کی سفارش پر نوکریوں کا ملنا، کلکتہ کے بڑے پادری ایڈمنڈ کی گشتی چھٹی کا شائع کرنا اور بلا امتیاز ہر ہندوستانی کو بہ جبر و اکراہ عیسائی بنانے پر حکومت کو مجبور کرنا اور مشورہ دینا، انگریزی حکام کو تبلیغِ عیسائیت میں پادریوں کی مدد کرنا، تھانوں کو حکم دینا کہ دیہاتوں اور گاؤں میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے والوں کو تعاون دیں، یہ ساری تگ و دو، پیش بندی، منصوبہ بندی صرف اسلئے تھی کہ مسلمانوں کی مرکزیت جو مذہب کی بنیاد پر ہے وہ ختم ہوجائے، ان کی شیرازہ بندی کرنیوالا رشتہ ٹوٹ جائے اور یہ قوم انتشار کا شکار ہوکر اس کی طاقت فنا ہوجائے، انگریزوں اور عیسائیوں کے آباء و اجداد نے اسپین میں اس کا کامیاب تجربہ کیا تھا، لیکن انگریزی حکومت کی ان تمام کوششوں کا ردِعمل ہندوستان میں اتنا سخت ہوا کہ حکومت مسلمانوں کی حمایت و ہمدردی سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محروم ہوگئی ایک طرف مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی جیسے افراد پیدا ہوئے

جنہوں نے سنگینوں کے سائے میں کھڑے ہوکر میدانِ مناظرہ میں عیسائی پادریوں کو ذلت آمیز شکستیں دیں دوسری طرف پورے ملک میں کسی انگریز افسر کی جان محفوظ نہیں تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ کلکتہ ہائی کورٹ کے جج مسٹر نارمن اور ہندوستان کے وائسرائے لارڈ میو کو گولیاں ماردی گئیں غدر ۱۸۵۷ء کے اصل محرک بھی یہی مذہبی جذبہ ہی تھا جس کو فنا کرنے کی برطانوی حکومت نے حماقت کی تھی، اسکے جواب میں انگریزوں نے ہزاروں علماء اور ممتاز رؤسا و اُمراء کو فرضی الزامات لگا کر یا تو پھانسی پر چڑھا دیا یا کالے پانی بھیج کر ذلت آمیز سزائیں دیں اور اپنے انتقام کی پیاس بجھائی، مگر انگریز اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا اور عیسائیت کا سیلاب اپنے منبع میں سمٹ کر رہ گیا اور ہندوستان کا مسلمان اپنا دین محفوظ و سلامت بچالے گیا۔

دوسرے ہندوستانی کیا کرتے رہے؟

اس تمام دور میں دوسرے برادرانِ وطن خاموشی کے ساتھ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں لگے رہے اور انگریزی حکومت کی نوکریاں حاصل کرتے رہے اور مسلمانوں کی جدوجہدِ آزادی کی مخالفت کرتے رہے تاکہ اپنے افسران اور آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرکے مالی فائدہ حاصل کرلیں جیسا کہ سٹی کالج کلکتہ کے شعبۂ تاریخ کے صدر مسٹر شانتی مے رائے نے اپنی کتاب

ROLE OF INDIAN MUSLIMS IN THE FREEDOM MOVEMENT

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا کردار،، میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے مسلمانوں نے اولاً تو انگریزوں سے انتہائی نفرت کیوجہ سے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی دوسرے جن لوگوں نے تعلیم حاصل کی تو ان پر حکماً نوکریوں کا دروازہ ہی بند کردیا گیا اور ۱۸۷۰ء تک کسی مسلمان کو حکومت میں کوئی ملازمت نہیں دی گئی، دوسرے برادرانِ وطن کیلئے انگریزوں کے لطف وکرم کے دروازے کھلے ہوئے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی کے آخر تک جنگِ آزادی کے میدان میں صرف اکیلا مسلمان رہ گیا۔

آزادی کیلئے نہیں خوشامد کیلئے

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس ضرور قائم ہوگئی تھی لیکن اس کی ابتدا جن جذبات کے ساتھ ہوئی اُسے کوئی غیرت مند ہندوستانی قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوسکتا

چہ جائیکہ مسلمان قوم، جسکے سامنے صرف ایک نصب العین تھا کہ انگریزوں کی غلامی کا جوا اپنے کندھوں سے ہر قیمت پر اتار پھینکے۔

کانگریس پر ابتدائی پچیس برسوں تک رجعت پسندوں کا قبضہ تھا اور وہ انگریزوں کے چشم وابرو کے اشاروں پر چلتے رہے، ان لوگوں کا جنگِ آزادی سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا بلکہ کانگریس کے لوگ برطانوی حکومت کے استحکام پر غور کرنے میں اپنا زیادہ وقت صرف کرتے رہے۔

کانگریس سے بھی کچھ پہلے ۱۸۷۰ء میں بنگال میں انڈین ایسوسی ایشن بن چکی تھی اور ۱۸۸۴ء میں مدراس میں مہاجن سبھا قائم ہو چکی تھی اور ۱۸۹۷ء میں سوامی دویکانند نے بھی ہندوؤں میں مذہبی بیداری پیدا کرنے کا کام شروع کیا تھا لیکن ان تمام تنظیموں کا مقصد حصولِ آزادی کے بجائے اپنے سماجی و معاشرتی چند حقوق کی ملتجیانہ درخواست کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور انیسویں صدی کے آخر تک تو بہرحال ان کی یہی پالیسی رہی۔

کانگریس کیوں قائم ہوئی: اب انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کی داستان بھی سن لیجئے، لارڈ رپن کے زمانے میں ایک بل پاس ہوا جس کی منشا یہ تھی کہ ہندوستانی مجسٹریٹ ہی انگریزوں کے مقدمات بھی طے کیا کریں گے اس بل کو تاریخ میں البرٹ بل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اینگلو انڈین طبقہ کی طرف سے اس بل کی شدید مخالفت ہوئی جس کے نتیجہ میں یہ بل پاس نہ ہو سکا، یہ صورتِ حال دیکھکر ہندوستانیوں کی بعض نیم سیاسی تنظیموں میں بھی کچھ حرکت پیدا ہوئی اور انھوں نے محسوس کیا کہ منظم ہو کر ہر ایسے حکم کے خلاف آواز بلند کیجا سکتی ہے، جو ہماری منشا کے خلاف ہو، ان جذبات کا کہیں کہیں اظہار بھی ہوا، انگریزی حکومت نے اس بیداری کو شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھا اور خطرہ محسوس کیا کہ یہ جذبات کبھی باغیانہ شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں۔

انھیں جذبات و رجحانات کو وفادارانہ جذبات کی طرف موڑ دینے کیلئے مسٹر اے او ہیوم پنشنر سویلین میدان میں آئے اور انھوں نے ۲۸ دسمبر ۱۸۸۴ء کو تھیو سافیکل سوسائٹی کے اجلاس پونا میں کانگریس کے قیام کی تجویز رکھی اور پھر یہ درخواست لیکر اسوقت کے

وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن کے پاس گئے کہ ہندوستانیوں کیلئے وہ اصلاحِ رسوم اور اصلاحِ تمدن کی انجمن قائم کریں، وائسرائے نے کچھ ضروری اور اہم مشورے دیئے اور مسٹر ہیوم مزید صلاح ومشورہ کیلئے انگلینڈ گئے اور واپس آکر کانگریس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۵ء میں بمقام بمبئی منعقد کیا اس اجلاس میں سب سے اہم اور بنیادی تجویز جو پاس ہوئی، اس کا مقصد ہندوستان وانگلستان میں اتحاد ویگانگت پیدا کرنے سے متعلق تھی۔

کانگریس کا مقصد حکومت سے وفاداری

خلاصہ یہ کہ یہ تنظیم برطانوی حکومت کے وفاداروں اور ہواخواہوں نے قائم کی تھی، اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں کسی طرح ایسے خیالات وجذبات کو پنپنے کا موقعہ نہ دیا جائے جو کبھی برطانوی حکومت کیلئے پریشانی کا باعث ہوں، کانگریس کا تعلق حکومت سے اتنا قریبی اور گہرا تھا کہ اس کے بانی مسٹر ہیوم نے وائسرائے سے درخواست کی کہ کانگریس کے اجلاس کی صدارت کوئی انگریز گورنر کرے، حکومت کو مسٹر ہیوم کی اس تجویز سے انکار نہیں تھا لیکن بعض مصلحتوں کی وجہ سے ایسا نہیں کیا گیا۔

کانگریس اپنے قیام کے وقت سے لیکر پچیس سال تک رجعت پرستوں، جاہ پسندوں اور انگریزی حکومت کے کاسہ لیسوں کی مٹھی میں رہی، اسکے اجلاسوں میں ہر تجویز انگریزی حکومت کی بے لوث اور بے لچک وفاداری کی اسپرٹ میں پاس کیجاتی رہی، انگریزی حکومت واقتدار کے خلاف کسی محاذ آرائی کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا، ہندوستان کی آزادی کا تصور بیش منظور کرنے کیلئے ابھی اس کو چالیس پینتالیس سال اور انتظار کرنا تھا اسلئے بیسویں صدی کی سیاسی جنگِ آزادی کی تاریخ لکھتے ہوئے کانگریس کا تذکرہ بے معنیٰ تھا۔

جنگِ آزادی کے میدان میں

جنگِ آزادی کے میدان میں آنے کا ایک ہی مطلب تھا کہ تلوار ہاتھ میں اٹھالی جائے اور کفن سر سے باندھ لیا جائے، انیسویں صدی کے آخر تک ہی نہیں بلکہ بیسویں صدی کے ابتدائی پندرہ برسوں تک انقلاب پسندوں کے سامنے طاقت کے ذریعہ انقلاب لانے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا، دوسرے برادرانِ وطن نے بھی وہی راستہ اختیار کیا جو مسلمانوں نے ہندوستان

ے انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کیلئے اختیار کر رکھا تھا مسلمانوں کے سامنے انقلاب کا راستہ سرحدی قبائل اور افغانستان سے ہوتا ہوا مشرقِ وسطیٰ اور ترکی تک جاتا تھا، برادرانِ وطن کے چند جانبازوں نے دوسرا راستہ بھی پیدا کرنے کی کوشش کی اگرچہ اس راستہ کے انتخاب میں یہ خطرہ بھی تھا کہ کامیابی کے بعد اقتدار کی کرسی پر انگریز کے بجائے اس سے زیادہ طاقتور دشمن بیٹھ جائے اور آقا بدل جائے اور غلامی کا طوق ہماری گردنوں میں پڑا رہ جائے اور جب جنگ کے بادل چھٹ جائیں تو معلوم ہو کہ ہم غلام کے غلام ہی ہیں، لیکن ان نوجوانوں کے مخلصانہ جذبات کی قدر کرنے کے سوا ہمارے پاس کوئی راستہ بھی نہیں ہے، انھوں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر یہ انقلاب کی راہ اختیار کی تھی اس کی داد ہمیں دینی ہی پڑیگی، لیکن اس راہ کی تلاش میں بھی برادرانِ وطن تنہا نہیں تھے، مسلمان ان کے شانہ بہ شانہ تھا اور موثر رول ادا کر رہا تھا

آئینی حدود میں جنگِ آزادی

بیسویں صدی کی جب ابتدا ہوئی تو سیاسی بیداری کی ایک لہر ساتھ ساتھ آئی، آزادی کے ہر طرف چرچے ہونے لگے اور کئی سمتوں سے کام شروع ہوا اور آئینی جنگ کے کچھ نئے راستے بھی سامنے آئے، مشہور ہندو مذہبی مصلح وویکانند کا پیغام بیداری تو ملک کو ۱۸۹۷ء میں مل چکا تھا اور ۱۹۱۲ء تک انھیں کے ذریعہ یہ پیغام ہندوستانیوں کو ملتا رہا ان کے بعد اس تحریک کی قیادت برندر گھوش اور آربندو گھوش کے ہاتھوں میں آئی ان لوگوں نے ملک میں قومی بیداری کیلئے ایک محدود حلقہ میں کام کیا، انکی زیادہ توجہ رفاہی کاموں کی طرف رہی، ۱۹۰۳ء میں تقسیم بنگال کا شاخسانہ سامنے آیا، بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تو اسکے خلاف جلسے ہونے لگے، لاکھوں آدمیوں سے دستخط کراکے حکومت کو درخواست پیش کی گئی، نواب سلیم اللہ آف ڈھاکہ نے تقسیم بنگال کو وحشیانہ تجویز سے تعبیر کیا، بھائی پرمانند بھی اسی دور کے انقلابی لیڈروں میں سے تھے اور انھیں ۱۹۰۰ء میں گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف جب لارڈ کرزن نے سخت الفاظ استعمال کئے تو ۱۱ر مارچ ۱۹۰۵ء کو ہندوستانیوں کے ایک بڑے جلسے میں تجویزِ ملامت پاس کی گئی، اور جب ۵ر جولائی ۱۹۰۵ء کو تقسیم بنگال کا اعلان کر دیا گیا اور ۱۱ر اکتوبر

۱۹۰۵ء سے اس پر عملدرآمد شروع ہوگیا اور برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کی کوئی پروا نہیں کی تو انقلاب پسندوں نے ایک جلسہ میں احتجاج کی تین صورتیں تجویز کیں۔

۱۔ ولایتی مال کا بائیکاٹ

۲۔ سودیشی مال کو رواج دینا۔

۳۔ دہشت انگیزی

تقسیمِ بنگال کے خلاف پرجوش حصہ لینے والوں اور تحریک کی رہنمائی کرنے والوں میں خواجہ عتیق احمد اور نواب امیر حسین خاں کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، تقسیم کے خلاف احتجاج کرنے کیلئے ۲ / اگست ۱۹۰۵ء کو کلکتہ ٹاؤن ہال میں جو زبردست جلسۂ عام ہوا تھا اسمیں تقریر کرنے والوں میں مولوی حسیب الدین بیرسٹر، عبدالرسول، مولوی ابو القاسم، دیدار بخش، دین محمد، مسٹر عبدالغفور، مسٹر لیاقت حسین، اسمٰعیل سراج اور عبدالرحیم غزنوی کے نام نمایاں ہیں ان میں سے کئی ایک کو تقریر کی بنیاد پر گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا اور دوسرے لوگوں پر پولیس نے سختیاں کیں۔

تقسیم بنگال کے نام پر عوامی بیداری پیدا کرنے میں اور بالخصوص طلبہ میں جوش وجذبہ بڑھانے میں مسٹر عبدالودود اور مسٹر یوسف جیلانی کے نام سرِفہرست ہیں انھوں نے اپنے کام کا آغاز برہم پور کے جلسۂ عام سے کیا اور تحریک کو آگے بڑھانے میں بھرپور حصہ بھی لیا، بنگال کی اس عام سیاسی بیداری میں مولانا ابوالکلام آزاد کا زبردست ہاتھ تھا کیونکہ وہ کلکتہ ہی میں رہتے تھے اور تمام تر سیاسی سرگرمیوں کا مرکز کلکتہ ہی تھا۔ بنگال کی انقلابی سرگرمیوں میں مولانا آزاد کے ساتھ مولانا اکرم خان (پبنہ) اسمٰعیل سراج (میمن سنگھ) غیاث الدین (ناگری) مولانا پھولپوری، چندو میاں (کومیلہ) اور شرف الدین احمد کے نام جلی حروف میں لکھے ہوئے ہیں۔

کارواں منزل بہ منزل

اب ہندوستان کے سیاسی کلنڈر میں ۱۹۰۷ء آگیا اس سال لالہ لاجپت رائے اور اجیت سنگھ کو برطانوی حکومت نے ہندوستان سے جلاوطن کردیا ۱۹۰۸ء میں ۱۱ / اپریل کو مظفرپور میں بہار کے جج کنگسفورڈ پر بم پھینکا گیا، مگر وہ بچ گئے، اور دو انگریز عورتیں جو ان کے ساتھ گاڑی میں تھیں مر گئیں

اسی ۱۹۰۸ء میں انقلاب پسندوں پر بنارس میں سازش کیس چلایا گیا۔ اخبارات پر پابندیاں عائد کی گئیں اور کئی اخبارات کی ضمانتیں ضبط کر لی گئیں، اسی سال برما میں بھی کچھ لوگوں پر سازش و بغاوت کے مقدمات چلائے گئے، اسی سال کچھ بنگالیوں نے مدراس میں اپنی سرگرمیاں شروع کیں۔ بمبئی کے مرہٹوں نے بنگالیوں کی امداد کی تو بمبئی میں شورش بڑھ گئی، سری نواس آئنگر کا اخبار "انڈیا" اسی سال ضبط ہوا اور آئنگر جیل گئے۔

لڑاؤ اور حکومت کرو

ایک طرف ہندوستان کی سیاسی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں دوسری طرف برطانوی حکومت ایک نئی چال چلنے کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے غور و فکر کر رہی تھی اور پورے انہماک کے ساتھ ہندوستان کی بساطِ سیاست پر مہرہ بٹھانے کے کام میں مصروف تھی، اسکے نزدیک سب سے خطرناک ہندو مسلم اتحاد تھا، اس نے دیکھا کہ تشدد پسند مسلمانوں کی طرح ہندوؤں میں بھی ایسے جیالے جوان پیدا ہوتے جا رہے ہیں جو اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھ کر میدان میں آگئے ہیں اور طاقت و تشدد کے استعمال سے گریز نہیں کرتے، مسٹر رانڈ اور لفٹننٹ ایریسٹ کا بمبئی میں مرہٹوں کے ہاتھوں قتل، مظفرپور بہار میں جج پر قاتلانہ حملہ، پرجوش مسلمانوں کے بجائے ہندوؤں نے کیا اسلئے ۱۹۰۰ء میں انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج پیدا کرنے کیلئے یکے بعد دیگرے کئی کارروائیاں کیں۔ اسی سال مسٹر اینٹونی میکڈانل لفٹننٹ گورنر یوپی نے حکم جاری کیا کہ عدالتوں اور کچہریوں میں ہندی رسم الخط میں لکھی ہوئی درخواستیں اب لی جا سکیں گی، اس حکم پر ہندو حلقوں میں اظہارِ مسرت کیا گیا اور جلسے کر کے شکریہ کی تجویز پاس کی گئی اور گورنر کی خدمت میں پیش کی گئی۔

دوسری طرف ۱۹۰۳ء میں تقسیمِ بنگال کا شوشہ چھوڑ کر مسلمانوں سے کہا گیا کہ ہم ایک ایسا صوبہ بنانا چاہتے ہیں جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور اس صوبے میں مسلمانوں کو سیاسی بالادستی حاصل ہو، ان دونوں واقعات نے دونوں طبقوں پر الگ الگ اثرات ڈالے اور ہر ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہو گئی اور بتدریج دونوں فرقوں میں دوری بڑھتی چلی گئی اور انگریزوں کا یہی مقصد تھا، دونوں کے دلوں میں ایکدوسرے کے خلاف میل آ گیا۔

اسی طرح مسٹر آرچیبالڈ کے ذریعہ مسلم لیگ کے قیام کیلئے ۱۹۰۶ء سے زمین ہموار

کی جارہی تھی اور شملہ ڈیپوٹیشن کو شرفِ باریابی بخش کر مسلم لیگ کے قیام کا راستہ آسان کر دیا گیا اور پھر مسلمان کی جنگ کا رخ جو انگریزی حکومت کی طرف تھا مسلم لیگ کے ذریعہ اس کو ہندوؤں کی طرف پھیر دینے کی سازش کی گئی، اس طرح ہندو مسلم چپقلش بڑھانے کے لئے کئی شوشے چھوڑے گئے، یہ چپقلش ۱۹۱۶ء میں شباب پر پہونچ گئی اور بات بالآخر کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ایک معاہدہ پر جاکر ٹھہری جو میثاقِ لکھنؤ کے نام سے تاریخوں میں مشہور ہے۔

بیرونِ ہند آزادئ ملک کے لئے جدوجہد

بیسویں صدی کے آغاز ہی سے ملک میں کچھ سیاسی ہلچل سی نظر آنے لگی ــــ ہندوستانیوں کی غیرت وحمیت نے کروٹ لینی شروع کی لیکن انیسویں صدی کی آخری دہائی تک حکومت پر نکتہ چینی تک کرنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی اس طرح اندرونِ ملک سیاسی میدان میں ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن ہندوستان کی سرحد پر اب بھی تلواروں کی جھنکاریں رہ رہ کر سنائی دے جاتی تھیں مسلمان مجاہدین نے اپنا خون بہاکر ہندوستان کی غیرت وحمیت کی لاج رکھی تھی، اگرچہ انکی تعداد اتنی نہیں تھی کہ انگریزی حکومت کو ان سے کوئی خاص خطرہ ہوتا، لیکن مجاہدین کا وجود آزادی کا نشان تھا کیونکہ وہ انگریزی تسلط سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے علمبردار تھے، ان کی جدوجہد حریت طلب ہندوستانیوں کیلئے مہمیز تھی، انگریزوں کے نزدیک آزادی کی اس تحریک کو دبانے کیلئے وقت کا تقاضا تھا کہ زیادہ سے زیادہ فوجی طاقت کے بل بوتے پر ان کے وجود کو فنا کردیں، لیکن یہ ان کے بس کی بات نہ تھی، مجاہدین خاموش بیٹھے نہیں تھے وہ قبائل کو منظم کرتے تھے اور انگریزوں کے خلاف ان کو محاذ پر کھڑا بھی کر دیتے تھے اسلئے انکی غیر مرتب فوج ہمیشہ برسرِ پیکار رہتی تھی اسی وجہ سے تقریباً پچھتر سال سے انگریزوں کو کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔

مجاہدینِ سرحد کی سرگرمیاں

۱۸۹۸ء میں انگریزوں سے ایک گھمسان کی جنگ ہوئی، مجاہدین نے بڑی جانبازی سے مقابلہ کیا لیکن انگریزوں کی توپوں نے مجاہدین کو پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کردیا، پندرہ مجاہدین دو ہزار انگریزی لشکر سے نبرد آزما تھے جس میں توپیں بھی تھیں اور دوسرے آتش بار اسلحہ بھی . . .

سید عبدالجبار شاہ جو اس جنگ میں بذاتِ خود شریک تھے ان کا اپنا بیان ہے کہ :

"پچاس ساٹھ سے زائد سوار انگریزوں کی لاشیں اٹھانے جانے میں مارے گئے، جو مجھ سے ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر تھے اس موقعہ پر ہمارا ایک نشانچی مارا گیا، باقی سب لوگ اس گھمسان سے سلامت نکل آئے جن میں ایک میں بھی تھا۔"

سید عبدالجبار یہ بھی لکھتے ہیں کہ انگریزوں نے اپنے مقتول سپاہیوں کی تعداد کم بتائی ہے ایک رپورٹ اور دیکھئے جس سے اندازہ ہوگا کہ سرحد میں مجاہدینِ آزادی نے انگریزوں کو کس طرح پریشانیوں میں مبتلا کر رکھا تھا اور آزادی کے چراغ جلائے رکھنے کیلئے اپنا خون دیکر کتنی بڑی قربانیاں دی ہیں، ایک بلیٹین کی نقل غلام رسول مہر کی کتاب سرگذشتِ مجاہدین سے پیش کر رہا ہوں اس یادداشت کے چند ٹکڑے حسب ذیل ہیں :

۱ - ۵ ر شوال ۱۳۳۳ھ (۱۶ راگست ۱۹۱۵ء) کو مجاہدین ہندوستانی سرحدِ برطانیہ میں گھس گئے اور ایک پہاڑی پر مورچہ بندی کرکے مقیم ہو گئے یہ پہاڑی موضع سرخوئی سے ایک میل کے قریب واقع ہے اور تیرہ میل سلطنتِ برطانیہ کے اندر ہے، اس مقام سے قلعہ رستم اور کیمپ آٹھ میل پر ہے اور دونوں کو نظر آتے ہیں۔

۹ ر شوال ۱۳۳۳ھ (۲۰ راگست ۱۹۱۵ء) کی شب میں مجاہدین نے کیمپ رستم پر حملہ کیا، انگریزی کیمپ سے برابر مدافعانہ توپوں اور بندوقوں کے فیر ہوتے رہے، رستم کے باشندوں نے خبر دی ہے کہ برطانیہ کے زخمی سولہ ڈولیوں میں مردان روانہ کیے گئے، گھوڑوں، اونٹوں اور خچروں کا بہت نقصان ہوا ۱۱ ر شوال ۱۳۳۳ھ (۲۲ راگست ۱۹۱۵ء) کی شب میں مجاہدین نے پھر حملہ کیا مدافعت میں بہت سرگرمی سے توپیں اور بندوقیں تمام رات چلتی رہیں رستم کے باشندوں کی زبانی معلوم ہوا کہ چالیس ڈولیاں انگریزی فوج کے زخمیوں کی مردان بھیجی گئیں۔

۱۳ر شوال ۱۳۳۳ھ (۲۴ر اگست ۱۹۱۵ء) کی شب میں مجاہدین نے پھر حملہ کیا اور چاہا کہ کیمپ میں گھس جائیں لیکن چاروں طرف خاردار تاروں کا جنگلہ لگا ہوا تھا اور خندقیں کھودی گئی تھیں اس رات کی جنگ میں ایک انگریز افسر مارا گیا۔

۱۴ر شوال ۱۳۳۳ھ (۲۵ر اگست ۱۹۱۵ء) تمام رات بارش ہوتی رہی نو بجے دن میں برطانیہ نے پانچ ہزار فوج، دو رسالوں اور ۲۱ توپوں کے ساتھ اچانک تین جانب سے مجاہدین پر حملہ کیا، مجاہدین نے جانبین کی پہاڑیاں پکڑ لیں اور گولہ باری ہونے لگی نو بجے دن سے دوسرے دن صبح کے چار بج گئے، آخر میں ایک انگریز کرنل مارا گیا انگریزی فوج قلعہ رستم میں پناہ گزیں ہو گئی، اس جنگ میں مجاہدین میں سے اسّی شہید ہوئے اور چھ زخمی ہوئے، اس جنگ میں مقامی لوگ شامل نہیں تھے صرف ہندوستانی مجاہدین شریک تھے۔"

جدوجہد کے دوسرے راستے

میں نے سرحد کی جنگ کا ایک دھندلا سا منظر آپ کو صرف اسلئے دکھایا ہے تاکہ آپکے ذہن میں یہ بات تازہ رہے کہ ہندوستان کی مغربی سرحد پر آزاد قبائل اور یاغستان میں ہندوستانی مجاہدین کی جدوجہد کا جو سلسلہ ۱۸۲۶ء سے شروع ہوا تھا وہ بلا فصل بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں تک برابر جاری رہا۔ مجاہدین کبھی خاموش نہیں بیٹھے رہے اور ہندوستان میں برطانوی حکومت و اقتدار کیلئے ہمیشہ دردِ سر بنے رہے اپنی زندگیاں تباہ کیں، اپنا وطن، اپنا خاندان چھوڑا، ہمہ وقت موت کے منہ میں رہ کر آزادی کے چراغ کو اپنے خون سے جلائے رکھا انھیں مجاہدانہ سرگرمیوں کیوجہ سے حوصلہ ملا اور شیخ الہند کی ریشمی رومال کی تحریک چلائی گئی جس کی ایک ہزار صفحات کی فائل آج بھی برٹش میوزم میں ہماری داستان سنانے کیلئے موجود ہے یہ تو ہندوستان کے مغربی محاذ پر ہو رہا تھا اسکے علاوہ ہندوستانیوں نے جدوجہد کی اور راہیں بھی تلاش کر لی تھیں تاریخ ہمارے سامنے ایسے بیا دردنکی سرگرمیوں کی تفصیل بیان کرتی ہے۔

پیشقدمی کی نئی راہیں

انگریزوں کی چیرہ دستی اور ان کے نادرشاہی مظالم سے تنگ آکر کچھ سر پھرے آزادی کے دیوانے طاقت کے استعمال کے اور راستے ڈھونڈتے پھر رہے تھے، انیسویں صدی کے آخر ہی سے بہت سے ہندوستانی جوانوں نے از خود جلاوطنی اختیار کرلی تھی تاکہ مادرِ ہند کی جو بھی خدمت ممکن ہو کرسکیں اور ہندوستان سے باہر رہ کر کئی ملکوں میں انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد شروع کردی تھی اس سلسلہ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مختلف مقامات پر ایسی انجمنیں قائم کی گئی تھیں جکے ارکان ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کا حلف نامہ دہراتے تھے، اس طرح کی تحریک اور جدوجہد میں اولیت کا سہرا لالہ ہردیال کے سر ہے جو پہلے دہلی میں پڑھتا تھا پھر لاہور چلا گیا پھر وہاں سے سرکاری وظیفہ پر باہر چلا گیا اس کے دو خاص ساتھیوں میں سے ایک مولوی برکت اللہ بھوپالی بھی تھے جو بھوپال کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے وہ ڈاکٹر برکت اللہ کہے جاتے تھے انھوں نے "غدر" نام سے ایک باغیانہ اخبار نکالا تھا جس کا پہلا پرچہ یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو شائع ہوا تھا یہ اخبار بڑی تعداد میں خفیہ طور پر ہندوستان میں تقسیم کیا جاتا تھا، اخبار میں اشتعال انگیز اور جذبات کو بھڑکانے والے مضامین شائع ہوتے تھے اور ہندوستانیوں کو اخبار میں مشورہ دیا جاتا تھا کہ وہ خفیہ انجمنیں قائم کر کے انڈرگراؤنڈ سیاسی سرگرمیوں کو جاری کریں۔

ڈاکٹر برکت اللہ اس اخبار کے علاوہ موقعہ بہ موقعہ پمفلٹ اور کتابچے بھی شائع کرتے رہتے تھے، ایک مرتبہ "غدر" کے نام سے اشتعال انگیز اور باغیانہ نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا اس مجموعہ کی نظموں میں انگریزوں کے خلاف جذبات کو مشتعل کیا گیا تھا اور آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا۔

یہ خفیہ انجمنیں امریکہ، ملایائن، ملایا، ہانگ کانگ، سنگاپور، چین، مصر، ترکی، جرمنی اور افغانستان میں پھیلی ہوئی تھیں، ان انجمنوں میں ہندو مسلمان اور سکھ سبھی شامل تھے، ان تنظیموں کی پشت پر ترکی اور جرمنی تھے، مختلف جہازوں سے ہندوستان میں رائفلیں، بندوقیں اور گولہ و بارود اور نقد روپیہ پہونچانے کی کوشش بھی کیجاتی رہی اگرچہ اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

اخبار "غدر" کی طرح ایک دوسرا اخبار "جہانِ اسلام" مئی ۱۹۱۴ء میں قسطنطنیہ سے جاری کیا گیا اس کو بھی ہندوستانی مجاہدینِ آزادی نکال رہے تھے، اس میں عربی، ترکی، اردو اور ہندی میں مضامین شائع ہوتے تھے، اس کا اردو حصہ متحدہ پنجاب کا ایک مسلمان جوان ابو سعید لکھتا تھا اور مرتب کرتا تھا، اس اخبار میں نیشنلسٹ لیڈروں فریدبے اور صفدر عزت، کے بھی مضامین برطانیہ کے خلاف شائع ہوتے تھے ۲ رنومبر ۱۹۱۴ء کی اشاعت میں انور پاشا وزیرِ جنگ ترکی حکومت کی ایک تقریر کی رپورٹنگ کی گئی تھی جس میں اور دوسری باتوں کے علاوہ انور پاشا نے کہا تھا کہ:

> "ہندوستان میں غدر برپا کیا جائے انگریزی اسلحہ خانوں کو تاخت وتاراج کرکے اسلحہ لوٹ لیا جائے اور انھیں ہتھیاروں سے انگریزوں کو مار ڈالا جائے ہندوستان میں ۳۲ کروڑ ہندوستانی ہیں اور صرف دو لاکھ انگریز۔ ان سب کو قتل کردینا چاہیے، اسکے پاس فوج بالکل نہیں ہے، جو لوگ اپنے ملک، اپنے وطن کو آزاد کرانے کی کوششوں میں جان دیں گے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔
>
> اے ہندوؤ! اے مسلمانو! تم آپس میں بھائی بھائی ہو نیچ اور کمینے انگریز تمہارے دشمن ہیں، تم جہاد کا اعلان کرکے غازی بنجاؤ اور اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر انگریزوں کو قتل کردو، اور ہندوستان کو نجات دلادو۔"

انجمن انقلابِ ہند

برلن میں بھی ۱۹۰۵ء میں آزادی کی لڑائی لڑنے والوں نے "انجمنِ انقلابِ ہند" کے نام سے ایک تنظیم بنائی تھی، اسکے بانیوں میں برادرانِ وطن کے علاوہ مسلمان مجاہدینِ آزادی میں سید مجتبیٰ حسین، علی احمد صدیقی، حکیم فہم علی اور حسن خان کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں جمہوری حکومت قائم ہو، اسکے جلسے ہوتے تھے جن میں ترک، جرمنی اور روسی افسران بھی شریک ہوتے تھے، ان جلسوں میں جرمنی اور ہندوستان کے مشترکہ مقاصد پر بھی

بحث ہوتی تھی، ان جلسوں کی ہماہمی اور مسلسل سرگرمیوں کے نتیجہ میں جب جنگِ عظیم شباب پر تھی فروری ۱۹۱۵ء کی ایک تاریخ مقرر کی گئی تھی کہ ہندوستان کے اہم مقامات اور چھاونیوں پر حملہ کر دیا جائے اس کیلئے جرمنی سے اسلحہ اور گولہ بارود اور نقد روپیہ ہندوستان پہونچانے کا بھی بندوبست تھا اور ہندوستان میں اس کی تقسیم کے ذمہ داروں کو بھی متعین کر دیا گیا تھا، مگر ہندوستان کی قسمت میں ابھی غلامی کے بہت دن مقرر تھے اسلئے بروقت اسلحہ کی عدمِ فراہمی کی وجہ سے وقتِ مقررہ پر بغاوت نہ ہوسکی اور اسکیم فیل ہوگئی، انگریزوں کو اس سازش کا علم ہوگیا اور انھوں نے خطرہ کا سدِ باب کرلیا اور ان تمام مقامات پر پہرہ لگا دیا گیا جہاں اسلحہ سے بھرے ہوئے جرمنی کے جہاز لنگر انداز ہونے والے تھے اور وہ چمن ہی لٹ گیا جس میں بہار آنے کو تھی۔"

بغاوت ہی بغاوت

آزادی کی جنگ سرحدی قبائل اور یاغستان میں ایک طرف لڑی جارہی تھی دوسری طرف جرمنی میں ہندوستانیوں کی انجمنیں اپنے اپنے طور پر اس جنگ کو جاری رکھے ہوئے تھیں، امریکہ، ترکی اور قسطنطنیہ میں جنگِ آزادی کے جیالے نوجوان سکونت پذیر ہوکر ہندوستان کی آزادی کیلئے شب و روز جدوجہد کرتے رہتے تھے، اس طرح آزادی کی لڑائی مختلف محاذوں پر لڑی جارہی تھی مگران سیاسی جنگوں اور آزادی کی ان تحریکوں کی کوئی شیرازہ بندی نہیں تھی اور نہ کوئی مرکزیت تھی مگرانگریزوں سے نفرت اور برطانوی حکومت سے بے اطمینانی عام تھی، اسلئے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں انقلابی سرگرمیاں اپنے اپنے دائرے میں موجود تھیں اور کہیں کہیں جذبات ایک دم مشتعل ہوجاتے تھے تو کھلی بغاوت تک بات پہونچ جاتی تھی، بنگال اس معاملہ میں سب سے آگے تھا، یہاں زیرِزمین سرگرمیاں اور متشددانہ کارروائیاں برابر جاری تھیں اور بنگال کی ان جرأتمندانہ سرگرمیوں کے اثرات دور دور تک پہونچتے تھے اور دوسرے صوبوں میں بنگال کے نقشِ قدم پر چلنے والے میدان میں آتے جارہے تھے اور سب سے زیادہ امید افزا رجحان یہ تھا کہ فوج میں بددلی اور بغاوت کی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔

جنوری ۱۹۱۵ء میں بلوچ رجمنٹ نے رنگون، بنکاک اور سنگاپور میں بیک وقت

بغاوت کر دی اسی طرح ایک مہینہ بعد فروری ۱۹۱۵ء میں لائٹ انفنٹری کے جوانوں نے سنگاپور میں زبردست بغاوت پھیلادی، یہ دونوں فوجیں خالص مسلمان نوجوانوں پر مشتمل تھیں اگرچہ ان فوجی جوانوں کو اس کا بہت تلخ خمیازہ بھگتنا پڑا، باغی سپاہیوں کا کورٹ مارشل ہوا، اور ان کو گولیاں ماردی گئیں، تختہ دار پر چڑھایا گیا اور دوسری کڑی سے کڑی سزائیں دی گئیں لیکن آزادی کا نشہ وہ نہیں ہے جسے تکالیف و مصائب کی ترشی اُتار دے۔

مارچ ۱۹۱۵ء میں [illegible]ل اللہ خان، امتیاز علی خان اور رکن الدین تینوں پر بغاوت کا مقدمہ چلا اور ان میں سے ہر ایک کو سزائے موت دی گئی، ہمدردوں نے ان جوانوں سے کہا کہ رحم کی درخواست دیدیں تو انھوں نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ وطن کی عزت کیلئے ہم موت سے نہیں ڈرتے ہم اپنے پاک جذبے کی قیمت رحم کی درخواست دیکر کم نہیں کرسکتے اور خوشی خوشی پھانسی کے تختے پر چڑھ گئے۔

اسی طرح مارچ ۱۹۱۵ء میں این، سی، اُو نے سنگاپور میں ایک بار اور بغاوت کردی اس بغاوت کی پاداش میں حوالدار سلیمان، نائک منشی خان، نائک جعفر علی خان اور عبدالرزاق خان کو پھانسی کی سزا دی گئی اور انھوں نے مادرِ وطن پر اپنی جانیں نثار کردیں، جون ۱۹۱۵ء میں ایک اور مسلمان نوجوان اسمٰعیل منصور کو باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے تختہ دار پر چڑھایا گیا ۱۹۱۷ء میں مشہور مانڈلے سازش کیس چلایا گیا جسکے ملزمان میں مجتبیٰ حسین (جے پور) اور علی احمد (فیض آباد) کو موت کی سزا دی گئی، ۱۹۲۰ء میں ماسٹر علیم الدین نے کھاجن داس، سریندر بردھان کرشن رادھیکا رائے کو لیکر ایک انقلابی پارٹی بنائی تھی جو خفیہ طور پر بنگال میں کام کرتی تھی اور افسروں کا ناطقہ بند کئے ہوئے تھی۔

بنگال میں انقلاب کے پیامبر

بنگال میں مظفر احمد اور نذر الحفیظ نے انقلاب کی آواز بلند کی اُن کے ساتھیوں میں محمد قطب الدین اور عبدالحلیم بھی تھے ان سب کو ان کی سیاسی و انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں بار بار جیل جانا پڑا اور لمبی لمبی سزائیں کاٹنی پڑیں، جوگندر پارٹی جو بنگال کی ایک انقلابی پارٹی تھی اس کے رہنماؤں میں مقصود الدین سب سے مشہور اور جری تھے ان کے علاوہ مولوی غیاث الدین اور نصیر الدین،

ان کی لڑکی رضیہ خاتون، عبد القادر جاپوری کا نام بھی ان انقلابیوں کی فہرست میں شامل تھا، ان میں سے ہر ایک کو برطانوی حکومت نے کڑی سے کڑی سزائیں دیں اور عرصے تک جیلو نمیں بند رکھا لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی، انھیں انقلابیوں کے ساتھیوں میں ولی نواز، محمد اسمٰعیل، چندو میاں اور آفتاب علی کے نام آتے ہیں پولیس ہمیشہ ان لوگوں کے پیچھے پڑی رہتی تھی مگر وہ انقلابی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔

سراج الحق، حمید الحق (ہگلی)، ڈاکٹر فضل القادر (ڈوگرا)، اور ان کے کئی اور ساتھیوں پر پہاڑی ڈکیتی کیس، سرکاری خزانے پر حملہ کرنے کی وجہ سے چلایا گیا اس مقدمہ میں ہر ایک کو طویل المیعاد قیدِ سخت کی سزائیں دی گئیں، عبد المومن، بپن گنگولی اور ان کے ساتھیوں کی باغیانہ سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتا رہا اور عرصہ تک جیل کاٹی، مسلمانوں کے سینوں میں جرأت دبیا کی کے ساتھ آزادئ وطن کی تڑپ تھی اسلئے وہ کسی خطرہ کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور نہ کسی خطرناک اقدام سے بچنے اور محتاط رہنے کی ضرورت سمجھتے تھے۔ ہندو انقلابی جوان جن کے پیچھے دن رات پولیس لگی رہتی تھی ان میں سے اکثر مسلمانوں کے گھروں میں پناہ لیتے تھے، کیونکہ انکو اطمینان تھا کہ ہم یہاں محفوظ ہیں، امبیکا چکرورتی عرصہ تک ایک مسلمان کسان کے گھر میں چھپے رہے اننتا سنگھ کو جب پولیس نے گھیرے میں لینا چاہا تو مسلمان جوانوں نے انکو کچھ دنوں تک اپنے گھروں میں چھپائے رکھا اور پھر موقعہ پاکر ایک دن انکو کلکتہ پہونچا دیا جہاں وہ جانا چاہتے تھے ——— سورجا سین مشہور انقلابی لیڈر ایک مسلم محلہ میں چھپے ہوئے تھے، پولیس نے انکو گرفتار کرکے بڑی بے رحمی سے پیٹا کہ سارا بدن لہولہان ہو گیا، یہ ظلم دیکھ کر سیکڑوں مسلمانوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، آج تک سورجا سین کے اس واقعہ کو لوگ چاٹگام کے گاؤں میں دہراتے ہیں۔

اسی طرح ہندو انقلابی لیڈروں میں کلپنا دت اور تارا کیشور اور انکے ساتھی جب پولیس سے تنگ آجاتے تھے تو چاٹگام کے مسلمان کسانوں کے گھروں میں پناہ لیتے تھے، پشاور میں کمیونسٹوں پر جو سازش کیس چلا تھا اس میں بھی سب کے سب مسلمان ہی تھے جن میں سے ہر ایک کو لمبی لمبی سزائیں دی گئیں اور جیلوں میں ان پر سختیاں کی گئیں۔

شمعِ آزادی کے پروانے

۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۷ء

ڈاکٹر برکت اللہ بھوپالی۔

ڈاکٹر برکت اللہ بھوپالی اصلاً فتح پور کے باشندے تھے، بہ سلسلۂ تعلیم بھوپال گئے اسلئے بھوپالی مشہور ہوئے، خود بھی اپنے آپ کو بھوپالی لکھتے تھے، قرآن مجید اور صحاحِ ستہ کے حافظ اور باقاعدہ عالم و فاضل تھے، دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بمبئی میں میٹرک تک انگریزی پڑھی پھر تبلیغِ اسلام کے جوش میں انگلستان چلے گئے وہاں سے امریکہ پہونچے، ٹوکیو (جاپان) کی یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر رہے، یہیں سے مولانا برکت اللہ سے ڈاکٹر برکت اللہ ہوگئے ہر جگہ تبلیغِ اسلام، مسلمانوں کی تنظیم اور آزادیٔ وطن کیلئے کوشاں رہتے تھے، امیر حبیب اللہ خان بادشاہِ افغانستان نے انھیں بہ اصرار اپنے پاس رکھا، پھر روس چلے گئے، لینن ان کی بڑی عزت کرتا تھا، وہاں سے جرمنی، فرانس اور سوئزرلینڈ میں قیام کرتے ہوئے آخر میں کیلی فورنیا گئے اور وہیں وفات پائی۔

بیرونِ ہند آزادی کی جد وجہد کرنے والے مشہور لیڈر تھے، نیویارک، پیرس، ٹوکیو، زیورچ، کابل، ماسکو میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور ہندوستان کی آزادی کے لئے جد وجہد کرتے رہے؛ لالہ ہردیال ان کے دوستوں میں تھا یکم نومبر ۱۹۱۳ء میں امریکہ سے ایک اخبار "غدر" کے نام سے جاری کیا جو بڑی تعداد میں ہندوستان آتا تھا اور خفیہ طور پر تقسیم کیا جاتا تھا، جنگِ عظیم میں ترکی کی شکست کے بعد ہرات ہوتے ہوئے روس چلے گئے اور ماسکو میں غریب الوطنی کی زندگی گذاری، ۱۹۲۷ء میں کیلی فورنیا میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے ان کی دلی تمنا تھی کہ ہندوستان کی سرزمین میں دفن ہوں مگر ان کی قسمت میں یہ بھی نہ تھا۔

ابوسعید ۔

پنجاب کے ۱۵ طلبہ نے جو مختلف کالجوں میں پڑھتے تھے ہجرت کی تحریک میں حصہ لے کر ہندوستان چھوڑ دیا تھا انھیں میں ابوسعید بھی تھے، یہ ترکی فوج میں شامل ہوکر انگریزوں سے ہونیوالی جنگ میں شریک ہونے کی دل میں تمنا رکھتے تھے مگر یہ تمنا پوری نہیں ہوئی، یہ لاہور کے ایک کالج میں پڑھتے تھے اور پنجاب کے رہنے والے تھے جن دنوں مولانا برکت اللہ بھوپالی نے امریکہ سے اخبار "غدر" جاری کیا تھا اسی طرح کا ایک اخبار "جہانِ اسلام" کے نام سے مئی ۱۹۱۴ء میں قسطنطنیہ سے نکلا تھا اخبار کئی زبانوں میں شائع ہوتا تھا، اس کے اُردو حصہ کی ترتیب ان کے ذمہ تھی اخبار میں ہندوستانیوں کو برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جاتا تھا اور بڑے پرجوش مضامین شائع کئے جاتے تھے اس میں ترکی اور مصری لیڈروں اور فوجی جرنیلوں کے بیانات ہندوستان کی آزادی سے متعلق شائع ہوتے تھے ۔

عبدالرحمٰن خان ۔

سنگاپور لائٹ انفنٹری کے سپاہی تھے، رنگون میں بلوچ رجمنٹ نے جنوری ۱۹۱۵ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی، بغاوت پھیلانے والے لیڈر سپاہیوں کو پھانسی دی گئی تھی، حکومت کے اس انتقامی کارروائی کی خبر جب سنگاپور پہونچی تو لائٹ انفنٹری کے سپاہیوں نے بھی اپنے بھائیوں کی ہمدردی اور آزادئ وطن کے جذبے سے بغاوت کر دی، بغاوت کرنے والوں میں عبدالرحمٰن خاں بھی شامل تھے گرفتار کیے گئے اور کورٹ مارشل ہوا، پھانسی کی سزا تجویز ہوئی اور دار پر چڑھائے گئے ۔

حیدر سلیمان ۔

یہ بھی لائٹ انفنٹری سنگاپور کے سپاہیوں میں سے تھے یہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ بغاوت میں شریک تھے، کورٹ مارشل ہوا پھانسی کی سزا ہوئی اور پھانسی دیدی گئی ۔

امتیاز علی ۔

یہ بھی لائٹ انفنٹری سنگاپور کے باغی سپاہیوں میں سے تھے۔ بغاوت پھیلانے کے جرم میں ماخوذ ہوئے کورٹ مارشل ہوا، پھانسی کی سزا کا فیصلہ ہوا اور پھانسی دیدی گئی ۔

قاسم اسمٰعیل خان۔

لائٹ انفنٹری سنگاپور کے باغی سپاہیوں میں سے تھے، بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہوئے فوجی عدالت نے پھانسی کا حکم دیا اور وطن پر قربان ہوگئے۔

رسول اللہ خان۔

یہ بھی لائٹ انفنٹری سنگاپور کے باغی سپاہی تھے اور بغاوت کرنے والوں کے لیڈر تھے بغاوت پھیلانے کے جرم میں فوجی عدالت سے پھانسی کا حکم ہوا اور تختۂ دار پر چڑھائے گئے۔

نیک مسیح خان۔

سنگاپور لائٹ انفنٹری کے سپاہی تھے باغیوں میں ان کا بھی شمار تھا فوجی عدالت نے مجرم قرار دیا اور عدالت کے حکم سے پھانسی پر چڑھائے گئے۔

رکن الدین خان۔

رکن الدین خان باغی سپاہیوں میں سے تھے بلکہ پولیس میں جن لوگوں نے بغاوت کے جذبات پیدا کئے ان لوگوں میں یہ شامل تھے کورٹ مارشل ہوا اور پھانسی کا حکم ہوا، پھانسی دی گئی۔

ظفر علی خان۔

لائٹ انفنٹری کے باغی سپاہیوں میں سے تھے، بغاوت کا جرم ثابت ہونے پر فوجی عدالت نے پھانسی کا حکم دیا اور پھانسی پر چڑھا دیئے گئے۔

علی احمد۔

فیض آباد (یوپی) کے رہنے والے تھے، مانڈلے میں رہتے تھے اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے، ۱۹۱۷ء میں کئی سیاسی کارکنوں کو گرفتار کیا گیا اور ان پر سازش و بغاوت پھیلانے کا الزام لگایا گیا اور مقدمہ عدالت میں گیا جس کو تاریخ میں "مانڈلے سازش کیس" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس مقدمہ کے ملزمان میں علی احمد فیض آبادی بھی شامل تھے عدالت نے پھانسی کا فیصلہ سنایا اور علی احمد کو پھانسی دیدی گئی۔

مجتبیٰ حسین۔

مجتبیٰ حسین جے پور کے رہنے والے تھے، مانڈلے میں سکونت پذیر تھے، سرگرم سیاست

میں حصہ لیتے تھے ۱۹۱۷ء کے۔ مانڈلے سازش کیس "کے ملزمان میں شامل تھے مقدمہ میں پھانسی کی سزا دیئے جانے کا فیصلہ ہوا اور شمعِ آزادی پر پروانہ وار نثار ہو گئے۔
علی احمد اور مجتبیٰ حسین کے مقدمہ کی پیروی کرنے والے ہمدردوں نے کہا کہ رحم کی درخواست دیدی جائے مگر ان دونوں بہادروں کی غیرت نے گوارا نہیں کیا اور صاف کہدیا کہ عزت کے ساتھ اپنے وطن کی آزادی کیلئے جان دیدینا غلامی کی ذلیل زندگی سے بہتر ہے ہم رحم کی درخواست دے کر اپنے پاک جذبے کی توہین نہیں کر سکتے اور بادر وطن کی آزادی پر قربان ہو کر مسلمان مجاہدینِ آزادی کے دلوں کو حوصلہ دیا اور بعد میں آنے والی نسلوں کو سرخرو ہونے کا موقعہ دیا اور اپنے ایثار اور قربانی سے ایک مثال قائم کر گئے۔

عبدالرسول بیرسٹر۔

۷ راگست ۱۹۰۵ء کو تقسیم بنگال کی تجویز کے خلاف احتجاج میں کلکتہ ٹاؤن ہال میں جلسہ ہوا تھا اس میں اس تقسیم کے خلاف زبردست تقریر کی انگریزوں کے حاکمانہ غرور کو ٹھیس لگی گرفتار کئے گئے اور جیل بھیج دیے گئے، یہ بیسویں صدی کا آغاز تھا ابھی ہندوستانیوں کو تقریر و تحریر کی وہ آزادی حاصل نہیں ہوئی تھی جو بعد کے زمانے میں حاصل ہوئی۔

مولوی حبیب الرحمٰن۔

تقسیمِ بنگال کے خلاف چلنے والی تحریک اور احتجاج میں سرگرم حصہ لیا گرفتار ہوئے اور جیل بھیجے گئے۔

ابوالقاسم۔

تقسیمِ بنگال کی تحریک کے سلسلہ میں جیل جانیوالوں میں شامل تھے پولیس کے مظالم اور سختیاں برداشت کیں

دیدار بخش۔

تقسیمِ بنگال کی تحریک اور احتجاج کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے اور جیل گئے۔

دین محمد۔

تقسیمِ بنگال کی تحریک اور احتجاج میں پرجوش حصہ لیا پولیس نے گرفتار کیا اور جیل بھیج دیا۔

عبدالغفور۔

تقسیمِ بنگال کی تحریک اور احتجاج میں سرگرم حصہ لینے والوں میں تھے گرفتار ہوئے اور جیل گئے۔

لیاقت حسین۔

تقسیمِ بنگال کے خلاف احتجاج کرنے کے سلسلہ میں جو جلسہ منعقد ہوا تھا اس میں تقریر کرنے والوں میں شامل تھے، جلسہ کے بعد گرفتار ہوئے اور جیل بھیجے گئے۔

اسمٰعیل سراج۔

تقسیمِ بنگال کے خلاف ہونے والے جلسہ میں ایک گرم تقریر کی پولیس نے گرفتار کیا اور جیل بھیجدیا۔

عبدالرحیم غزنوی۔

تقسیمِ بنگال کے خلاف ٹاؤن ہال کلکتہ میں ہونے والے احتجاجی جلسہ میں تقریر کرنے کے جرم میں گرفتار ہوئے اور جیل بھیجدیئے گئے۔

سید مجتبیٰ حسین۔

سنہ ۱۹۱۵ء میں امریکہ میں جن ہندوستانیوں نے انجمنِ انقلابِ ہند" قائم کی تھی ان میں یہ بھی شامل تھے اس تنظیم کا مقصد طاقت کے ذریعہ ہندوستان میں انقلاب لانا تھا، انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی بھرپور جدوجہد کرنے کا حلف لینا پڑتا تھا فروری سنہ ۱۹۱۵ء کی ایک تاریخ مقرر کی گئی تھی، انجمن نے اسلحہ کی فراہمی کا ذمہ لیا تھا لیکن حالات کا رخ ایسا بدل گیا کہ بروقت اسلحہ ہندوستان نہ پہونچ سکا راز فاش ہوگیا۔

علی احمد۔

انجمنِ انقلابِ ہند (امریکہ) کی تشکیل کرنے والوں میں سے ہیں ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کا حلف لے چکے تھے، اسکے مطابق سرگرم سیاست میں حصہ لیتے رہے۔

حکیم فہم علی۔

امریکہ میں قائم ہونے والی انجمنِ انقلاب ہند کے رکن تھے اس کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے رہے، بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں جب ان سے قانونی پابندیاں ختم ہوئیں تو ہندوستان واپس آئے اور یہیں آسودۂ خواب ہوئے۔

حسن خان۔

یہ بھی امریکہ میں قائم ہونے والی انقلابی تنظیم انجمنِ انقلابِ ہند کے رکن تھے اور انجمن کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔

حوالدار سلیمان۔

بلوچ رجمنٹ کے سپاہیوں نے رنگون میں جنوری ۱۹۱۵ء میں بغاوت کی اور انگریز افسران کا حکم ماننے سے انکار کر دیا سپاہیوں کو کڑی سے کڑی سزائیں دی گئی تھیں، اس پر اظہارِ ناراضگی و برہمی کے زیرِ اثر سنگاپور کی کئی رجمنٹوں نے بغاوت کر دی، فروری ۱۹۱۵ء میں این، سی، او کے سپاہیوں نے بغاوت کر دی اور انگریزوں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا حوالدار سلیمان اس بغاوت کے لیڈر تھے عدالت نے پھانسی پر انکو چڑھا دیا۔

منشی خان نائک۔

سنگاپور میں این، سی، او کے باغی سپاہیوں میں یہ بھی شامل تھے گرفتار ہوئے اور فوجی عدالت کے حکم سے پھانسی دی گئی۔

جعفر علی خان نائک۔

این، سی، او کے باغی سپاہیوں مں شامل تھے ان کو بھی گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا، فوجی عدالت نے پھانسی کا حکم دیا اور تختۂ دار پر چڑھائے گئے۔

عبدالرزاق خاں نائک۔

این، سی، او کے باغی سپاہیوں میں تھے گرفتار ہوئے فوجی عدالت کے حکم سے پھانسی دیگئی۔

ماسٹر علیم الدین۔

اپنے ہندو سیاسی دوستوں کے ساتھ ایک انقلابی تنظیم بنائی تھی، جو توڑ پھوڑ اور تشدد پر یقین رکھتی تھی، پولیس کے مظالم سہتے رہے مگر اپنی انقلابی سرگرمیوں میں مصروف رہے، اور بڑے جرأتمندانہ کارنامے انجام دیئے۔

مظفر احمد۔

بنگال کے مشہور کمیونسٹ لیڈر، ہندوستان میں کیمونسٹ پارٹی کی بنیاد ڈالنے والے

ہیں، انگریزی حکومت کے خلاف ہر طرح کے تشدد اور طاقت کے استعمال کو جائز ماننے والے بلکہ تشدد پر ایمان رکھنے والے لیڈر تھے اپنی انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے زندگی کا ایک لمبا عرصہ جیلوں میں گذارا لمبی عمر پائی اور زندگی بھر اپنے مشن میں لگے رہے ۔

نذرالحفیظ۔

بنگال کے مشہور کمیونسٹ لیڈر، منظفر احمد کے ساتھیوں میں سے تھے سرگرم سیاست میں حصہ لیتے رہے بار بار جیل جاتے رہے اور پولیس کے مظالم برداشت کرتے رہے اور اپنے مشن سے سرِمو منحرف نہیں ہوئے ۔

قطب الدین۔

یہ بھی بنگال کی کمیونسٹ پارٹی سے متعلق تھے، اپنی انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ برطانوی جیلوں کی مشقتیں اور سختیاں برداشت کیں مگر اپنے مشن میں لگے رہے

عبدالحلیم ۔

بنگال کے نڈر لیڈروں میں سے ہیں، منظفر احمد کے ساتھیوں میں ایک پرجوش اور جری لیڈر سمجھے جاتے تھے، زندگی کا بڑا حصہ جیلوں میں گذارا ۔

مقصودالدین ۔

بنگال میں قائم ہونے والی "جوگندر پارٹی" کے انقلابی جوانوں میں شامل تھے اس پارٹی کے بیشتر ارکان اپنی تیز و تند سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے پولیس مظالم کا بار بار شکار ہوتے رہے، مقصودالدین اس پارٹی کے اہم لیڈروں میں سے تھے ۔

مولوی غیاث الدین ۔

بنگال کی جوگندر پارٹی میں شامل تھے اور پارٹی کی تمام انقلابی کارروائیوں میں برابر کے شریک تھے پولیس کے مظالم اور برطانوی جیلوں کی اذیتیں برداشت کرتے رہے ۔

نصیرالدین ۔

انقلابی پارٹی یعنی جوگندر پارٹی کے رکن اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے تھے ۔

رضیہ خاتون۔

جوگندر پارٹی کے لیڈر مسٹر نصیر الدین کی لڑکی تھی باپ کی طرح یہ بھی انقلابی ذہن کی مالک تھی، سیاسی سرگرمیوں میں مردانہ وار حصہ لیتی رہی، بنگال میں یہ پہلی مسلمان عورت ہے جس نے سرگرم سیاست میں بھرپور حصہ لیا اور جیل گئی، سزائیں کاٹیں اور مشقتیں برداشت کیں۔

عبدالقادر جماپوری۔

ان کا نام بھی بنگال کی جوگندر پارٹی کے ارکان میں ہے، پارٹی کی جملہ سرگرمیوں میں برابر کے شریک تھے، پولیس کے مظالم برداشت کئے اور جیل کاٹی۔

ڈاکٹر فضل القادر۔

ضلع بوگرا (بنگال) کے رہنے والے تھے اپنے سیاسی ساتھیوں کے ساتھ انھوں نے سرکاری خزانے پر حملہ کیا تھا اس سلسلہ میں گرفتار ہوئے، ان کے ساتھ دوسرے تمام ساتھیوں پر مقدمہ چلایا گیا، سیاسی تاریخ میں اسکو "پہاڑی ڈکیتی کیس" کہا جاتا ہے، عدالت نے ڈاکٹر فضل القادر کو طویل المیعاد سزا دی اور جیل بھیج دیے گئے۔

سراج الحق حمید الحق۔

ہگلی کے رہنے والے تھے، ہگلی کے پہاڑی ڈکیتی کیس میں ان پر بھی مقدمہ چلایا گیا اور طویل المیعاد قید کی سزا دی گئی۔

ولی نواز خان۔

بنگال کی کمیونسٹ پارٹی سے متعلق تھے مشہور کمیونسٹ لیڈر منظفر احمد کے ساتھیوں میں تھے، اپنی انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے بار بار جیل جاتے رہے۔

محمد اسماعیل۔

بنگال کمیونسٹ پارٹی میں شامل تھے اور پارٹی کی جملہ کارروائیوں میں پرجوش حصہ لیتے رہے، متعدد بار گرفتار ہوئے اور جیل گئے۔

چندو میاں۔

بنگال کی کمیونسٹ پارٹی سے متعلق رہے پارٹی کی سرگرمیوں میں دلیرانہ حصہ لیتے رہے

اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے جیل گئے۔

عبدالمومن۔

بہت پرجوش اور سرگرم بنگالی نوجوان تھا، بپن گنگولی کی باغیانہ سرگرمیوں میں برابر کا شریک تھا، عرصہ تک جیل کی چکیاں پیسیں۔

آفتاب علی۔

کمیونسٹ پارٹی بنگال سے منسلک تھے، مشہور کمیونسٹ لیڈر مظفر احمد کے سرگرم ساتھیوں میں سے تھے بار بار گرفتار ہوئے اور جیل گئے۔

باب (۳)

دیوبند سے مالٹا تک

بیسویں صدی کے آغاز میں بھی برطانوی حکومت کی طرف سے ہندوستانیوں کو تقریر و تحریر کی آزادی حاصل نہیں تھی، حکمِ زباں بندی عام تھا، برسرِعام حکومت کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی اور تنقید برطانوی حکومت کی پیشانی پر غیظ و غضب کی شکن پیدا کرنے کیلئے کافی تھی۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس ضرور قائم ہوگئی تھی، اب اسکے لب و لہجہ میں ہندوستانیوں کے دلوں کا درد شامل ہوکر کچھ سوز و گداز تو ضرور پیدا کرنے لگا تھا لیکن زبانِ فریاد کی تیزی اب بھی برطانوی اقتدار کی قوتِ سامعہ کیلئے ناقابلِ برداشت تھی، ہم دیکھتے ہیں کہ تقسیمِ بنگال جیسے اہم مسئلہ پر جن لوگوں نے اپنے دکھ درد کا اظہار واضح لفظوں میں کر دیا ان کے لئے سوائے جیل کے اور کوئی جگہ نہیں رہ گئی تھی، کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں ہونے والے جلسہ میں بیشتر اظہارِ خیال کرنے والے مقررین کو برطانوی جیلوں میں چکیاں پیسنی پڑیں، کوئی بھی تیز تر سیاسی سرگرمی کا جذبہ رکھنے والی سیاسی پارٹی کھلے بندنہ اپنا دفتر قائم کرسکتی تھی اور نہ جلسۂ عام کرسکتی تھی، اس کے باوجود سیاسی بیداری بڑھتی جارہی تھی، غلامی کی ذلت کا احساس اور آزادی کی قدر و قیمت میں اضافہ ہونے لگا تھا، لیکن برملا اس کا اظہار ناممکن تھا، ہندوستانی جیالے انڈر گراونڈ اپنا مشن چلانے پر مجبور تھے، ۱۹۰۶ء میں کانگریس کے مقابلہ میں مسلم لیگ کے قیام کی اجازت حکومت کی اس پالیسی کے نتیجہ میں تھی جو اس نے "ڈیوائڈ اینڈ رُول۔ لڑاؤ اور حکومت کرو،، کی اپنا رکھی تھی۔

جن لوگوں کو غلامی کی ذلت، ہندوستانی مظلومیت اور بے بسی، تقریر و تحریر کی گلا گھونٹ دینے والی اذیت کا شدت سے احساس تھا ان کے لئے صورتِ حال ناقابلِ برداشت رہی، اور وہ اپنی جانیں دیکر بھی آزادی حاصل کرنے کو غلامی کی ذلت بھری زندگی پر ترجیح دیتے

تھے ان کا کہنا تھا کہ عزت کی موت اچھی ذلت کی زندگی سے ۔
بیسویں صدی کے آغاز میں ہم دیکھتے ہیں کہ بیرونِ ملک میں ہندوستانیوں نے آزادی کی شمع جلائی، امریکہ، جرمنی، افغانستان اور ترکی میں ہندوستانی جوان پہونچے اور انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر ایسے وسائل وذرائع پیدا کئے جن سے کام لے کر وہ آزادی کی راہ میں کوئی مؤثر رول ادا کرنے کی پوزیشن میں آئے، حالات کچھ ایسے پیدا ہوے کہ خود ان حکومتوں کو بھی ایسے کچھ افراد اور جماعتوں کی ضرورت تھی جو انگریزوں کو اُلجھائیں، ان کیلئے دردِ سر بن جائیں جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۱۱ء سے جرمنی بیتاب تھا کہ ہندوستان میں خلفشار کی کوئی صورت پیدا ہو، جرمنی میں قائم ہونے والی ،، انڈین نیشنل پارٹی ،، کے ارکان سے گفتگو کر کے تین بار جرمنی نے کوشش کی کہ ہندوستان میں انقلابی جماعتوں کو اسلحہ فراہم کرے، لیکن ہر بار ناکامی ہوئی اور سازش کا راز فاش ہوگیا اور انگریزوں نے فراہمیٔ اسلحہ کے سارے راستے بند کر دیئے، جرمنی میں رہ کر ہندوستان کی آزادی کی تحریک چلانے والوں نے جب مسلسل ناکامی دیکھی تو جرمنی کی وزارتِ خارجہ کو سرحدی علاقوں کی طرف توجہ دلائی، آزاد قبائل، یاغستان اور پھر افغانستان کی حکومت پر توجہ مبذول کرائی ۔
۱۹۱۵ء میں جرمنی نے اپنا ایک وفد افغانستان بھیجا تاکہ وہ افغانستان کو ہندوستان پر حملہ کرنے کیلئے آمادہ کرے اور یاغستان اور آزاد قبائل کی فوجی تربیت اور اسلحہ کی سپلائی کے بھی وسائل وذرائع کا پتہ چلائے اور کس طرح ان منتشر قبائل میں آزادی کا جذبہ پیدا کر کے جدید اسلحہ کے استعمال کی تربیت پر انکو آمادہ کیا جائے، جرمنی کے اس وفد کے قائد ڈاکٹر برکت اللہ بھوپالی تھے اور انھوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس کام کو کیا اور وفد کو محفوظ راستے سے نکال لائے اور افغانستان پہونچایا، فان ہن تیگ جرمنی وفد کا سرخیل اور قیصر جرمنی کا نمائندہ تھا، کاظم بے ترکی دفد کا قائد تھا جسے سلطان محمد خامس عثمانی نے بہ حیثیتِ خلیفۃ المسلمین اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا اس وفد کے ساتھ ہندوستانیوں میں ڈاکٹر برکت اللہ بھوپالی اور راجہ مہندر پرتاپ تھے ان ارکانِ وفد کے علاوہ اس وفد کے ساتھ کچھ فوجی افسران بھی تھے جنہیں یاغستان اور آزاد قبائل میں فوجی ٹریننگ دینے کیلئے ساتھ لیا گیا تھا، فوجی افسران میں ترکوں کے علاوہ پٹھان

بھی تھے جو فرانس کے جنگی میدانوں سے بھاگ کر جرمنی پہونچے تھے یا جرمنوں کے ہاتھ میں اسیر ہو گئے تھے۔

جرمنی وفد کا اصرار تھا اور اسکے قائد کی پوری کوشش تھی کہ شاہِ افغانستان کو آلاتِ جنگ، اسلحہ، فوج اور زرر و مال کی امداد کا زیادہ سے زیادہ یقین دلایا جائے اور ترکی کے خلیفۃ المسلمین کا جو نمائندہ تھا اور وفد میں شامل تھا اس کی حیثیت سیاسی سے زیادہ مذہبی تھی کیونکہ وہ ایک اسلامی خلافت وحکومت کا نمائندہ تھا اسلئے وہ شاہِ افغان کو کابل کے باشندوں اور یاغستانی قبائل کو اپنے مذہبی جذبات سے متاثر کرنا چاہتا تھا اور افغانستان ویاغستان کے لوگوں کے مذہبی جذبات اور دینی حمیت کو بیدار کرنا چاہتا تھا، یہ دونوں باتیں اہم بھی تھیں اور ضروری بھی کیونکہ یاغستان میں مجاہدین کی جو جماعت تھی وہ دینی وسیاسی دونوں حیثیتوں کی حامل تھی وہ لوگ مذہب کے کام ہی میں اپنی ساری کائنات لٹانے کیلئے اس علاقے میں اقامت گزیں تھے اور یہ بھی حقیقت تھی کہ ان کے پاس اسلحہ جنگ کی فراوانی نہیں تھی اور انکو جدید ترین اسلحۂ جنگ کی سخت ضرورت تھی۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب افغانستان میں یہ وفد گفتگو کر رہا تھا اور افغانستان اور مجاہدینِ آزادی مقیم یاغستان کو پیشِ نظر رکھ کر نقشۂ جنگ مرتب کیا جا رہا تھا ہندوستان میں برطانوی حکومت کی قوت گیارہ ہزار یا پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں تھی، ان حالات میں اگر افغانوں اور یاغستانیوں کو جدید ترین اسلحہ مل جاتے تو اس منصوبے کی کامیابی کے امکانات انتہائی روشن تھے۔

ٹھیک یہی وہ وقت ہے جب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند کی ریشمی رومال کی تحریک، وجود پذیر ہوئی، یہ شیخ الہند کے سیاسی تدبر اور ایک بوریہ نشین عالم کے طائرِ فکر کی بلند پروازی کی روشن اور واضح دلیل ہے، اس تحریک کی تاریخ لکھنے والوں نے ابھی اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا ہے کہ شیخ الہند اور ان لوگوں کا جن کا اس تحریک میں کلیدی رول تھا سرحدی قبائل اور ان مجاہدینِ آزادی سے براہ راست کیا تعلق تھا؟ میں چاہتا ہوں کہ اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھا دیا جائے تبھی اس تحریک کی اہمیت وعظمت

اور قدر وقیمت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے اور جو مقام ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اس تحریک کو ملنا چاہیئے وہ مل سکے گا۔

تاریخ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ شیخ الہند نے اپنے معتمد شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی کو ابتداءً دیوبند میں اپنے پاس رکھا اور پھر کچھ دنوں کے بعد ان کو دہلی لے گئے اور خصوصیت کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کرائی اور مولانا سندھی پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار فرما کر مولانا آزاد کو مطمئن کر دیا کہ مولانا عبیداللہ سندھی ہر طرح قابلِ اعتماد، اور ہر طرح کے نازک رازوں کے امین اور ان کے مخلص ہونے میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مولانا سندھی کے تعارف کی اتنی اہمیت کیوں تھی؟ اور مولانا آزاد کو کیوں مطمئن کیا جا رہا ہے! یہی بات لوگوں کے علم میں نہیں ہے کہ مولانا آزاد کا سرحد کے ان مجاہدینِ آزادی سے براہِ راست تعلق تھا بلکہ ان کے مشیرِ کار تھے اور بوقتِ ضرورت ہندوستان میں رہ کر ان کو وسائل فراہم کرتے تھے اور مجاہدینِ آزادی مولانا آزاد سے مشورے بھی کرتے رہتے تھے اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل بھی ان سے کراتے تھے گویا ہندوستان میں بیٹھکر مجاہدینِ سرحد کی رہنمائی کرتے تھے۔ آپ شاید اسے میری خوش فہمی پر محمول فرمائیں اور آپ کا دل مطمئن نہ ہو، اسلئے آپ تھوڑی دیر کیلئے میرے ساتھ ان سرحدی علاقوں میں چلئے جہاں مجاہدینِ آزادی قیام پذیر ہیں، اور اپنی جد وجہد میں مصروف ہیں تاکہ بصیرت کی آنکھوں سے حالات کو دیکھ کر مطمئن ہو سکیں۔

مجاہدین کی بستی

مجاہدینِ آزادی کے امیر مولانا عبدالکریم تھے انھوں نے مجاہدین کا ایک انتہائی محفوظ مرکز اسمست ۱۹۰۲ء میں قائم کیا اور سارے مجاہدین کو سمیٹ کر یہیں آباد کر دیا تھا، اس آبادی میں ہندوستان کے تمام حصوں کے باشندے تھے، زیادہ تر بنگال وبہار کے تھے ان لوگوں کی بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ اپنے اصلی وطن کے متعلق کسی سے کچھ نہیں بتاتے تھے، مولانا عبدالکریم کے زمانے میں انگریزوں سے چھوٹی چھوٹی لڑائیاں مسلسل ہوتی رہتی تھیں، البتہ کوئی بڑا قدم نہیں اٹھایا گیا، اتفاق سے ہندوستان کے مسلم عوام میں جوشِ حمیت کی پہلی لہر ۱۸۹۵ء میں جنگِ یونان وترکی کے دوران اٹھی تھی، اسی وقت سے یہ ہمہ گیر احساس پیدا ہوا کہ یورپی طاقتیں اور دوسری مختلف طاقتیں حیلوں اور بہانوں سے مسلمانوں کی آخری بڑی

سلطنتِ ترکی کو ختم کر دینے کے درپے ہیں جو کم و بیش چار سو سال سے حاملِ خلافت ہونے کے باعث ہمہ گیر عقیدت کی مرکز چلی آرہی تھی، نیز اسی ترکی خلافت کو حرمین شریفین کی خدمت کی سعادت بھی حاصل تھی پھر سیاسی بیداری کا دائرہ برابر پھیلتا اور بڑھتا رہا اور اس کی شدت لحظہ بلحظہ بڑھتی چلی گئی اور پے درپے ایسے واقعات پیش آتے رہے جن سے ان شعلوں کو ہوا ملتی رہی، بتدریج یہ صورتِ حال ہو چکی تھی کہ یاغستان کے امیر المجاہدین کو مختلف ذریعوں سے کام لیکر امداد حاصل کرنی پڑتی، بلکہ عام مسلمان بھی آزادی کے جوش میں مجاہدین کے اس مرکز سے وابستگی پیدا کرنے کیلئے کوشاں تھے جن سے تحریکِ آزادی کو تقویت ملتی تھی، اس سلسلہ میں مجاہدین کا مرکز سب سے پہلے آتا تھا، اسلئے وہ تقریباً ایک سو سال سے اسلامیت اور آزادی کا علمبردار چلا آرہا تھا، پھر یہ کہ یہ مرکز ہندوستان سے بہت قریب بھی تھا بلکہ سرحد پر واقع تھا۔

اندرونِ ملک ذیلی مراکز

پہلے صرف عظیم آباد (پٹنہ) اور بنگال کے بعض علاقوں میں مجاہدین کے آدمیوں اور رقوم کو فراہم کرنے کے مرکز تھے لیکن اب صورتِ حال یہ ہوگئی کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایسے خفیہ مراکز بن گئے تھے جہاں سے مجاہدین کو ہر طرح کی امداد پہونچائی جاتی تھی، لیکن یہ اتنے رازدارانہ انداز میں کام ہوتا تھا کہ برسہابرس سے یہ سلسلہ جاری تھا لیکن کسی کو کانوں کان بھی اسکی خبر نہیں ہوتی تھی۔

مجاہدینِ آزادی کے مشیرِ خاص

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہوگئی جس میں ہندوستان کے باشندوں اور بالخصوص مسلمانوں کی ہمدردیاں ان طاقتوں کے ساتھ تھیں جو انگریزوں سے برسرِ پیکار تھیں، انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کیلئے ہندوستانیوں کی دلی تمنا تھی کہ انگریزوں کو جنگ میں شکست ہو، اتفاق سے ترکی حکومت انگریزوں کی مخالف حکومتوں کے ساتھ تھی، ترکی خلافت کو عام مسلمانوں کے نزدیک ایک طرح کے تقدس کا درجہ حاصل تھا۔

یہی صورتِ حال تھی جب یاغستان میں مقیم مجاہدین کے امیر مولانا عبدالکریم نے ہندوستان سے روابط کو وسعت دی اور بڑھایا، بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کے روابط بہت مضبوط اور بہت گہرے تھے کیونکہ مولانا آزاد نے الہلال کے ذریعہ قرآنی دعوت کا جو سلسلہ شروع

کیا تھا وہ جذبات کو بہت اپیل کرنے والا تھا اسلئے مولانا آزاد کے سیاسی لیڈر ہونے کے ساتھ انکی دینی حیثیت بھی مسلم ہو چکی تھی، آزادیِ وطن کی تحریک میں بھی انکو اہمیت وانفرادیت حاصل تھی جو عوام کی نظر میں کسی اور دوسرے کو حاصل نہیں تھی اسلئے مجاہدینِ سرحد کے مولانا آزاد سے روابط بہت مخلصانہ اور عقیدتمندانہ تھے مجاہدین کے روابط حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور بعض دوسرے لیڈروں سے بھی تھے، مولانا عبدالکریم ہر ضروری اور اہم معاملے کے متعلق مولانا آزاد سے مشورہ لیتے رہتے تھے اور جب کوئی اہم ضرورت پیش آجاتی تھی تو کیمپ سے اپنے خاص قاصد بھیج کر اس کی تکمیل کا انتظام کراتے تھے مثلاً ایک موقعہ پر مجاہدین کو ایک قابل ڈاکٹر کی ضرورت پیش آگئی مولانا آزاد کو یہ اطلاع پہونچائی گئی تو انھوں نے اپنے نیازمندوں میں سے ایک ایسے نوجوان کو بھیج دیا جو ڈاکٹری کی تعلیم تو حاصل کر چکے تھے مگر ابھی سند نہیں ملی تھی چنانچہ وہ ایک مدت تک مجاہدین کے ساتھ رہے پھر کابل چلے گئے اور وہاں سے ہندوستان واپس آئے انھیں ڈاکٹر صاحب کے متعلق انڈیا آفس لندن کے محفوظ ریکارڈ میں ریشمی رومال کے سلسلہ میں چلائے جانے والے بغاوت کے مقدمہ کی فائل میں ہے کہ :

> "ستمبر ۱۹۱۵ء میں عبدالکریم برلاسی عرف صدرالدین نام کے ایک ڈاکٹر کو ابوالکلام آزاد نے سازش میں شامل کر لیا اور اُسے ہندوستان سے مجاہدین کی طبی امداد زخموں کے علاج کے واسطے روانہ کرایا کچھ عرصہ تک اس نے یہ خدمات انجام دیں جو اسکے سپرد کی گئی تھیں پھر وہ کابل میں دوسرے سازشیوں میں جا ملا جون یا جولائی ۱۹۱۶ء میں وہ ہندوستان واپس آیا۔"
>
> (تحریک شیخ الہند ص ۲۱۲)

منصوبہ کتنا مکمل تھا اب آپ اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ مولانا عبیداللہ سندھی نے جو اپنی ذاتی ڈائری میں لکھا ہے کہ حضرت شیخ الہند نے دہلی لے جاکر مجھے اپنے حلقہ کے لوگوں سے ملایا اور میرا تعارف کرایا وہ یہی قومی رہنما تھے جو سرحد کے مجاہدین سے واقف ہی نہیں تھے بلکہ انکی ہر طرح کی مدد بھی کرتے تھے، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شیخ الہند نے اپنی منصوبہ بندی میں ان تمام قومی لیڈروں کو شامل رکھا تھا جو مجاہدین سے براہِ راست

روابط رکھتے تھے اور یہ طریقۂ کار مستقبل میں جنگِ آزادی کا جو محاذ کھلنے والا تھا اس کیلئے ضروری بھی تھا کیونکہ شیخ الہند کی تحریک کا ایک اہم اور ضروری جز تھا کہ سرحد کی طرف سے جب مجاہدین حکومتوں کے تعاون سے انگریزی فوج پر یلغار کریں تو اسی تاریخ کو مجاہدینِ آزادی کی راہ میں پڑنیوالے تمام بڑے شہروں میں بغاوت کا بگل بجا دیا جائے تاکہ انگریز چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں آجائے اور اندرونی نظم میں اُلجھ کر حملہ آور مجاہدین کا مقابلہ نہ کر سکے، اس طرح شیخ الہند کی یہ تحریک ایک مکمل اور منصوبہ بند تحریک تھی۔

سنہرا موقعہ ۱۴ اگست ۱۹۱۴ء کو پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا، ہندوستان کے انقلابی لیڈروں کے نزدیک یہ موقعہ ایسا تھا کہ کسی باہری طاقت کی مدد سے ملک میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے، اور برطانوی حکومت سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے، شیخ الہند نے اس کی تیاریاں برسوں پہلے سے شروع کر دی تھیں اور مولانا عبید اللہ سندھی کو بلا کر کام کا آغاز بھی کر دیا تھا، ہندوستان میں جو سیاسی ماحول اور فضا بن چکی تھی اب مزید عملی اقدامات کا وقت آچکا تھا، ۱۹۱۵ء میں جبکہ جنگِ عظیم شباب پر تھی اور برطانوی حکومت انتہائی خطرناک حالات میں گھری ہوئی تھی، اس کی ساری توجہ یورپ میں ہونے والی جنگ کی طرف لگی ہوئی تھی کیونکہ انگریزوں کا وطن دشمنوں کی زد پر تھا، ٹھیک اسی ماحول میں شیخ الہند نے مولانا سندھی کو پروگرام کو عملی شکل دینے کیلئے کابل روانہ کر دیا اور خود حجاز پہونچکر نقشۂ جنگ مرتب کرنے اور ترکی حکومت کی پشت پناہی حاصل کرنیکی ذمہ داری اپنے سر رکھی۔

ہماری کہانی غیروں کی زبانی بقیہ تفصیلات بعد میں بیان ہونگی پہلے ہمارے دشمنوں کی زبانی ہماری کہانی سن لیجئے، رولٹ ایکٹ کمیٹی نے اپنی تحقیقات کے سلسلہ میں جو رپورٹ مرتب کی ہے اس میں تحریک کی کہانی کچھ اس طرح ہے:

> "یہ ایک تجویز تھی جو ہندوستان میں تیار کی گئی تھی اس کا مقصد یہ تھا" کہ شمال مغربی سرحد سے ایک حملہ ہو اور ادھر مسلمان اُٹھ کھڑے ہوں اور سلطنتِ برطانیہ کو تباہ و برباد کر دیا جائے، اس تجویز پر عمل کرنے اور اسکو تقویت

دینے کیلئے ایک شخص مولوی عبید اللہ نے اپنے تین رفقار محمد اور محمد علی کو ساتھ لیکر اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو عبور کیا، عبید اللہ سکھ سے مسلمان ہوا ہے اور صوبجاتِ متحدہ کے ضلع سہارنپور کے مذہبی مدرسہ دیوبند میں تعلیم پائی تھی وہاں اس نے جنگی اور خلافِ برطانیہ خیالات سے عملۂ مدرسہ کے خاص لوگوں کو اور کچھ طلبار کو متاثر کیا اور سب سے بڑا شخص جس نے اس پر اثر ڈالا وہ مولانا محمود الحسن تھا وہ مدرسہ میں بہت دیر تک ہیڈ مولوی رہ چکا ہے عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور مدرسہ کے تعلیم یافتہ مولویوں کی رفاقت سے ہندوستان بھر میں ایک اسلامی جوش اور مسلمانوں میں برطانیہ کے خلاف تحریکِ جہاد پھیلا دے لیکن اس کی تجاویز کے راستہ میں مدرسہ کے مہتمم اور انجمن کے لوگ سدِ راہ ہوئے، انھوں نے اُسے اور اسکے چند ساتھیوں کو مدرسہ کی خدمت سے برخاست کر دیا، اس امر کا بھی ثبوت مِل چکا ہے کہ وہ بعض حالات میں مصیبت میں گرفتار رہا پھر بھی وہ مولانا محمود الحسن کے پاس عام طور پر آتا رہا، مولانا کے مکان پر خفیہ جلسے ہوتے تھے، اور اس امر کی اطلاع ملی ہے کہ سرحد کے بھی کچھ آدمی وہاں آتے تھے، ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو محمود الحسن نے بھی ایک شخص محمد میاں اور دو دوستوں کے ساتھ عبید اللہ کی مثال کی پیروی کی اور شمال کی طرف جانے کیلئے بلکہ عرب کے صوبہ حجاز میں مقیم ہونے کیلئے ہندوستان چھوڑ دیا، روانہ ہونے سے پہلے عبید اللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا اور دو ایسی کتابیں معرضِ اشاعت میں لے آیا جن میں ہندوستان کے مسلمانوں کو جنگی اور مذہبی جوش کی ترغیب دی گئی تھی، اور انکو جہاد کیلئے آمادہ کیا گیا تھا، اس شخص کا اور اس کے دوستوں کا جن میں مولانا محمود الحسن بھی شامل ہیں عام مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا زبردست حملہ ہندوستان پر ہو اور مسلمانوں کی بغاوت سے اس کو تقویت پہونچے۔

اب ہم ذیل میں ان کوششوں کا ذکر کریں گے جو ان لوگوں نے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کیلئے کیں۔ عبیداللہ اور اسکے دوست پہلے ہندوستانی مجنونانِ مذہبی کے پاس گئے اور اسکے بعد کابل پہونچے وہاں ترکی اور جرمنی کے ممبران سے ملے اور ان سے تبادلہ خیال کیا اور تھوڑے عرصہ کے بعد انکا دیوبندی دوست مولوی محمد میاں انصاری بھی آملا یہ آدمی مولانا محمود الحسن کے ساتھ عرب گیا تھا اور ۱۹۱۶ء میں وہ اعلانِ جہاد لے کر آیا جو حجاز کے ترکی حاکم غالب پاشا نے مولانا محمود الحسن کو دیا تھا اثنائے راہ میں محمد میاں اس تحریر کو جو غالب نامہ کے نام سے مشہور ہے کی نقلیں ہندوستان اور سرحدی علاقوں میں تقسیم کرتا ہوا آیا عبیداللہ اور اسکے دوست ساتھی لوگوں نے ایک تجویز رکھی تھی کہ جب سلطنتِ برطانیہ کو مٹایا جائے تو ہندوستان میں ایک عارضی حکومت قائم کیجائے ایک شخص مہندر پرتاب اس کا پریسیڈنٹ ہونے والا تھا، یہ شخص ایک اچھے خاندان کا ہندو اور خود رائے اور وہمی سیر کا آدمی ہے اور ۱۹۱۴ء میں اُسے اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس میں سفر کرنے کا پروانہ راہداری دیا گیا تھا، وہ سیدھا جنیوا گیا وہاں ہردیال سے ملا، ہردیال نے اس کا جرمن قنصل سے تعارف کرایا، اس کے بعد راجہ مہندر پرتاب جرمن چلا گیا۔

ایک شخص جو عبیداللہ کو اچھی طرح جانتا ہے اس کی نسبت وہ کہتا ہے کہ وہ شخص تجویزیں تیار کرنے میں عجیب وغریب اور غیر معمولی آدمی تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑی سلطنت کا حکمراں ہے، مگر جہاں کام کرنے کا وقت آیا وہ بہت سست اور کام کرنے سے جی چُراتا تھا وہ وہاں سے کسی خاص مشن کے لئے بھیج دیا گیا کیونکہ اس نے جرمنوں پر اپنی اہمیت کا اثر مبالغہ آمیز طریقہ پر ڈالا تھا۔ خود عبیداللہ ہندوستان کا وزیر ہونے والا تھا اور کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر برکت اللہ جس نے برلن کے راستے کابل کا سفر کیا تھا اور انگلستان امریکہ اور جاپان ہو آیا تھا، یہ شخص ٹوکیو میں

ہندوستانی (اردو) کا پروفیسر تھا اور وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف ایک نہایت تیز اخبار "اپلانک زمیٹرنٹی" کے نام سے جاری کیا تھا اس اخبار کو بعد میں جاپانی حکام نے بند کر دیا تھا اسکے بعد وہ اپنے عہدے سے موقوف کر دیا گیا اور امریکہ جاکر اپنے غدری دوستوں سے مل گیا، وہ جرمن جو افغانستان میں اپنے مقصد کے لئے آئے تھے جب ناکام رہے تو ۱۹۱۶ء میں واپس چلے گئے مگر ہندوستانی وہیں رہے اور عارضی حکومت والوں نے روسی ترکستان کے حاکم اور زارِ روس کو اس مضمون کا خط لکھا کہ روس کو چاہیئے کہ برطانیہ کے اتحاد کو خیرباد کہکر ہندوستان سے سلطنتِ برطانیہ کو مٹا دینے کی کوشش میں امداد کرے ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط تھے، آخروہ برطانیہ کے ہاتھ آگئے شہنشاہِ روس کے نام جو خط تھا وہ سونے کے پتر پر لکھا ہوا تھا جس کی عکسی تصویر ہمیں دکھائی گئی ہے، حکومتِ عارضی نے ترکی گورنمنٹ کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی تجویز کی اور اس مقصد کے حصول کیلئے عبیداللہ نے اپنے پرانے دوست محمودالحسن کو خط لکھا کہ یہ خط اور ایک اور خط ۹ رجولائی ۱۹۱۶ء کے ساتھ جو محمد میاں نے لکھا تھا بند کرکے اس نے حیدرآباد سندھ کے شیخ عبدالرحیم کے نام ایک نوٹ لکھ کر بھیجدیا یہ شخص اس وقت مفقودالخبر ہے، شیخ عبدالرحیم سے اس نوٹ میں التجا کی گئی تھی کہ وہ کسی معتبر حاجی کے ہاتھ وہ خط مکہ میں محمودالحسن کو پہنچادے وہ خطوط ریشمی کپڑے پر بہت صاف اور خوشخط لکھے ہوئے تھے۔

محمد میاں کے خط میں یہ باتیں لکھی تھیں، جرمن اور ترک وفود کا آنا، جرمنوں کا واپس جانا، ترکوں کا بغیر کسی کام کے رُک جانا غالب نامہ کی اشاعت حکومت کی تجویز، خدائی فوج کی مجوزہ ساخت، اس فوج کیلئے تجویز یہ تھی کہ اس کیلئے ہندوستان سے رنگروٹ بھرتی کئے جائیں اور مسلمان حکمرانوں کے درمیان اتحاد پیدا کیا جائے۔

محمودالحسن کو ان تمام حالات کو حکومت عثمانی تک پہونچانا تھا، عبیداللہ کے خط میں خدائی فوج کا نقشہ تھا، اس فوج کا ہیڈ کوارٹر مدینہ تھا اور اس کا جنرل

انچیف محمود الحسن ہونے والا تھا، دوسرے ہیڈ کوارٹر مقامی جرنیلوں کے ماتحت قسطنطنیہ، تہران اور کابل میں قائم ہونے والے تھے۔ کابل میں خود عبید اللہ جرنیل مقرر ہونے والا تھا،

اس نقشے میں تین سرپرستوں بارہ فیلڈ مارشلوں اور بہت سے اعلیٰ فوجی افسران کے نام تھے، لاہور کے بھاگے ہوئے طالب علموں میں سے ایک میجر جنرل اور کرنیل اور چھ لفٹنٹ کرنیل ہونے والے تھے، جو اشخاص بھی ان اعلیٰ عہدوں کیلئے منتخب کئے گئے ان میں سے اکثر ایسے تھے جن سے ان کے تقرر کی نسبت مشورہ نہیں لیا گیا تھا لیکن ریشمی خطوط سے جو اطلاعات ملیں ان میں سے بعض کا تدارک ضروری تھا وہ کیا گیا، دسمبر ۱۹۱۶ء میں محمود الحسن اور اس کے چاروں رفقار برطانیہ کے ہاتھ آگئے اور وہ اس وقت جنگی قیدی ہیں اور برطانیہ کی سلطنت کے ایک حصہ میں قید ہیں،،

تحقیقاتی رپورٹ کی خامی

اس تحریک کے سلسلہ میں تحقیق کرنے والوں نے انتھک دو دو کے بعد جو معلومات فراہم کی ہیں ان کا بڑا حصہ صحیح ہے، لیکن حیرت یہ ہے کہ وہ بانیٔ تحریک کے بارے میں صحیح معلومات حاصل نہیں کر سکے اور دھوکہ کھا گئے، وہ پوری رپورٹ میں اور اس مقدمہ میں جو اس تحریک کے چلانے والوں پر قائم کیا گیا اسکی مسل میں تحریک کا بانی مولانا عبید اللہ سندھی کو بتایا گیا جبکہ مولانا سندھی شیخ الہند کے بہت سے جاں نثار خادموں اور شاگردوں میں سے ایک فداکار اور مخلص شاگرد تھے اور بہت سے کارکنوں میں سے ایک کارکن تھے، انھوں نے جو کچھ کیا شیخ الہند کے مشورے اور حکم سے کیا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کی روح رواں اور قائد حضرت شیخ الہند تھے وہ اسکے لئے بہت عرصے سے تیاری کر رہے تھے، یہ عجلت میں تیار کیا ہوا کوئی پلان نہیں تھا، آپ اس کی تفصیل سے اس کی ہمہ گیری، وسعت اور گہرائی کو سمجھ سکتے ہیں اور یہ منصوبہ اس دور میں عملی شکل اختیار کرنے والا تھا جب بہت سی حکومتیں بھی انگریزوں کے خلاف ہر اقدام کی تائید اور تعاون دینے کیلئے بے چین تھیں، اگر قضا و قدر کا فیصلہ کچھ اور نہ ہوتا تو اس تحریک نے ملک کی آزادی پر بڑے

اہم اثرات ڈالے ہوتے، تعجب ہوتا ہے کہ یہ بوریہ نشین علماء کتنی گہرائی سے سوچتے ہیں اور کس طرح ایک کامیاب منصوبہ بندی کی محیر العقول صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔

منصوبہ بندی شیخ الہند دار العلوم دیوبند جیسے عالمی شہرت کے مالک عظیم ادارہ کی مسندِ صدارت پر تقریباً پچاس سال فائز رہے اور ہر سال سیکڑوں کی تعداد میں طلبہ آپ کی شاگردی میں سندِ فضیلت لے کر اپنے اپنے علاقوں میں جاتے تھے۔۔۔ بلا مبالغہ ان کی تعداد ہزاروں تک پہونچتی ہے ان کے شاگردوں میں ایک خاصی تعداد ان طلبہ کی بھی ہوتی تھی جو سرحدی علاقوں سے یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔

جو لوگ عربی مدارس کے ماحول سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسیٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والے اسٹوڈینٹس سے قطعاً جداگانہ ہوتے ہیں، یہاں ہر طالبِ علم اپنے استاد کا اس طرح فدائی عقیدت مند اور جاں نثار ہوتا ہے کہ وہ اپنے استاد کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلنا اپنے لئے سرمایۂ حیات اور اپنے لئے قابلِ فخر سمجھتا ہے استاد کے ادب و احترام کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اسکے ہر حکم کی تعمیل کو قابلِ فخر کارنامہ سمجھتا ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ استاد اُسے کوئی حکم دے کر اس کی تعمیل کر کے سرخ رو ہوسکے، دینی و عربی مدارس میں استاد درحقیقت اپنے شاگردوں کا روحانی پیشوا ہوتا ہے، اسکے ہر حکم کی فوری تعمیل ہوتی ہے، طلبہ کے دل و دماغ پر استاد کی شخصیت اس طرح اور اتنی حاوی ہوتی ہے کہ استاد کی شان میں ادنیٰ گستاخی بھی اس کیلئے ناقابلِ برداشت اذیت ہوتی ہے، شاگرد استاد کے ہر حکم کی تعمیل میں سردھڑ کی بازی کیلئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے اور اگر طالبِ علم اپنے استاد کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا ہے تو اس کی فدائیت اور جاں نثاری کئی گنا اور بڑھ جاتی ہے۔

شیخ الہند کے تلامذہ انھیں خصوصیات سے متصف تھے، وہ اپنی مخصوص نشستوں میں سیاستِ حاضرہ پر اظہارِ خیال کرتے تھے جو طلبہ ان مجلسوں میں شریک ہوتے تھے ان کا متاثر ہونا لازم تھا اور پھر چونکہ شیخ الہند کے ذہن میں ایک منصوبہ تھا اسلئے خصوصیت کے ساتھ ان کو اپنا ہم خیال بنا کر اپنے مشن میں شریک کر لیتے تھے، شاگردوں کی ایک معقول تعداد ان سرحدی علاقوں کی بھی تھی جو ہمیشہ سے ہندوستان پر حملہ کرنے والوں کیلئے شاہراہ کا کام دیتے آئے ہیں۔

چونکہ شیخ الہند کی تحریک میں ان سرحدی علاقوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی اسلئے خصوصیت کے ساتھ اس علاقہ کے طلبہ کو اس کیلئے تیار کرتے تھے، جب انکی قابلِ اطمینان تعداد ہوگئی تو دیوبند اور دہلی میں تحریک کیلئے فضا ساز گار بنانے کا کام شروع کر دیا، شیخ الہند کے گھر خفیہ میٹنگیں ہوتی تھیں اور سی آئی ڈی کی یہ رپورٹ صحیح تھی کہ ان خفیہ جلسوں میں سرحد کے کچھ لوگ بھی کبھی کبھی شریک ہوتے تھے، شیخ الہند نے اپنے ایک مخصوص اور قابلِ اعتماد شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی جو انتہائی ذہین اور اسکیم ساز ذھن کے مالک تھے کو بلا کر ہندوستان میں آزادی کی جد وجہد کرنے والوں اور بالخصوص ان حضرات سے روشناس کرایا جو خفیہ طور پر سرحد میں ہونے والی جد وجہد سے وابستہ تھے جن میں حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ شامل ہیں ان سب کاموں میں کئی سال لگ گئے۔

شیخ الہند کی یہ سرگرمیاں ۱۹۰۶ء سے جاری تھیں، ۱۹۰۹ء میں جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک ہندوستان گیر نظام کا خاکہ مرتب کیا گیا، مقصد یہ تھا کہ پچھلے دنوں مجاہدینِ آزادی کی متشددانہ کارروائیوں کی وجہ سے انگریز بہت چوکنا ہو گیا تھا، خطرہ تھا کہ اگر ذرا سی چوک ہوگئی تو ساری اسکیم فیل ہو جائے گی اسلئے انھوں نے سوچا کہ طریقۂ کار ایسا ہونا چاہئے کہ حکومت کے کان میں اسکی بھنک بھی نہ پہونچنے پائے۔

عوام کی بیداری کا اندازہ لگانے کیلئے ضروری تھا کہ کوئی بڑا اجتماع کیا جائے اس کے لئے جمعیۃ الانصار کا مذہبی پلیٹ فارم کام آیا ۱۹۱۰ء میں یہ اجلاس بلایا گیا، تیس ہزار سے زائد مسلمان اس اجلاس میں شریک ہوئے، اتنا بڑا اجتماع چالیس پچاس برسوں میں کسی جماعت کو نصیب نہیں ہوا تھا، اس اجتماع میں ہر طبقہ کے لوگ اور ہر مکتبۂ فکر کے افراد شریک تھے اس اجتماع میں دیوبند اور علی گڈھ کی ذہنی وفکری دوری کو کم کرنے کیلئے دونوں اداروں کے طلبہ کے تبادلے کی تجویز رکھی گئی، اگرچہ اس کا نتیجہ بہت تلخ نکلا لیکن اس سے اندازہ کیا گیا کہ اجلاس کامیاب ہے اور کسی بھی بڑی تحریک کے لئے فضا ساز گار ہے۔

تحریک کا سرچشمہ تحریک کا مرکز یاغستان کو قرار دیا گیا، یہ وہ علاقہ ہے کہ انگریزوں نے بار بار حملہ کرنے کے باوجود اس پر قابو نہیں پایا تھا، ہر بار قبائلیوں نے

نہایت بے جگری سے مقابلہ کرکے انگریزوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا، اس مرکز میں شیخ الہند کے دو نہایت معتمد شاگرد مصروفِ کار تھے، ان میں ایک مولانا سیف الرحمٰن اور دوسرے حاجی ترنگ زئی تھے، اگست ۱۹۱۴ء میں جب جنگِ عظیم شروع ہوئی تو شیخ الہند نے حکم دیا کہ اب سکون سے بیٹھنے کا وقت ختم ہوگیا، شمشیر بہ کف میدان میں آجانا چاہیئے، مرکز میں رہنے والوں نے اصرار کیا کہ آپ تشریف لائیں تو آپ کی سرپرستی اور نگرانی میں جد وجہد شروع کیجائے لیکن شیخ الہند نے اطلاع بھیجی کہ اگر میں یہاں سے ہٹ گیا تو مرکز کو جو مالی امداد مل رہی ہے وہ ٹھیک طور پر نہیں پہونچ سکے گی جو کمزوری کا باعث ہوگا، اور پھر راستہ بھی جنگ چھڑ جانے سے انتہائی مخدوش اور خطرناک ہوگیا تھا۔

شیخ الہند خود ہندوستان سے باہر جانے کے بارے میں سوچ رہے تھے تاکہ اصل پروگرام پر عملدرآمد شروع ہوجائے ورنہ تاخیر سے تحریک کو نقصان پہونچ سکتا ہے اسلئے شیخ الہند نے حکم بھیجا کہ آپ لوگ پروگرام کے مطابق کام کو جاری رکھیں سرِدست میرا آنا ممکن نہیں ہے۔

انگریزوں نے سرحد پر مجاہدین کے اجتماع کو دیکھ کر حملہ کر دیا، مجاہدین نے بہادری سے مقابلہ کیا انگریزوں کی کئی پلٹنیں فنا کر دیں مگر انگریزوں نے اپنے نقصان کو ظاہر نہیں کیا اور بے شمار کمک ان علاقوں میں بھیج دی، سرحدی مجاہدین نے پوری جرأت سے مقابلہ کرکے انگریزی فوج کو نقصان پہونچایا مگر انگریزوں کے جدید ترین اسلحہ نے وہ تباہی مچائی کہ مجاہدین بہت زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کرسکے۔

ایک طرف فوج اور اسلحہ کی کثرت، سامانِ رسد کی فراوانی دوسری طرف یاغستان کے مفلس اور بے یار و مددگار عام باشندے، نتیجہ یہ ہوا کہ جب مجاہدین کا سامانِ رسد ختم ہوگیا تو مورچہ چھوڑ کر رسد کی فراہمی کیلئے چل پڑے، کارتوس ختم ہوجاتے تو انکو دور دراز کے علاقوں میں محاذ چھوڑ کر جانا پڑتا تھا اسلئے مرکز سے شیخ الہند کے پاس اطلاع آئی کہ جب تک کسی حکومت کی منظم پشت پناہی حاصل نہ ہو ہماری شجاعت وجاں بازی بیکار ہے اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مولانا عبیداللہ سندھی کو ۱۹۱۵ء میں کابل بھیجا گیا۔

حکومت سے تعاون حاصل کرنیکی کوشش

اس دور میں ترکی حکومت جو خلافت کے نام سے مشہور تھی اس کا بادشاہ اپنے کو خلیفۃ المسلمین کہتا تھا۔ اور عام دنیا کی نگاہوں میں ترکی خلافت کو مذہبی رشتہ سے ایک عظمت و تقدس حاصل تھا اور وہی حجاز پر بھی حکمراں تھی، مکہ مکرمہ مدینہ منورہ کی حفاظت کی وجہ سے ترکی خلافت کی عزت میں چار چاند لگے ہوئے تھے، دوسری حکومت افغانستان کی تھی جو مجاہدینِ آزادی کے مرکز سے متصل واقع تھی جہاں سے امداد حاصل کرنا سہل ترین تھا۔ افغانستان میں مجاہدین کی اکثر آمد و رفت بھی رہتی تھی اسلئے اگر حکومتِ افغانستان کو تنہا بھی مجاہدین کی امداد پر آمادہ کر لیا جاتا ہے تو ہندوستان میں انگریزوں کا ناطقہ بند کر دینے کیلئے کچھ کم نہ تھا۔ اس زمانے میں حبیب اللہ خان، افغانستان کا بادشاہ تھا، اس سے کسی بڑے اقدام کی امید نہیں تھی کہ وہ اس خارزار وادی میں اُترنے کی ہمت کرتا البتہ اس کے بھائی نصر اللہ خاں کے دل میں انگریزوں سے نفرت تھی اور اس کے دل میں ان کی مخالفت کا جذبہ موج زن تھا۔

مجاہدینِ آزادی کے امیر المجاہدین مولانا محمد بشیر نے اس سے گفتگو کر کے اسکو بڑی حد تک آمادہ کر لیا تھا، مولانا موصوف نے اس سلسلہ میں امیر کو مطمئن کرنے کیلئے آزاد قبائل کے سرداروں اور مُلّاؤں سے بیعت نامے بھی حاصل کر کے پیش کر دیئے تھے اور اب امید کی جانے لگی تھی کہ امیر المجاہدین کی مدد کیلئے کوئی بڑا اقدام کیا جا سکتا ہے لیکن جب امیر ہندوستان پر حملہ کرنے کیلئے تیار ہوا تو اس نے شرط لگا دی کہ ہندوستان کے قومی لیڈروں میں سے بعض مشہور لیڈروں سے معاہدہ ضروری ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم انڈین نیشنل کانگریس سے معاہدہ ہو جائے تو ہندوستان پر حملہ کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

طبلِ جنگ بجا دیا گیا

ادھر شاہِ افغانستان سے ہندوستان پر حملہ اور مجاہدین سے تعاون کی گفتگو چل رہی تھی دوسری طرف باشندگانِ یاغستان اور آزاد قبائل کے نام اعلانِ جہاد امیر المجاہدین مولانا محمد بشیر نے مرتب کر کے پورے آزاد قبائل اور یاغستان میں شائع کر دیا جس سے پورے علاقے میں ایک بارودی فضا بن گئی، شدتِ جذبات سے سرحدی باشندوں کے قلوب انگریزوں کے خلاف نفرت و غصہ سے کھولنے لگے اور پورا

سرحدی علاقہ انگریزوں کے خلاف اقدام کیلئے کوہِ آتش فشاں بنتا جارہا تھا کہ کب اس کو پھٹ پڑنے کا موقعہ ملے کہ پوری برطانوی حکومت اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آکر بھسم ہو جائے یہ اعلانِ جہاد فارسی زبان میں تھا جو اس علاقے کی زبان تھی، پورا اعلان غلام رسول مہرنے اپنی کتاب سرگذشتِ مجاہدین میں نقل کر دیا ہے، میں اس کے چند اقتباسات کا اردو ترجمہ پیش کرتا ہوں تاکہ اعلان کی اہمیت کا اندازہ ہوسکے۔ اعلان میں تھا:

دینی بھائیو!

اس وقت خدانے آپ کو نہایت قیمتی مہلت عطا کی ہے جس کی نظیر صدیوں میں نہیں ملتی ہے ... یہ سنہری موقعہ ہے، انگریز مسلمانوں کے خصوصًا اور اہلِ مشرق کے عمومًا دشمن ہیں، دو تین سال سے عالمگیر جنگ میں اُلجھے ہوئے ہیں ان کی قوم کے لاکھوں آدمی ضائع ہو چکے ہیں، ان کے لشکر فرانس، اٹلی، بلقان، مصر، عراق، اور عرب میں خوفناک اور خوں ریز جنگ سے دوچار ہیں، ہر مہینے انکے ہزاروں افراد ضائع ہوتے ہیں، اب ان کو محاذِ جنگ پر کمک پہونچانا بھی مشکل ہوگیا ہے، ان صدموں اور نقصانوں کے باعث انگریز قوم کی جان پر آبنی ہے، ان کی قوت روز بروز کم ہورہی ہے، لیکن سلطنتِ ترکی نیز حکومتِ جرمنی اور ان کے حلیف ہر میدان میں کامیاب و بامراد ہیں، بلجیم، پولینڈ، سردیا، رُومانیہ، اور مانٹی نیگرو جیسے وسیع اور زرخیز ملک پورے کے پورے مسخر کئے جا چکے ہیں، روس میں انکی فتوحات روز افزوں ہیں، مختصر یہ کہ انگریز اور انکے ساتھی شکستیں کھا کھا کر شکستہ دل ہو چکے ہیں اور ان کے بدن زخموں سے چور ہیں، وہ ہمت ہار چکے ہیں، اور بالکل بے دست و پا ہو چکے ہیں، لیکن فتح و ظفر کے باعث جرمنوں، ترکوں، آسٹریوں اور بلغاریوں کے دل قوی اور حوصلے بلند ہیں اور وہ سراپا اُمید ہیں۔

اگر انگریزوں کی اس پریشانی اور خطرناک حالت میں سرحدی قبائل متفق ہوکر شمال سے جنوب تک یک بیک غارت گرانہ حملوں کا آغاز کر دیں،

بڑی جنگ سے بچے رہیں اور پوری سرحد پر شبخونوں اور چھاپوں کا تانتا باندھ دیں تو چند ہی مہینوں میں انگریزوں کے لشکر کو دریائے اٹک کے پار پہونچا دینگے جنگی میدانوں پر ان مسلسل حملوں کا اثر جلد ظاہر ہو جائے گا اور انگریزوں کی شکست میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جائے گی، اب خواب غفلت سے بیدار ہو جاؤ وقت بہت تنگ ہے، اگر اس وقت بھی نہ جاگے تو تمہارا تیر گرفت سے نکل جائیگا، مہلت کی حیثیت نو بہار کی سی ہے، شخصوں اور قوموں کی زندگی میں وہ ایک بار چلی جائے تو پھر نہیں آتی جس طرح گذرا ہوا شباب دوبارہ نہیں لوٹتا۔

اے مسلمانانِ سرحد! وقت آگیا ہے کہ تمام قبیلے پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی میں سیاسی اتحاد پیدا کریں، تمام قبیلوں سے وکیل اور نمائندے منتخب کر کے ایک متحدہ حکومت بنائی جائے بلاشبہ تمام داخلی امور میں ہر قبیلہ آزاد رہے گا لیکن بیرونی ملکوں سے تعلقات و روابط کے باب میں حکومتِ متحدہ جواب دہ ہوگی اگر اس کام کو موجودہ عالمگیر جنگ کے دوران میں پورا کر لو جناب حری بے کے اتفاق رائے سے تمام قبائل کیلئے ایک منصوبہ بنا کر انگریزوں پر غارتگرانہ چھاپوں اور جہاد کا آغاز کر دو تو صلح ہونے سے پیشتر دریائے اٹک کے اس پار (سمستِ سرحد) کی زمین قبضے میں لے آؤ تا کہ آپ کو خلیفۂ معظم کی طرف سے استقلال کی سند اور ہر قسم کی مدد مل سکے، شیعہ سنی کے اختلافات بھلا دو، اور تمام قبیلے بھائی بھائی بن جاؤ، تم پروین ستاروں کی طرح جمع ہو جاؤ اور بلندی کے آسمان پر پہونچو، اگر ذروں کی طرح بکھرے رہو گے تو خاک کے سوا تمہارا کوئی مکان نہ ہوگا، شیعہ ہوں یا سنی آخر سب قرآن کے فرمانبردار ہیں۔

مسلمانو! تمہاری خانہ جنگی کا نتیجہ ہے کہ نصارٰی اس جہاں کے حکمراں بن گئے، تمہیں خدا نے عقل عطا کی ہے پھر حیوانوں کی خصلتیں کیوں لئے بیٹھے ہو، جو دوسروں کیلئے ممکن ہے تمہارے لئے کیوں ممکن نہیں؟ انسان خدا کا

خلیفہ ہے، وہ اس کائنات کا حاکم ہے، بجلی، بھاپ، دریا سب اسکے خادم ہیں انسان بلندی پر نظر آنیوالے ستاروں کی شکل اور نقل و حرکت اور ایک دوسرے سے دوری کا اندازہ کرتا ہے اسکی عقل آسمان کی ترازو ہے۔

اے معزز عالمو! اور جلیل القدر مُلّاؤ!! آپ لوگ نبی علیہ السلام کے وارث ہیں حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دو دستوروں پر خاص طور سے توجہ کیجئے، اول یہ کہ آپس کی دشمنی رفع کرنا اور قبائل کو متحد کر دینا اسلام کی بنیاد ہے جیسا کہ قرآن گواہ ہے وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ۔

دوسرا دستور یہ کہ جب مسلمانوں کے درمیان دینی اخوت بیدار ہوگئی اور قبیلوں کے درمیان اتحاد کا رابطہ مضبوط ہوگیا تو جناب پیغمبر علیہ السلام نے دشمنانِ خدا و رسول، اور بدخواہانِ انسانیت کے خلاف جہاد شروع کر دیا، ان دو دستوروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان جہان کے مالک ہوگئے، اس ارشاد کے بموجب کہ رسول اللہ کی پیروی میں تمہارے لیئے نیک نمونہ ہے، آپ لوگوں کو بھی چاہیئے کہ ان دو پختہ اصولوں پر مضبوطی سے جم جائیں، قبیلوں کو اتحاد کے رشتے میں پروئیں، خدا کے دشمنوں پر حملہ آور ہوں، اور قبیلوں کو انگریزوں کے آسیب سے محفوظ کر دیں۔

اس جگہ وطن برادری کا نکتہ بھی موجود ہے، صلح کے اوقات میں انگریز اور روس مسلمانوں کو اتفاق کا موقعہ نہ دیتے تھے اور ہمیشہ ان کے درمیان مخالفت و نفاق کا بیج بوتے تھے، اب یہ دشمن خود مصیبت میں مبتلا ہیں ہمیں چاہیئے کہ اس فرصت سے فائدہ اٹھائیں، اس فرصت سے غفلت، وطن اور اہلِ وطن سے غداری کے مترادف ہے جس شخص کے دل میں وطن کی محبت نہیں اُسے مرد نہ سمجھو، وہ انسانیت کیلئے باعثِ ننگ ہے، اس پر خدا کی لعنت ہو، اے خدا تو ان لوگوں کا مددگار ہو جو دینِ محمد کے مددگار رہیں

ان میں ہمیں شامل کر، اور ان لوگوں کو رُسوا کر جو دینِ محمد کی رسوائی کے درپے ہیں، اور ہمیں ان میں شامل نہ کر۔

وکیلِ تقدس مآب شیخ الاسلام — وکیلِ خلیفہ سید المسلمین السلطان المعظم
(مولوی) برکت اللہ — محمد کاظم یوزباشی

محرم الحرام ۱۳۳۶ھ (سرگذشتِ مجاہدین ج ۴ ص ۵۳۳)

شیخ الہند میدانِ عمل میں

یہی وہ فضا تھی جب شیخ الہند میدانِ عمل میں آئے، منصوبے کی یہ پیش رفت بہت حوصلہ افزا تھی، حالات کو سازگار بنانے کی جدوجہد مسلسل جاری تھی مایوسیوں کا اندھیرا چھٹ رہا تھا، مطلعِ اُمید پر ظفر مندی کے سورج کے طلوع ہونے کے آثار نظر آنے لگے تھے تو شیخ الہند نے اپریل ۱۹۱۵ء میں مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل بھیجا لیکن جنگ کی وجہ سے صورتِ حال اتنی پیچیدہ اور خطرناک ہو چکی تھی کہ چار مہینے مسلسل ہندوستان میں رہ کر دہلی سے سندھ تک مختلف مقامات پر رُکتے ہوئے سرحد سے نکلنے کی تدبیریں کرتے رہے، سب سے پہلا اور اہم مسئلہ روپئے کا تھا مولانا ابوالکلام آزاد نے اس مقصد کے لئے حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون سے ملاقات کی، انھوں نے بے تامل پانچ ہزار روپے پیش کر دیئے جو مولانا عبید اللہ سندھی کو بطورِ زادِ راہ دیدیئے گئے (سرگذشتِ مجاہدین ج ۴ ص ۵۵۶) اخراجات کے انتظام کے بعد ایک غیر معروف راستے سے اونٹ کے ذریعہ راتوں رات سفر کر کے بمشکل تمام حدودِ افغانستان میں پہونچے، یہاں پہونچنے پر موصوف کو جو مشکلات پیش آئیں وہ ان کی خود نوشت ڈائری میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

مولانا سندھی کابل میں رہ کر ملک کی آزادی کیلئے کوشش کرنے والوں سے ملاقاتیں کرتے رہے، ان کا نقطۂ نظر اور طریقۂ کار معلوم کر کے صحیح لائحہ عمل بناتے اور مرتب کرتے رہے، انھیں دنوں برلن میں جرمنی کی وزارتِ خارجہ کے تحت ایک انجمن "انڈین نیشنل پارٹی" بنائی گئی تھی جس میں ہردیال اور مولانا برکت اللہ بھوپالی وغیرہ شامل تھے اس پارٹی کی طرف سے راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ، ترکی اور جرمنی افسران کے ساتھ ایک مشن پر افغانستان

آئے ، مولانا سندھی کا اس مشن سے تبادلۂ خیال ہوتا رہا ، اس گفتگو میں مولانا سندھی کے ساتھ لاہور کے مہاجر طلبہ عبدالباری اور شیخ محمد ابراہیم بھی شامل تھے ، برلن مشن کے نظریات سے اختلاف کرتے ہوئے مولانا سندھی نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا اور برلن مشن نے اس کو تسلیم کرلیا ، برلن مشن میں کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جس نے اپنی عمر میں کبھی بھی افغانستان صوبۂ سرحد ، پنجاب ، سندھ اور بلوچستان دیکھا ہو اور مولانا سندھی کی ساری عمر ہی شمال مغربی ہند میں گذری تھی اسلئے ان کے پاس بہت سی ایسی معلومات تھیں جو کابل میں فوجی نقطۂ نگاہ سے بہت اہم اور قیمتی تھیں ، اس طرح مولانا سندھی اور ان کے ساتھیوں کی رائے غالب ہونے لگی اور فریقین ایکدوسرے سے بہت قریب ہوگئے۔

عارضی حکومت

مولوی برکت اللہ بھوپالی اور راجہ مہندر پرتاپ نے کابل میں ہندوستان کی ایک عارضی حکومت کی بنیاد ڈالی جس میں ترک اور جرمن بھی شامل تھے ، بعد میں مولانا سندھی اور جماعتِ مجاہدین کے وکیل مولانا محمد بشیر بھی عارضی حکومت میں شامل ہوگئے ، راجہ مہندر پرتاپ صدر ، مولانا برکت اللہ وزیرِ اعظم ، مولانا سندھی وزیرِ داخلہ مولانا محمد بشیر وزیرِ دفاع اور کمانڈر انچیف مقرر ہوئے ، اس عارضی حکومت نے آزاد حکومتوں کو کئی مشن بھیجے ایک وفد روس کی حکومت کو بھیجا گیا جس میں متھرا سنگھ اور ڈاکٹر خوشی محمد تھے ، ڈاکٹر خوشی محمد نوجوان آدمی تھے جالندھر کے رہنے والے تھے ، لاہور میڈیکل کالج میں دو سال تعلیم حاصل کی تھی اور نوجوان طلبہ کی تحریکِ ہجرت کے لیڈر تھے۔

ایک وفد ترکی حکومت کو بھیجا گیا جس میں عبدالباری بی اے اور ڈاکٹر شجاع اللہ تھے ، اس وفد کیلئے طے کیا گیا کہ ایران کے راستے سے استنبول پہونچے ، ایک دوسرا مشن عبدالقادر بی اے اور ڈاکٹر متھرا سنگھ پر مشتمل جاپان بھیجنے کا پروگرام بنایا گیا ، دونوں مشن روانہ ہوگئے ، مگر جاپان جانے والا وفد جس میں متھرا سنگھ اور عبدالقادر تھے گرفتار کرلیا گیا اور روسی حکومت نے ان لوگوں کو انگریزوں کے حوالے کردیا ، دوسرا وفد جو براہِ ایران استنبول جارہا تھا اُسے خود انگریزوں نے گرفتار کرلیا ، چاروں ممبر گرفتار کرکے لاہور لائے گئے ، ڈاکٹر متھرا سنگھ چونکہ ایک بم کیس میں مفرور تھے اس لئے انگریزوں نے انکو پھانسی دیدی اور باقی تینوں

افراد کو جیل بھیج دیا گیا۔

خدائی فوج

لاہور کے کچھ مسلمان طلبہ جو کالجوں میں پڑھتے تھے جذبۂ آزادی سے سرشار ہو کر ہندوستان سے ہجرت کر کے اور اس جذبے کے ساتھ کہ وقت آنے پر باقاعدہ انگریزوں سے جنگ کریں گے، یہ طلبہ یاغستان پہونچے اور پھر وہاں سے کابل گئے ان کا ارادہ تھا کہ ترکی پہونچ کر ترکی فوج میں شامل ہو جائیں اور محاذ پر جا کر انگریزوں سے ہونے والی جنگ میں عملی حصہ لیں، لیکن کابل کی حکومت نے انکو روک لیا، ان طلبہ کے ساتھ پشاور کے بھی کچھ لوگ شامل ہو گئے تھے، اسی دوران میں دارالعلوم دیوبند سے بھی کچھ حضرات کابل پہونچے جن میں مولانا منصور انصاری بھی تھے، مولانا سیف الرحمٰن دہلی سے یاغستان جاتے ہوئے کابل پہونچے، مولانا محمد بشیر جو جماعتِ اہلحدیث لاہور کے ایک معزز رکن تھے جماعتِ مجاہدین کی قیادت کیلئے کابل گئے، ان تمام لوگوں میں آزادی کا جوش بھرا ہوا تھا اور عسکری ذہن و مزاج رکھتے تھے اسلئے ان لوگوں نے اپنی تنظیم کا نام خدائی فوج رکھ لیا تھا۔

سرگرمیاں اور مشکلات

یاغستان سے کابل تک بغاوت اور انگریزی حکومت کے خلاف جنگ چھیڑ دینے کیلئے زمین ہموار کی جاتی رہی، افغانستان حکومت سے تعاون اور مدد حاصل کرنے، پروگرام اور طریقۂ کار طے کرنے کے سلسلہ میں مسلسل گفتگو ہوتی رہی، آزاد ممالک بالخصوص ترکی، جرمنی اور جاپان سے رابطہ پیدا کیا جاتا رہا لیکن سرحدی قبائل میں اجتماعی طور پر جہادِ آزادی کی روح نہیں پھونکی جا سکی تھی یعنی کوشش پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی تھی، کیونکہ انگریزوں کے کاسہ لیس پیروں اور ملاؤں نے ان قبائل میں یہ افواہ پھیلائی کہ بغیر امیر کے جہاد جائز نہیں، اس پروپیگنڈہ کا اثر ہونا بھی لازمی تھا، اسلئے اگر بعض قبائل میں جوش وجذبہ ابھرتا رہا تو اس کے مقابلہ میں دوسرے قبائل میں سرد مہری بھی بدستور باقی رہی، اسلئے کابل میں مجاہدینِ آزادی نے طے کیا کہ شیخ الہند کا جلد سے جلد ہندوستان سے حجاز جانا ضروری ہے تاکہ ترکی حکومت کے ذمہ داروں سے گفتگو کر کے انکی امداد کا قبائل میں اعلان کر دیا جائے تو قبائل میں غلط پروپیگنڈہ کرنے والوں کا جواب ہو جائیگا اور ان کے لئے کوئی بہانہ نہیں رہ جائے گا۔

شیخ الہند حجاز میں

شیخ الہند کو کابل اور یاغستان کی اطلاعات برابر ملتی رہیں، اور جب یہ اطلاع ملی تو حالات نے مزید انتظار کی مہلت نہیں دی اسلئے آپنے طے کیا کہ جتنی جلدی ممکن ہو ہندوستان چھوڑ دیں۔

جنگ کی وجہ سے ملک میں حالات تیزی سے بدلتے جارہے تھے پابندیاں بڑھتی جارہی تھیں، لیڈروں کی آمد ورفت پر نگرانیاں شروع کردی گئی تھیں، پورے ملک میں سی، آئی، ڈی کا جال بچھا دیا گیا تھا جو ہر طرف اور ہر جگہ خطرات کی بو کو سونگھتی پھرتی تھی، بہت سے مسلم لیڈروں کو گرفتار کرکے جیلوں میں ڈالدیا گیا تھا اور باقی لیڈروں کی گرفتاری کی افواہیں بڑے زوروں پر پھیلی ہوئی تھیں، اسلئے شدید خطرہ تھا کہ شیخ الہند کو بھی گرفتار کرلیا جائیگا، اور شیخ الہند کی گرفتاری کا مطلب یہ تھا کہ دس سالہ جدوجہد رائیگاں ہوجائے، بغیر لیڈر کے تحریک کیسے چل سکتی ہے؟

۱۹۱۵ء میں شیخ الہند بہ ارادۂ حج نکلے، ان کے رفقاءِ سفر میں مولانا محمد میاں امیٹھوی، مولانا عزیر گل پشاوری، حکیم نصرت حسین، مولانا محمد مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولانا محمد سہول بھاگلپوری، حاجی خان محمد، مولوی مطلوب الرحمٰن دیوبندی، حاجی محبوب خان سہارنپوری، حاجی عبدالحکیم سرونجی، مولوی وحید احمد مدنی شامل تھے، مشہور تھا کہ خفیہ پولیس والوں کا آٹھ نفری وفد شیخ الہند کے ساتھ جارہا ہے، بمبئی تار دیا گیا کہ مولانا کو گرفتار کرلیا جائے مگر صورتِ حال ایسی تھی کہ گرفتاری نہ ہوسکی، بعد میں جہاز کے کپتان کو تار دیا گیا مگر وہاں بھی ناکامی ہوئی، شیخ الہند بخیریت مکہ مکرمہ پہونچ گئے اور اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔

شیخ الہند نے مکہ پہونچکر مکہ کے ترکی گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی، غالب پاشا نے مدینہ کے گورنر بصری پاشا کے نام خط لکھ کر دیا کہ مولانا موصوف کی ملاقات انور پاشا اور جمال پاشا سے کرادی جائے، چنانچہ دورۂ مدینہ کے وقت یہ دونوں فوجی کمانڈر مدینہ آئے، شیخ الہند نے ان سے ملاقات کرکے اپنا مقصد بتایا اور اپنے منصوبے کی وضاحت کی، دونوں نے خوشی کا اظہار کیا اور چند وثیقے لکھ کر شیخ الہند کو دیئے جن میں آزاد قبائل کو ہر طرح کا تعاون دینے کا یقین دلایا گیا تھا، انور پاشا نے شیخ الہند سے کہا کہ آپ خود آزاد قبائل میں پہونچ جائیں اور

اپنے پہونچنے سے پہلے یہ تحریریں وہاں کے باشندوں کو پہونچادی جائیں یہ وثیقہ کامل احتیاط کے ساتھ محفوظ کرکے مولانا ہادی حسن کو دیا گیا وہ لے کر سیدھے بمبئی آئے، پولیس تاک میں تھی، تلاشی ہوئی، مگر پولیس کوئی مشتبہ چیز برآمد نہ کرسکی، وثیقہ صندوق میں محفوظ رہا، ادھر شیخ الہند مدینہ سے مکہ واپس آئے تاکہ غالب پاشا سے آخری ملاقات کرکے استنبول کیلئے روانہ ہوجائیں تاکہ خلیفۃ المسلمین سے براہِ راست ملاقات کرکے فرمانِ شاہی حاصل کرلیں، ۱۹۱۶ء میں آپ مکہ مکرمہ پہونچے مکہ کا گورنر غالب پاشا طائف گیا ہوا تھا، شیخ الہند مکہ سے طائف پہونچے تاکہ فوری ملاقات کرکے ترکی روانہ ہوسکیں۔

وہ چمن ہی لٹ گیا جسمیں بہار آنے کو تھی

قضا و قدر کا فیصلہ کچھ اور ہوچکا تھا۔ انگریز حجاز میں ترکی حکومت کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھا اور ہر ممکن کوشش کررہا تھا کہ شریف حسین کو آلہ کار بناکر ترکی حکومت کے خلاف عربوں سے بغاوت کرادے، کرنل لارنس اور سر ہنری میکموہن پوری سرگرمی سے اس سازش کو کامیاب بنانے میں لگے ہوئے تھے مسلسل کوششوں کے باوجود جب عربوں میں اشتعال پیدا نہ ہوسکا تو انگریزوں نے حجاز جانے والے ان تمام جہازوں کو جو غلہ لے کر جارہے تھے راستہ میں روک لیا اور ہر طرف ناکہ بندی کرلی اور کسی طرف سے بھی ایک دانہ سرزمینِ حجاز میں پہونچنے نہ دیا، پورے حجاز میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی اور انگریز یہی چاہتا تھا، میر صادق و میر جعفر کی روحوں کا ننگا ناچ حجاز میں شروع ہوگیا، فاقہ مست بدوؤں کا ایک جتھہ لے کر عبداللہ بیگ نے طائف پر چڑھائی کردی مگر ترکی فوج نے اس کو مار بھگایا، اسی طرح مکہ مدینہ، جدہ اور ینبع میں بھی شریف حسین کے ذریعہ بغاوت کرادی اور پھر بغاوت کا ایک سلسلہ چل پڑا، باغیوں اور ترکی پولیس میں باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی ایک طرف ترکی فوج تھی اور دوسری طرف شریف حسین انگریزی ہتھیاروں سے لیس فوج لے کر حملہ آور تھا اور جدہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔

اسی وجہ سے شیخ الہند کو زیادہ دیر تک طائف میں رکنا پڑا۔ بالآخر ۲ شوال ۱۳۳۴ھ کو اپنے تین رفیقوں کو لیکر مکہ مکرمہ روانہ ہوئے تاکہ وہاں سے کسی صورت سے نکلنے کی کوشش کریں

اور استنبول پہونچ جائیں، آپکے ایک ساتھی مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری جدہ میں تھے آپ نے جدہ جانا مناسب سمجھا، مگر دو ہفتہ جدہ میں رہ کر دوبارہ مکہ واپس آنا پڑا، اسی زمانے میں ہندوستان سے ایک سی، آئی، ڈی انسپکٹر بہاؤالدین کو خاص طور پر مکہ بھیجا گیا تاکہ شیخ الہند کی نقل وحرکت کی نگرانی کرتا رہے۔

حجاز میں انگریزوں کے پھیلائے اس فتنہ کا اثر ہندوستان پر بھی تھا، پورے ملک میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی، اس بے چینی کو فرو کرنے کیلئے انگریزوں نے خان بہادر مبارک علی اورنگ آبادی کو خفیہ طور پر مکہ بھیجا کہ مکہ کے علمارِ حرم سے ایک ایسا فتویٰ لائیں جس میں شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب قرار دیا گیا ہو، خان بہادر نے شریف حسین کے چاپلوس ملاؤں سے ایک استفتار اور اس کا جواب مرتب کرایا، جس میں ترکی قوم کو مطلقاً کافر لکھا گیا تھا اور آلِ عثمان کی خلافت سے انکار کیا گیا تھا اور شریف حسین کی بغاوت کو درست اور مستحسن قرار دیا گیا تھا شریفی علمار سے دستخط حاصل کر لئے گئے، مگر علمارِ حق اس فتوی پر دستخط کرنے میں متردد تھے، یہ فتویٰ شیخ الہند کے پاس دستخط کرنے کیلئے لایا گیا تو آپ نے سختی سے انکار کردیا۔

خوئے بدرا بہانہ بسیار

یہ استفتار اور فتویٰ دو مقصدوں کے تحت تیار کرایا گیا تھا ایک تو یہ کہ ہندوستان میں پھیلی ہوئی بے چینی کو کم کیا جائے، دوسرے یہ کہ شیخ الہند لازمی طور پر اس سے انکار کریں گے اسلئے انکو اس بہانے گرفتار کرانے میں سہولت ہوگی، چنانچہ یہی ہوا، آپ بھی اس سازش کو سمجھ گئے اور چاہا کسی طرح شریف حسین کی قلمرو سے نکل جائیں لیکن تقدیر کا قلم فیصلہ لکھ کر فارغ ہو چکا تھا، شریف حسین نے گرفتاری کا حکم جاری کر دیا، شیخ الہند اور مولانا وحید احمد کو روپوش کر دیا گیا، مولانا حسین احمد مدنی گرفتار کر لئے گئے، مولانا عزیر گل، حکیم نصرت حسین کو حراست میں لے لیا گیا اور کہا گیا کہ ان دونوں حضرات کو دو گھنٹے میں حاضر کرو، ورنہ تم دونوں کو گولی مار دی جائے گی، شریف حسین نے اپنے حکام سے مغرب کے وقت کہا کہ اگر عشار کے وقت تک لوگوں نے مولانا محمود الحسن کو حاضر نہیں کیا تو ان دونوں کو گولی مار دیں اور مولانا کے مطوف کی مطوفی چھین لیں اور مطوف کو سو کوڑے لگائیں عشا کے وقت یہ باتیں شیخ الہند کو معلوم ہوئیں تو آپ از خود حاضر ہو گئے اور گرفتار ہو گئے

حکام نے ایک اونٹنی پر سوار کرا کے اور ساٹھ اونٹوں پر مسلح گارد کے پہرے میں جدہ روانہ کر دیا شیخ الہند کو ایک ماہ جدہ میں رکھا گیا کیونکہ کرنل ولسن جدہ سے باہر گیا ہوا تھا واپسی کے بعد اس نے ان لوگوں کو مصر بھیج دیا ۱۲ر جنوری ۱۹۱۷ء کو خدیوی آگبوٹ سے انکو قاہرہ روانہ کیا گیا اور دریائے نیل کے اس پار قاہرہ شہر کے بالمقابل سیاسی قیدیوں کے جیل خانے میں ڈالدیا گیا، فوجی عدالت میں مقدمہ ہوا، سب کو یقین تھا کہ پھانسی ہوگی، مگر بہ ظاہر ثبوت فراہم نہ ہو سکا اسلئے پھانسی کی سزا نہ دی جا سکی اور مالٹا کے قیدخانے میں بھیج دیا گیا۔

قضا و قدر کے کرشمے

یہ ہندوستان کی بدنصیبی تھی کہ کمند اس وقت ٹوٹی جب دو چار ہاتھ لب بام رہ گیا، ساری منصوبہ بندی ہو چکی تھی راستے کی مشکلات بڑی حد تک دور ہو چکی تھیں مگر افسوس کہ عربوں کی بغاوت اور جرمنی کی اچانک شکست نے وہ سارے راستے مسدود کر دیئے جن سے گذر کر آزادی کے اس کاروان کو جانا تھا، تحریک کا شیرازہ بکھر گیا، اور جب انگریزوں کو یورپ کی جنگ سے فرصت ملی تو انھوں نے تحریک کے نمایاں افراد کے خلاف کارروائی شروع کر دی پہلا کام یہ کیا کہ انگریزی حکومت نے افغانستان پر دباؤ ڈال کر کابل میں عارضی حکومت بنانے والوں کو اپنی حدودِ سلطنت سے نکال دینے پر مجبور کیا جس کے نتیجے میں شیخ محمد ابراہیم، مولوی محمد علی قصوری اور مسٹر عزیز احمد کو اسکول کی ملازمت سے برطرف کر کے شہر بدر کر دیا گیا اول الذکر دونوں حضرات نے یاغستان میں رہنے کا فیصلہ کیا، مولانا منصور انصاری اور مولانا سیف الرحمٰن کابل سے سیدھے یاغستان روانہ کر دیئے گئے، مولانا عبید اللہ سندھی کو بھی انگریزوں کے ایما سے کابل گورنمنٹ نے نظر بند کر دیا اور ان کے بیس پچیس ساتھیوں کو بھی انھیں کے ساتھ رکھا، مولانا سندھی کے آدمیوں میں سے رحمت علی زکریا کسی طرح قید خانے سے نکل بھاگے اور انقلاب روس کے بعد بخارا پہونچے اور ساری زندگی وہیں گذار دی۔

افغانستان میں تختِ حکومت پر یکے بعد دیگرے آنے والوں میں امیر نصر اللہ خان کے ذریعہ انگریزوں نے یاغستان میں پانی کی طرح روپیہ بہایا اور بڑے بڑے پیروں اور ملاؤں کو خرید کر اعلان کرایا کہ جب تک امیر کابل اعلانِ جہاد نہ کریں جہاد کرنا جائز نہیں اس لئے امیر نصر اللہ خان کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کیا جائے سیکڑوں اور ہزاروں آدمیوں کو روپیہ کا لالچ دیکر

اس کام پر لگایا گیا کہ وہ گاؤں گاؤں جاکر لوگوں سے تحریری بیعت حاصل کریں اور یہ کاغذات امیر نصراللہ خان والیِ کابل کے پاس بھیج دیئے جائیں، والیِ کابل تو انگریزوں کا زرخرید ہی تھا اس نے سارے کاغذاتِ بیعت ردی کی ٹوکری میں ڈالدیئے، مجاہدین اعلانِ جہاد کا انتظار ہی کرتے رہے اور سست ہوگئے اور دوسری مختلف کارروائیوں سے ان کے بھڑکے ہوئے جذبات کو سرد کردیا گیا اور کابل گورنمنٹ کے تعاون سے یاغستان میں رہنے والے مجاہدینِ آزادی کو بے دست وپا بناکر اس تحریک کو انگریزوں نے ہمیشہ کیلئے دفن کردیا۔

آتش فشاں سرد ہوگیا

کابل میں قائم ہونیوالی حکومتِ موقتہ جسکے صدر راجہ مہندر پرتاپ، مولانا برکت اللہ بھوپالی وزیرِاعظم مقرر ہوئے، مولوی محمد علی قصوری کو وزاتِ خارجہ کا منصب سونپا گیا، مولانا محمد بشیر امیرالمجاہدین یاغستان کو وزارتِ دفاع پر مامور کرنے کے علاوہ یاغستان میں لشکر تیار کرنے کا ذمہ دار بنایا گیا اور حملے کی ایک منظم اسکیم تیار کرلی گئی اس کے ارکان نے امیر حبیب اللہ خاں سے پشت پناہی کی درخواست کی، اس نے سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کیا اور اظہارِ خلوص کیلئے اس نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اسلحہ کے کارخانے میں جتنے انگریز کام کرتے تھے سب کو برطرف کردیا، دوسری طرف انگریز ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے اور انھوں نے ایک بہت بڑے پیر کو اپنا ہم نوا بنالیا جسے افغانستان میں وسیع اثر و رسوخ حاصل تھا بلکہ خود امیر حبیب اللہ خان بھی اسی کا معتقد تھا، امیر نے غائبانہ دعاءِ خیر کیلئے ہندوستان پر حملے کے منصوبے کا ذکر کیا، پیر نے کہا کہ ٹھہرو، میں تین دن استخارہ کرنے کے بعد جواب دوں گا چوتھے روز بتایا کہ ہندوستان پر حملہ افغانستان کیلئے تباہی کا موجب ہوگا۔ (مشاہداتِ کابل و یاغستان ص ۳۴)

اسکے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہوگیا، کہا جاتا ہے کہ اس کارکردگی کے صلے میں انگریزوں نے اس پیر کو پچاس لاکھ روپئے دیئے اور امیر حبیب اللہ خاں کو آٹھ کروڑ روپئے کا لالچ دیا گیا، اگر یہ درست ہے تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیئے، ساڑھے آٹھ کروڑ روپیہ اتنے بڑے کام کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا اگر افغانستان حملہ کردیتا اور لڑائی چھڑ جاتی تو اس سے بدرجہا زیادہ رقم حفظ و دفاع کی تدبیروں میں صرف ہوجاتی، جانی نقصان اسکے علاوہ ہوتا، یہ بھی ناممکن

نہیں تھا کہ انگریزوں کے ہاتھ سے ہندوستان نکل جاتا اور گذشتہ چالیس سال کی تاریخ دوسرے رنگ میں لکھی جاتی۔

تحریک سے متعلق رپورٹیں

پولیٹیکل اینڈ سیکرٹ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے مرتب کی ہوئی رپورٹ جو انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے جسکی مائیکروفلم ہندوستان آچکی ہے اس کے دیکھنے سے اس تحریک کی اہمیت اور ہمہ گیری روشن ہوجاتی ہے، برطانوی حکومت کے محکمۂ سی، آئی، ڈی نے جو رپورٹیں حکومت کو بھیجی ہیں اسکی ضخامت ایک ہزار صفحات سے زائد ہے، اس میں اس تحریک کے ایک ایک گوشے اور گوشے کو بڑی باریک بینی سے دیکھ کر حکومت کو رپورٹ دی گئی ہے، مگر حیرت ہے کہ اس تحریک کے رہنماؤں نے کتنی رازداری سے اس تحریک کو چلایا کہ اتنی تلاش وجستجو، چھان بین اور کریدکے باوجود بھی تحریک کے قائد کی صحیح نشاندہی نہیں کیجا سکی۔

یہ فائل انڈیا آفس میں استغاثہ از ملک معظم بنام عبید اللہ وغیرہ مدعا علیہم، کے نام سے تقریباً ایک ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اس استغاثہ کی بنیاد پر پورے ہندوستان اور بیرونِ ہند میں گرفتاریاں کی گئیں ۵۹ افراد کے نام وارنٹ جاری کئے گئے اور دوسو آدمیوں کی چھان بین کی گئی۔ اور یہ سب کے سب مسلمان تھے، اس فائل میں بیس افراد کے بیانات لئے گئے ہیں جو فائل میں درج ہیں اور بقیہ حضرات کے متعلق لکھا گیا ہے کہ وہ مفرور ہیں، جن میں چھ حضرات ایسے ہیں جن کو استغاثہ میں مدعا علیہم تو نہیں بنایا گیا ہے لیکن پولیس نے بطورِ شہادت اوران لوگوں سے اپنے کام کی بات اگلوائے اور تائیدِ مقدمہ کیلئے بیانات لئے، اس طرح کل بیس افراد کے بیانات اس سرکاری فائل میں شامل ہیں، جو پانچ سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، بیان دینے والے حضرات میں مولانا احمد علی گوجرانوالہ، مولوی عبید اللہ سکھروی، مولوی ابو محمد احمد جہلم، سید ہادی حسن (مظفر نگر)، مولانا احمد اللہ (پانی پت)، مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن چاندپوری (بجنور)، مولوی مطلوب الرحمٰن (دیوبند)، مولانا محمد سہول بھاگل پوری (دربھنگہ بہار)، مولوی محمد مبین (دیوبند)، مولوی منظر الدین (شیر کوٹ)، مولوی انیس احمد بی اے علیگ مولوی محی الدین قاضی بھوپال (مرادآباد)، نذیر احمد (گجرات)، مولوی محمد حنیف (دیوبند)،

مولوی محمد مسعود (دیوبند)، مولانا محمد جلیل (دیوبند)، عبدالباری بی اے (جالندھر)، شجاع اللہ (لاہور)، عبدالحق (شاہ پور) ان حضرات کے علاوہ دو سو حضرات کے نام اس کیس میں اور آئے ہیں جن کا اس فائل میں "ریشمی خطوط کے کیس میں کون کیا تھا؟" کے عنوان سے ہر ایک کا تعارف کرایا گیا ہے جو دو سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

اس ضخیم فائل میں محکمہ جاتی کارروائیاں مثلاً ٹیلی گرام یا آرڈر جو وائسرائے یا دوسرے اعلیٰ افسران کی طرف سے دیئے گئے یا خود انکو دوسرے ماتحت افسران نے دیے ہیں، سی آئی ڈی رپورٹوں کے پیش نظر پورے کیس کا خلاصہ، گواہان کے بیانات، خطوط کے ترجمے اور ریشمی خطوط کے کیس میں کون کیا ہے؟ درج ہے، اس فائل میں وائسرائے نے فارن ڈپارٹمنٹ کو جو رپورٹ ۱۵ر ستمبر ۱۹۱۶ء کو بھیجی ہے اس کا خلاصہ کچھ اسطرح ہے۔

> "محمود الحسن (حضرت شیخ الہند) مدینہ منورہ کے نام عبیداللہ کا کابل سے تحریر کردہ ایک خط ۹ر جولائی کو قاعدے حکام کے حوالے کیا ہے اور اس نے مکمل تفصیل بھی بتا دی ہے، مکتوب نویس ایک مشہور ہندوستانی ہے جو بغاوت کیلئے ورغلاتا رہتا ہے، وہ گذشتہ سال حجاز گیا تھا، پھر ہندوستان کے راستے سے کابل پہونچا تھا جبکہ جرمن مشن کی آمد کو تھوڑا عرصہ گذرا تھا جرمن سے اس کا قریبی تعلق ہے، مکتوب الیہ دیوبند کے مذہبی مدرسے سے تعلق رکھتا ہے وہ ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۵ء میں حجاز چلا گیا جہاں وہ غداروں کے بدنام گروہ کا سرغنہ بنا ہوا ہے، قاصد ایک ہندوستانی باشندہ ہے جو لاہوری طلبہ کے ساتھ کابل گیا تھا اور ۱۹۱۵ء میں ہندوستانیوں کے ساتھ شامل ہو گیا تھا جو اس وقت کابل میں ہیں خط کا خلاصہ یہ ہے۔
>
> جرمن مشن کا اعزاز کے ساتھ استقبال کیا گیا، لیکن وہ اپنے مشن میں ناکام رہے کیونکہ ترکی نے افغانستان کیلئے فوجی جوانوں، افسروں، اسلحہ اور نقد امداد کا تعین کرنے اور اُسے مہیا کرنے نیز افغانستان کے ساتھ میثاق کرنے سے انکار کر دیا ہے، لیکن اگر ترکی دونوں باتوں پر رضامند ہو جائے

اور کافروں کی کامیابی کی صورت میں افغانستان کی سالمیت کے تحفظ کا وعدہ کرے تو افغانستان جہاد میں شریک ہونے کو تیار ہے، دریں اثنا امیر نصر اللہ خاں والیِ افغانستان آزاد قبائل میں اپنے اثر و رسوخ سے کام لے رہے ہیں، دو جماعتیں بنائی جا رہی ہیں (الف) مسلم نجات دہندہ (جنود ربانیہ) جس کا مقصد مسلمان بادشاہوں کو متحد کرنا ہے سلم سلاطین، بادشاہ اور امیر اس کے سرپرست ہوں گے، اس میں گیارہ فیلڈ مارشل ہوں گے جن میں پانچواں فیلڈ مارشل شریفِ مکہ ہے، نیز بہت سے افسران نیچے درجے کے ہیں، بہت سے ہندوستان میں شامل ہوں گے جو اپنی باغیانہ حرکات کے لئے بدنام اور مشتبہ ہیں۔

(ب) حکومتِ موقتہ ہند (جو برکت اللہ بھوپالی اور مولانا عبید اللہ سندھی نے بنائی تھی) جو ہندوستان کو آزاد کرائے گی، فوجی معاہدہ (میثاق) کریگی اس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ، مولانا برکت اللہ وزیرِ اعظم اور وزیرِ امور ہند عبید اللہ ہوں گے، اس کی کارروائی کا خلاصہ اس طرح کیا گیا ہے:

(۱) یہ جماعت امیر کو ہندوستان کا مستقل فرمانروا تسلیم کریگی بشرطیکہ افغانستان جنگ میں شریک ہو جائے، یہ بات امیر کے سامنے رکھی گئی تھی لیکن پھر اس خیال کو ترک کر دیا گیا کیونکہ اس وقت تک جہاد میں شامل ہونے پر آمادہ نہ تھا،

(۲) روس کو سفارت بھیجی گئی ہے، جس کے نتائج افغانستان کے لئے مفید ہوئے، روسی نمائندہ کابل آنے والا ہے۔

(۳) قسطنطنیہ اور برلن کو براہِ ایران سفارت روانہ کی جا رہی ہے۔

(۴) جاپان اور چین کو سفارت روانہ ہونے والی ہے۔

(۵) ہندوستان کو سفارت بھیجی گئی ہے لیکن کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔

(۶) دوسری سفارت اب برلن اور ہندوستان کو روانہ کی جا رہی ہے۔

اس خط میں جو اطلاعات دی گئی ہیں ان کی تشریح اور وضاحت قاصد کے بیان سے ہوتی ہے اور ان کی تصدیق روس ترکستان اور جاپان کو سفارتیں بھیجنے سے ہوتی ہے، اس کی مزید تصدیق دوسری اطلاعات سے ہوتی ہے اور دوسرے واقعات کے ساتھ اس کا سلسلہ مل جاتا ہے جو ہمارے علم میں ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کابل میں سازش تیار ہے جس کی خبریں ہندوستان اور حجاز تک پھیلی ہوئی ہیں اس سازش کی تفصیلات اگرچہ مضحکہ خیز نظر آتی ہیں لیکن اگر روک تھام نہیں کی گئی تو خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں، ہم ہندوستان میں ایک ہی وقت میں پنجاب، دہلی، سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں چھاپے مارنے اور ان چند اشخاص کو گرفتار کرنے کے انتظامات کر رہے ہیں جو اس سازش میں واضح طور پر ملوث ہیں مکمل تفصیل اور کاغذات اگلی ڈاک سے روانہ کئے جائیں گے۔

ہمیں اب معلوم ہوگیا ہے کہ ڈاکٹر متھرا سنگھ اس سفارت میں شامل تھا جو روسی ترکستان کو گئی تھی اس نے شمشیر سنگھ کے نام سے سفر کیا تھا غالباً یہ وہی شمشیر سنگھ ہے جس کا تذکرہ آپ نے بحوالۂ بالا ٹیلیگرام میں کیا ہے، عبدالقادر خان ان لاہوری طلبا میں شامل ہے جن کا اوپر تذکرہ ہوا، وہ لاہور یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے، تیسرا نام مشتبہ ہے ہمیں امید ہے کہ ان اشخاص کی حوالگی کیلئے حکومتِ روس سے سختی سے اصرار کیا جائے گا۔

ریشمی خطوط کیس میں کون کیا تھا؟

اس عنوان سے اس فائل میں ہندوستان بھر سے ان دو سو حضرات کے نام دیئے ہیں جو اس تحریک کی فوجی تنظیم میں شامل کئے گئے تھے، آپ جب اس فہرست پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو حیرت ہوگی کہ حکومت نے کتنی زبردست چھان بین کی ہے صوبۂ سرحد و سندھ سے لیکر دہلی، اترپردیش، بہار، بنگال تک کے علمار، رؤسا اور معزز مسلمانوں کے نام ملیں گے اور لطف یہ ہے

کہ تمام حضرات کے مکمل پتے، موجودہ مصروفیت سب کچھ تفصیل سے بتایا گیا ہے، نیز اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ اس فوجی تنظیم میں اس شخص کا کیا عہدہ تھا اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کا مزاج کیسا ہے، مذہبی عقائد کیا ہیں، اس کے جذبات کیا ہیں، سی آئی ڈی نے پورے ہندوستان میں سے ان دوسو افراد کو چھانٹ کر نکالا ہے جو ہندوستان میں بغاوت کا پروگرام چلانے کے وقت انکو اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی تھیں، مشاہیر میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا آزاد سبحانی (بلیادی)، مولانا حافظ عبداللہ غازیپوری، مولانا احمد علی شیخ التفسیر لاہور، ڈاکٹر انصاری، مولانا عبدالباری لکھنوی، حکیم عبدالرزاق برادر ڈاکٹر انصاری، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا عزیر گل پشاوری استاذِ دارالعلوم دیوبند، ڈاکٹر برکت اللہ بھوپالی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری صاحب بذل المجہود، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا محمد یوسف گنگوہی نبیرۂ مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا عبدالرحیم رائپوری وغیرہ وغیرہ

مُہاجر طلبہ جنگِ آزادی کا جو محاذ ہندوستان کی سرحد پر سرگرمِ عمل تھا اسکے اثرات اندرونِ ملک پڑ رہے تھے، سیاسی رہنماؤں کا اعلیٰ طبقہ تو اس تحریک کے نشیب وفراز سے ہمہ وقت باخبر رہتا تھا اور جو ممکن تعاون حالات کے پیشِ نظر دیا جا سکتا تھا وہ تعاون بھی دیتے رہے لیکن اس تحریک کے اثرات انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں پہونچ جائیں، نوعمر اور نوخیز طلبہ اس سے اس درجہ متاثر ہو جائیں کہ وہ آزادی حاصل کرنے کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنا وطن، اپنا گھر بار چھوڑ دیں، جوانی کی اُمنگوں کو آزادیِ وطن پر نثار کر دیں یہ بڑا حیرتناک واقعہ تھا اور یہ اس تحریک کی بہت بڑی دین ہے، ہم اس تحریک کے حالات میں جب پڑھتے ہیں کہ پنجاب کے کئی کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ خفیہ طور پر اپنے وطن سے نکلے اور آزاد قبائل میں پہونچکر اپنی خدمات مجاہدینِ آزادی کو پیش کر دیں تو بڑی حیرت ہوتی ہے، اس سلسلہ میں جو مولانا عبیداللہ سندھی اور شیخ الہند پر مقدمۂ بغاوت چلایا گیا تھا اسی مقدمہ کی فائل میں ان مہاجر طلبہ کا ذکر بھی بڑی اہمیت سے کیا گیا ہے، اس مقدمہ کی فائل میں "افغانستان کو پنجابی طلبہ کا مشن" کے عنوان سے جذبۂ آزادی سے سرشار ہو کر وطن کو خیرباد کہنے والے طلبہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

اس سال فروری ۱۹۱۵ء میں پنجاب کے مختلف کالجوں کے پندرہ طلبہ خفیہ طور سے اپنے گھروں سے روانہ ہوئے اور شمال مغربی سرحد کو عبور کرکے آزاد علاقے میں پہونچے، پھر دوسرے طلبہ نے ایک ایک کرکے یا چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی صورت میں ان کی پیروی کی، بعد کی اطلاعات سے ظاہر ہوا کہ ان کی اس کارروائی کا محرک سلطنتِ برطانیہ کی مخالفت کا جذبہ تھا، ترکی سے برطانیہ کی جنگ اس کا سبب تھی، جس کے خلاف غیر وفادار واعظوں اور مبلغوں نے نہایت زبردست مکروہ پروپیگنڈہ کیا تھا، ان جوانوں کا ارادہ اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ پہلے تو برطانوی قلمرو سے نکل جائیں اور پھر جس کام کیلئے بھی ان کی صلاحیت ہو جیسے جاسوس، قاصد، واعظ یا مبلغ جہاد یا فوجی اس کام کیلئے وہ اپنی خدمات ترکوں کو پیش کردیں، انھیں امید تھی کہ افغان گورنمنٹ کی عنایت اور تعاون سے وہ ترکی پہونچ سکیں گے، انھیں توقع تھی کہ افغانستان برطانیۂ عظمیٰ سے برسرِ جنگ ہونے والا ہے، یا ہندوستان کے غیر وفادار لوگ بدگمانیاں پیدا کرکے اور دباؤ ڈال کر اس لڑائی پر مجبور کردیں گے۔

۱۹۱۵ء میں جو تفتیش اور تحقیقات کی گئیں اس سے اہم واقعہ کا انکشاف ہوا کہ صوبۂ سرحد تک طلباء کے سفر کا انتظام پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں وہابیوں کی ایک جماعت کرتی تھی، اور برطانوی قلمرو کے پار کرلینے کے بعد طلباء کو سرحد پار کرکے وہابی بُنیر پہونچا دیتے تھے جو آزاد علاقے میں وہابیوں کی بستی ہے، جن کو مجاہدین یا متعصب ہندوستانی کہا جاتا ہے

(تحریکِ شیخ الہند اُردو ترجمہ ص ۱۶۶)

سی آئی ڈی کی رپورٹ کے مطابق فروری ۱۹۱۵ء میں پنجاب کے مختلف کالجوں سے جانے والے طلبہ جن کے سینے آزادی کے جذبے سے معمور تھے انھوں نے جانے سے پہلے مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، مولانا فضلِ الٰہی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی سے مشورے کئے تھے، ان مہاجرین میں سب سے اہم وہ طلباء ہیں جن کے نام اس مقدمۂ بغاوت میں بطورِ سازشی شامل کئے

گئے ہیں، ان میں عبدالباری بی اے، عبدالحق، عبدالقادر، عبدالمجید خان، عبدالرشید، اللہ نواز خان، ڈاکٹر خوشی محمد، محمد عبداللہ بی اے، محمد حسن بی اے، شاہ نواز خان اور شجاع اللہ شامل ہیں۔

ستمبر ۱۹۱۵ء میں عبدالکریم برلاسی عرف صدرالدین، میڈیکل کالج کا ایک اسٹوڈنٹ بھی مولانا آزاد کے مشورے سے مجاہدین کی امداد کیلئے مجاہدین کے کیمپ میں گیا وہاں اس نے مجاہدین کی طبی امداد کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور اس نے وہ تمام خدمات انجام دیں جو اس کو سپرد کی گئیں۔ بعد میں وہ کابل چلا گیا اور کابل میں بغاوت کی تحریک چلانے والوں کے پاس چلا گیا جولائی ۱۹۱۶ء میں وہ ہندوستان واپس آیا۔

اسی طرح کوہاٹ کے چار طلبہ دلوں میں جذبۂ آزادی لے کر اپنے وطن سے نکل پڑے اور ہندوستان سے ہجرت کرکے افغانستان پہونچے، پشاور کالج سے لطیف خان اور کوہاٹ اسکول سے فقیر شاہ، پیر بخش، اور کوہاٹ پولیس سے عبدالمجید نے ہجرت کی اور ہندوستان چھوڑ دیا، مگر پاسپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے گرفتار ہوئے، مگر پھر رہائی کے بعد افغانستان پہونچے اور تحریک میں حصہ لیا۔

شیخ الہند آزاد قبائل میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے اور دین کے نام پر کٹ مرنے اور ملک کو آزاد کرانے کے جذبے کو برانگیختہ کرنے کی غرض سے اپنے مخصوص شاگردوں کو ان علاقوں میں بھیجتے رہے جن میں خصوصیت کے ساتھ مولانا سیف الرحمٰن، مولانا فضلِ ربی، مولانا فضلِ محمود، حاجی ترنگ زئی اور مولانا عبدالعزیز نے ان علاقوں میں جاکر اور شب و روز چل پھر کر قبائلیوں کو جذبۂ جہاد سے معمور کیا، ان حضرات کی کوششوں کی وجہ سے بہت سے قبائلیوں نے انگریزوں سے مختلف لڑائیوں میں بھرپور حصہ لیا۔

شمعِ آزادی کے پروانے

سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۱۷ء

شیخ الہند مولانا محمود حسن۔

ازہرِ ہند دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث تھے تقریباً پچاس سال مسندِ صدارت پر فائز رہے، اپنی ریشمی رومال کی تحریک کیوجہ سے عالمی شہرت کے مالک تھے اس تحریک کی روحِ رواں آپ ہی تھے، راز افشا ہونے کے بعد انگریزوں نے گرفتار کرلیا، جدہ میں ایک مہینہ رکھنے کے بعد مصر بھیجدیا، فوجی عدالت میں مقدمہ ہوا، بغاوت کا فردِ جرم تھا، سب کو یقین تھا کہ پھانسی کی سزا ہوگی مگر پولیس جرم ثابت نہ کرسکی اسلئے قاہرہ کے قید خانہ سیاہ،، سے جزیرۂ مالٹا بھیجدیا، پانچ سال برطانوی سامراج کی چیرہ دستیوں کو بھگت کر آپ ہندوستان تشریف لائے، ہندوستان کے مشاہیر علماء و زعماء نے بمبئی میں باب الہند پر شاندار استقبال کیا، اور متفقہ طور پر آپ کو شیخ الہند کا معزز خطاب دیا گیا۔

یہاں نیشنلسٹ مسلمانوں کی تنظیم جمعیۃ علماء ہند کے صدر بنائے گئے، جب آپ ہندوستان آئے تو تحریکِ خلافت اور نان کوآپریشن کی تحریک شباب پر تھی اسی سلسلہ میں انگریزوں کے قائم کردہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کا بائیکاٹ کیا گیا تھا، علی گڈھ کے طلبہ نے بھی تعلیمی مقاطعہ میں حصہ لیا اسلئے مقتدر زعماء نے ایک قومی یونیورسٹی کا خاکہ بنایا، جس کا افتتاح شیخ الہند نے کیا اور اس کا سنگِ بنیاد رکھا آج وہی نیشنل یونیورسٹی "جامعہ ملیہ دہلی" کے نام سے ایک وسیع زمین پر واقع ہے اور اس کا تعلیمی فیضان عام ہے، ہندوستان واپسی کے کچھ ہی عرصے کے بعد ۲۰ر نومبر سنہ ۱۹۲۰ء کو خاکدانِ ارضی کو چھوڑ کر خدا کے جوارِ رحمت میں چلے گئے۔

مولانا حسین احمد مدنی۔

پیکرِ عمل، سراپا جد و جہد، ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں میں پہاڑ جیسے ٹھوس عزم و ارادہ کے مالک شیخ الہند کے جانشین، قید خانۂ مالٹا کے ہم نشین، ان کے مشن کو اپنی زندگی کے اخیر لمحوں تک جاری رکھنے والے، اسلامی ہند کے شیخ الاسلام، دارالعلوم دیوبند کے صدر و شیخ الحدیث، ساڑھے تین ہزار علماء کے جلیل القدر استاذ و مقتداء، لاکھوں انسانوں کے مرشدِ کامل تھے، انگریزوں کی حکومت سے سخت نفرت رکھتے تھے تحریکِ آزادیِ ہند میں وہ کون سی مصیبت و مشقت نہیں جھیلی؟ مگر اپنے مشن میں مصروف رہے، جمیعۃ علماء ہند کے ۱۹۴۰ء سے تا دمِ اخیر صدر رہے کئی بار برطانوی سامراج کی عدالتوں میں پھانسی کی سزا سے بچے، آزادی کے بعد اصلاح کے کاموں میں مصروف ہو گئے دینی خدمت و تزکیۂ نفوس کے مقدس مشن میں لگے رہے ۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو رہگرائے عالمِ آخرت ہو گئے، دیوبند میں قبرستانِ قاسمی میں آسودۂ خواب ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی۔

شیخ الہند کے تلمیذِ رشید، آپ کے دستِ راست تھے، نہایت ذکی اور ذہین و فطین، بہترین اسکیم ساز دماغ پایا تھا، برطانوی حکومت کی رپورٹوں میں ریشمی رومال کی تحریک میں انھیں کو تحریک کا بانی بتایا گیا ہے اور لکھا گیا ہے کہ عبید اللہ سندھی نے شیخ الہند کو اپنے منصوبے میں شریک کیا، آپ سکھ خاندان سے مسلمان ہوئے تھے، دیوبند میں تعلیم حاصل کی، شیخ الہند کے حکم سے کابل گئے، ریشمی رومال تحریک میں تمام عملی اقدامات آپ ہی کے رہینِ منت ہیں ساری سرگرمیوں میں آپ ہی کا ہاتھ کام کر رہا تھا، پوری زندگی جلاوطنی میں گذاری ہزاروں مصیبتیں جھیلیں طرح طرح کے مصائب برداشت کئے لیکن جدوجہدِ آزادی میں کسی طرح کی کمزوری نہیں آئی، افغانستان، ترکی، روس، عرب اور ایران وغیرہ جا کر تحریکِ آزادی کی کامیابی کیلئے راہیں تلاش کرتے رہے، ہندوستان سے باہر رہ کر ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد کرنے والوں سے مل کر انکی صحیح رہنمائی کرتے رہے کابل کی عارضی حکومت میں وزیرِ امورِ ہند رہے، تحریک کی ناکامی کے بعد کابل میں کچھ دنوں نظر بند رہے پھر رہا کر دیے گئے، کچھ دن عرب و حجاز میں

گذارے ۱۹۳۹ء میں جب کانگریسی وزارت برسرِ اقتدار تھی تو آپ سے قانونی پابندیاں اٹھائی گئیں تو آپ ہندوستان آئے، راقم الحروف نے بھی آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا ہے لاہور میں آپ نے قیام کیا، بیت الحکمہ قائم کرکے علما کو فلسفۂ ولی اللّٰہی کا درس دیتے تھے لیکن حیاتِ مستعار کے تھوڑے ہی دن باقی تھے کہ آپ سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے۔

حاجی ترنگ زئی۔

آپ کا اصل نام فضلِ واحد تھا انگریزی علاقہ پشاور میں دینی خدمت انجام دیتے تھے ضلع پشاور اور یاغستان میں ان کے مریدوں کی تعداد ہزاروں سے زیادہ تھی، اس دیار میں انتہائی مقبول و محترم تھے، تحریکِ شیخ الہند میں سرگرمی اور بہادری کے ساتھ حصہ لیا، یاغستان جو تحریک کا مرکز تھا اس کے انچارج رہے، انگریزوں سے کئی خون آشام لڑائیاں لڑچکے تھے اور انگریزی فوجوں کو شکست دی تھی جنگِ عظیم شروع ہونے کے بعد جب نئے جوش و جذبے کے ساتھ یاغستان میں انگریزوں کے خلاف جنگ کا آغاز ہوا تو اس میں ناکامی ہوئی اور یاغستان کا مرکز ختم ہوگیا۔ حاجی صاحب یاغستان سے نکل کر مہمند چلے گئے اور وہیں حیاتِ مستعار کے بقیہ لمحات گذار کر رہگرائے عالمِ آخرت ہوگئے۔

مولانا سیف الرحمٰن۔

مولانا سیف الرحمٰن قندھاری افغان تھے مولانا رشید احمد گنگوہی سے حدیث پڑھی تھی ریاستِ ٹونک اور مسجدِ فتحپوری دہلی کے مدرسوں میں تدریسی خدمات انجام دیں، شیخ الہند کے حکم سے تدریسی زندگی کو خیرباد کہا اور تحریک کے مرکز یاغستان گئے اور حاجی ترنگ زئی کے ساتھ انگریزوں سے جنگ میں برابر کے شریک رہے، تحریک کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے افغانستان حکومت پر دباؤ ڈال کر حدودِ افغانستان سے نکلوادیا آپ پھر یاغستان چلے گئے اور وہیں پوری زندگی بسر کی۔

مولانا احمد علی لاہوری۔

مولانا احمد علی جو امیرِ انجمنِ خدام الدین کے نام سے مشہور ہیں حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے کابل چلے جانے کے بعد آپ ہی نظارۃ المعارف کے مدیر اور ناظم رہے، پوری زندگی لاہور

میں گذاری، تفسیر قرآن میں آپ اپنی مثال تھے، تفسیر قرآن کا درس دیتے تھے فضلاءِ دیوبند ایک سال کیلئے لاہور جاکر موصوف سے فنِ تفسیر پڑھا کرتے تھے، سرکاری فائل میں جو ریشمی رومال تحریک سے متعلق ہے سب سے پہلا نام آپ ہی کا ہے، آپ شیخ الہند کی تحریک سے وابستہ تھے۔

مولانا سید ہادی حسن۔

یہ وہ بزرگ تھے جن کے پاس تحریک کے سلسلہ کی رقومات رہا کرتی تھیں پھر وہ بکس جسکی تلی میں غالب نامہ اور انور پاشا اور جمال پاشا کے پیغامات تھے انھیں کو سپرد کیا گیا تھا اور وہ ان کاغذات کو جان کو ہزاروں خطرات میں ڈال کر ہندوستان لے آئے اور ذمہ داروں کو دیے پولیس نے چھاپے مارے مگر گرفتاری کے بعد بھی کاغذات برآمد نہ کرسکی اور یہ طبع ہوکر سرحدی علاقوں میں تقسیم ہوئے آپ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے یہیں اپنے وطن میں عمرِ عزیز بسر کرکے راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔

مولانا آزاد سبحانی۔

آپ سکندر پور ضلع بلیا کے رہنے والے تھے مگر ساری زندگی کانپور میں بسر کی، مشاہیر زعماء میں آپ کا شمار تھا، کانپور کی مسجد جب ۱۹۱۳ء میں انگریزوں نے شہید کی اس وقت انگریزی حکومت کے خلاف اپنے جرأتمندانہ اقدام کے بعد آپ کا نام اُبھرا اور آپ پورے ملک میں روشناس ہوئے، مجاہدینِ آزادی میں نمایاں تھے طویل عمر پائی اپنے مخصوص خیالات و نظریات کی وجہ سے علماء میں کوئی قابلِ ذکر مقام نہ حاصل کرسکے آخر عمر میں ذہنی توازن بھی درست نہیں رہا، اسی حال میں سفرِ آخرت کیا۔ ریشمی رومال کی تحریک کی فائل میں آپ کا نام بھی شامل ہے، بہ ظاہر تحریک سے وابستگی نظر نہیں آتی، لیکن برطانوی حکومت کی نگاہ میں وہ انگریزوں کے دشمن ضرور تھے۔

مولانا عزیر گل پشاوری۔

مولانا عزیر گل صاحب قصبہ زیارت کاکا صاحب ضلع پشاور کے رہنے والے دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور استاذ، شیخ الہند کے خادمِ خاص تھے، تحریک میں ابتدا سے شریک رہے نہایت اہم اور خطرناک خدمات انجام دیتے رہے، شیخ الہند پہاڑی علاقوں کو ہدایات

انھیں کے ذریعہ بھیجا کرتے تھے، سی، آئی، ڈی ان کے پیچھے مستقل لگی رہتی تھی لیکن آپ بھیس بدل کر برابر آتے جاتے رہے، مکہ میں شیخ الہند کی روپوشی کے وقت مولانا عزیر گل کے بارے میں شریفِ مکہ نے کہا تھا کہ یہ اپنے ساتھی کو حاضر نہیں کرتے تو دو گھنٹہ کے اندر انکو گولی ماردو شیخ الہند کے ساتھ ساری مصیبتوں میں برابر کے شریک رہے، مالٹا کے قید خانے میں ساتھ رہے، مالٹا سے رہائی کے بعد ہندوستان واپس آئے اور شیخ الہند کے مکان پر رہتے رہے پھر مدرسہ رحمانیہ رُڑکی میں صدر مدرس ہوگئے وہیں ایک یورپین عورت کو مسلمان کرکے شادی کی اس بیوی سے کئی اولاد ہوئی بعد میں بیوی بچوں کو لے کر اپنے وطن پشاور چلے گئے اور اخیر دم تک وہیں رہے۔

مولانا منصور انصاری۔

تحریکِ شیخ الہند کے رکنِ رکین، پوری زندگی جلاوطنی میں گذاری، اصل نام محمد میاں تھا مولانا محمد قاسم نانوتوی بانیِ دارالعلوم دیوبند کے نواسے اور پیرجی عبداللہ صاحب ناظمِ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے صاحبزادے تھے انبیٹھہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے، تحریک کے پرجوش کارکن تھے، غالب پاشا کا خط لے کر ہندوستان آئے توراز فاش ہوگیا تھا، گرفتاریاں ہورہی تھیں لیکن بھیس بدل کر انھوں نے ہدایات کے مطابق سارے کام انجام دینے کے بعد چپکے سے پھر یاغستان چلے گئے، سی آئی ڈی نے بہت کوشش کی مگر ہاتھ نہ آئے۔ تحریک کی ناکامی کے بعد کابل سے نکال دیے گئے، امیر امان اللہ خان کے زمانے میں دوبارہ کابل آئے اور حکومت کے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے، افغانستان حکومت نے ترکی کو جو وفد بھیجا تھا اسکے لیڈر تھے، اس کے بعد وزیر مختار سفیرِ افغانستان کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پھر افغانی سفارت میں ماسکو گئے، آخر تک کابل میں رہے اور وہیں انتقال کیا اور آج بھی سرزمینِ افغانستان میں محوِ خواب ہیں۔

مولانا احمد اللہ۔

پانی پت ضلع کرنال کے باشندے تھے، دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے، شروع ہی سے شیخ الہند کی تحریکِ آزادی سے وابستہ، رفیق اور ہمراز رہے، شیخ الہند نے حجاز

جاتے ہوئے ہندوستان میں سارے کاموں کی ذمہ داری انھیں کے سپرد کی تھی، آپنے رازداری کو مدِنظر رکھ کر مشن کے ممبران کا رجسٹر، مالی امداد کرنے والوں کا رجسٹر اور تحریک سے متعلق دوسرے کاغذات لے کر اپنے وطن پانی پت چلے گئے، اور وہاں پوری احتیاط کے ساتھ کام کرتے رہے شیخ الہند کی گرفتاری کے بعد ان کے گھر پر چھاپہ مارا گیا مگر چند گھنٹے پہلے ہی وہ سارے کاغذات دوسری جگہ منتقل کر چکے تھے اسلئے پولیس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا، حکام نے ایک سی آئی ڈی انسپکٹر کو انکے پیچھے لگادیا جو آپکا مرید ہوا۔ تہجد، نماز اور اوراد و وظائف میں بے انتہا انہماک کا مظاہرہ کیا اور بہت دنوں تک آپ کی ہر طرح خدمات انجام دیتا رہا یہاں تک کہ اس کی پاکبازی اور خدا ترسی کے مظاہرہ کو دیکھ کر مولانا موصوف نے اس پر اعتماد کر کے اس کو مشن کا ممبر بنالیا اور خفیہ کاموں میں شریک کر لیا، جب سارے راز معلوم کر لئے تو گورنمنٹ کو رپورٹ کر کے ایک دن غائب ہو گیا، مولانا موصوف گرفتار ہوئے اور پنجاب کے علاقے میں نظر بند رکھے گئے، جیل سے رہائی کے بعد پانی پت واپس آئے اور وہیں ساری زندگی بسر کی، آزادی سے کچھ ہی دنوں قبل انتقال کیا۔

مولانا ظہور محمد خاں

شہر سہارنپور کے رہنے والے تھے، شیخ الہند کے فدائی تھے، تحریکِ آزادی میں ابتدا ہی سے شریک تھے مشن کا ممبر بنانے اور مالیات کے فراہم کرنے میں بڑی سرگرمی سے کام کرتے رہے، مدرسہ رحمانیہ رڑکی کے صدر مدرس تھے جب تحریک والوں کی گرفتاریاں شروع ہوئیں تو آپ کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ان کو الہ آباد لے گئے وہاں سی آئی ڈی کے دفتر میں ان پر بڑی بڑی سختیاں کی گئیں مگر انھوں نے زبان نہیں کھولی اور گونگے بہرے بنے رہے، تنگ آکر پولیس نے چھوڑ دیا، تحریکِ خلافت کے زمانے میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔

شیخ عبدالرحیم سندھی۔

آپ ہندوستان کے مشہور قومی لیڈر اچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی تھے، مولانا عبیداللہ سندھی کے خاص دوستوں میں تھے، نہایت دیندار اور تحریکِ آزادی کے مشن کے سرگرم ممبر تھے مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل بھیجنے کیلئے بیوی اور بچیوں کے زیور فروخت کر کے زادِ راہ مہیا کیا اور

بڑی احتیاط کے ساتھ ہندوستان کی سرحد انھوں نے پار کرائی، مولانا سندھی کی خط وکتابت کابل سے انھیں کے ذریعہ ہوتی تھی، ایک مرتبہ کئی خطوط گورنمنٹ کے ہاتھ آگئے، سی آئی ڈی ان کے پیچھے لگ گئی ان کی گرفتاری کیلئے ہدایات آتی رہیں مگر وہ انڈر گراونڈ ہو گئے اور پولیس کے ہاتھ آخر تک نہیں آئے، مجدد الفِ ثانی کے وطن سرہند شریف میں بیمار ہوئے اور وہیں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔

مولانا غلام محمّد۔

مولانا ابو السراج غلام محمد دین پوری موضع دین پور علاقہ خان پور ریاست بھاولپور کے باشندے تھے، انھیں کی وجہ سے دین پور بھی شیخ الہند کی تحریک کا ایک مرکز بن گیا تھا اس کے صدر مولانا موصوف خود تھے، آپکے صاحبزادگان اور دوسرے خدام مشن کے ممبر تھے، مولانا عبید اللہ سندھی نے انکو تحریک میں شریک کیا، دین پور میں انقلاب کی پوری تیاریاں کر لی گئی تھیں کہ ایک دن فوج کا ایک بڑا دستہ خان پور ریلوے اسٹیشن پر اُترا، وہاں کے لوگوں نے فوراً دین پور پہونچ کر مرکز میں فوج کی آمد کی خبر کر دی، رات میں تمام سامان رائفلیں بندوقیں اور کارتوس دوسری جگہ منتقل کر دیئے گئے، صبح کو جب انگریزی فوج دین پور پہونچی تو اسکو تفتیش میں کوئی چیز نہیں ملی، ریشمی خطوط جو بچوں کے کھلونے کے ڈبے میں رکھا ہوا تھا وہیں طاق پر تھا، انگریز افسر نے ڈبہ اٹھا کر دیکھا مگر کھلونے کو دیکھ کر پھر رکھدیا، کوئی مشتبہ چیز نہیں ملی، فوج کی آمد کی خبر پورے علاقے میں پھیل گئی اور ہزاروں کا اجتماع ہو گیا۔ اسلئے فوج کے افسر نے دین پور میں مولانا موصوف کو گرفتار نہیں کیا، ان سے کہا کہ ہمارا بڑا افسر خان پور میں ہے آپ اس سے بات کریں، اس طرح مولانا کو خان پور لے گیا، پھر وہاں سے بھاولپور، وہاں سے پنجاب لے جاکر جالندھر جیل میں ڈال دیا، ان کی گرفتاری سے عوام میں ہیجان تھا اور کچھ بھی ہو سکتا تھا اس لئے کچھ دنوں کے بعد ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے رہا کر دیا گیا اور آپ دین پور واپس آئے۔

مولانا ابو الحسن تاج محمود۔

موضع امروٹ ضلع سکھر کے باشندے تھے، سکھر کے اطراف وجوانب میں ان کا

بڑا اثر ورسوخ تھا ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمان متوسل اور مرید تھے، شیخ الہند ان سے ملاقات کیلئے امروٹ گئے اور انکو اپنے مشن میں شریک کیا، سندھ کے ضلعوں میں سکھر شیخ الہند کی تحریک کا مرکز بن گیا گورنمنٹ نے شبہ کی بنیاد پر آپ کو گرفتار کیا مگر بعد میں چھوڑ دیا، تحریکِ خلافت میں شروع سے آخر تک بڑے جوش وخروش کے ساتھ شریک رہے تحریکِ خلافت ہی کے ایام میں انتقال کیا۔

مولانا محمد صادق کراچوی۔

مولانا محمد صادق محلہ کھڈہ کراچی کے رہنے والے تھے، مولانا عبید اللہ سندھی کے بڑے گہرے دوست تھے تحریکِ آزادی میں سرگرم حصہ لیتے رہے، جنگِ عظیم میں جب انگریزوں نے عراق پر حملہ کیا تو انھوں نے "بس بھیلہ" وغیرہ بلوچستان قبائل سے بغاوت کرادی، بصرہ جانے والی فوج کو اس بغاوت کو فرو کرنے کیلئے روک لیا گیا جب بغاوت پر قابو پاکر فوج وہاں پہونچی تو ترکی فوج نے حصار مضبوط کرلیا تھا، انگریزی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے، انگریزی فوج کے ۱۷ ہزار آدمی محصوری کی حالت میں مرگئے اور انگریزوں کو اس محاذ پر ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی۔

چونکہ بلوچستان کی بغاوت میں مولانا محمد صادق کا ہاتھ تھا اسلئے گرفتار کرلیا گیا۔ جنگِ عظیم کے التوا کے اعلان کے بعد آپ کو رہا کیا گیا، نہایت پرجوش اور مستقل مزاج عالم تھے مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی کے صدر مہتمم اور صدر مدرس تھے، خلافت کمیٹی سندھ اور جمعیۃ علماء سندھ کے پلیٹ فارموں سے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور نمایاں خدمات انجام دیں، خدا نے عمرِ طویل عطا فرمائی، جنگِ آزادی کا زمانہ گذار کر ۱۸ ر جون ۱۹۵۳ء کو کراچی میں انتقال فرمایا۔

مولانا فضلِ ربی۔

دارالعلوم دیوبند کے فاضل، شیخ الہند کے شاگرد ضلع پشاور کے رہنے والے تھے بڑے ہی پرجوش اور سرگرم کارکن تھے، شیخ الہند نے آپ کو یاغستان بھیجا کہ وہاں جاکر لوگوں کو جہاد کیلئے آمادہ کریں اور اس کی تبلیغ میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں، چونکہ مقرر اچھے تھے اسلئے ان کی تقریروں کا اثر بہت اچھا پڑا، بڑی تعداد میں لوگ جہاد کیلئے میدان میں نکل آئے۔ حاجی

ترنگ زئی کے ساتھ انگریزوں سے جنگ کرنے میں شریک رہے، شکست کے بعد کابل چلے گئے اور اپنی بہترین صلاحیتوں کی بنیاد پر افغانستان حکومت میں ملازم ہو گئے اور وہیں پوری زندگی بسر کر دی۔

مولانا محمد اکبر۔

دارالعلوم دیوبند کے فاضل، شیخ الہند کے شاگرد، یاغستان کے باشندے تھے، فراغت کے بعد ساؤتھ افریقہ میں علمی خدمات انجام دے رہے تھے، پھر وطن آئے۔ شیخ الہند نے انکو لکھا کہ جہادِ آزادی میں شامل ہو کر لوگوں کو مشن میں شامل کرنے کی جدوجہد کریں، آپ کا حکم پہونچتے ہی اس کام میں لگ گئے، ان کی انتھک جدوجہد کی وجہ سے یاغستان میں جو مختلف گروہوں کے اختلافات تھے ختم ہو گئے، اور اتحاد و اتفاق کی فضا بن گئی اور پورا یاغستان متحدہ طور پر انگریزوں سے جہاد کیلئے میدان میں نکل آیا۔

مولانا فضل محمود۔

مولانا فضلِ محمود ضلع پشاور کے رہنے والے تھے، شیخ الہند نے انکو آزاد قبائل میں بھیجا تھا اپنی کوشش کی وجہ سے جہاد کیلئے فضا ہموار کرتے رہے اور بتدریج وہاں کے عوام میں جہاد کا جذبہ پیدا کرنے میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کامیاب ہوئے، یاغستانی مرکز میں شکست ہو جانے کے بعد خفیہ طور پر وطن واپس آ گئے اور گمنامی کی زندگی بسر کی تحریکِ آزادی کے سرگرم ممبر اور مخلص و جری کارکن تھے۔

سرحدی گاندھی۔

خان عبدالغفار خاں جو جنگِ آزادی کے پورے دور میں صرف "سرحدی گاندھی" کے نام سے مشہور رہے ——— آپ اُتمان زئی ضلع پشاور کے رہنے والے اور ہندوستان کے مشہور و معروف چوٹی کے لیڈروں میں شمار کئے جاتے تھے کانگریس ہائی کمان میں ہمیشہ شامل رہے، شیخ الہند سے بھی ان کا بڑا قریبی تعلق تھا اور شاید شیخ الہند سے بیعت بھی تھے، خان عبدالغفار خان نے خود ایک بار دہلی کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں بارہا شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں ملاقات کا وقت

اور جگہ کی اطلاع کسی شخص کے ذریعہ کرا دیتا تھا اور دیوبند سے پہلے کے یا بعد کے اسٹیشن پر اُتر لیتا تھا اور وہاں ہم دونوں مل کر باتیں کر لیتے تھے اور پھر اپنے اپنے مقصد کیلئے الگ الگ گاڑیوں پر سوار ہو جاتے تھے، سی آئی ڈی کو خبر بھی نہ ہوتی تھی کیونکہ ٹکٹ آگے کے ہوتے تھے، اس طرح بار ہا ہوا۔

خان صاحب کے اس انکشاف سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ بہت ہی اہم اور نازک مسائل پر گفتگو ہوتی تھی جس کے لیے اتنی راز داری برتی جاتی تھی اور جس کا علم شیخ الہند اور خان عبدالغفار خان کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہوتا تھا، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ہمیشہ ایک اہم رکن رہے اور ان کا بڑا احترام و اعزاز کیا جاتا تھا۔ آزادی کے بعد برسہا برس تک پاکستان میں نظر بند رہے، کچھ دنوں افغانستان میں جلا وطنی کی زندگی گزاری
تقریباً چھ ماہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ۲۰ر جنوری ۱۹۸۸ء کو پشاور کے لیڈی ریڈنگ اسپتال میں دارفانی سے کوچ کر گئے اور ۲۲ر جنوری ۱۹۸۸ء کو انکے وطن جلال آباد (پشاور) میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

ڈاکٹر انصاری۔

ہندوستان کے مشہور و ممتاز مسلمان لیڈروں میں سے تھے آپ کا پورا نام ڈاکٹر مختار احمد انصاری ہے آپ یوسف پور ضلع غازی پور کے رہنے والے تھے مگر دہلی کو وطنِ ثانی بنا لیا تھا دریا گنج دہلی میں ان کی کوٹھی تھی، ہندوستان کے جانے پہچانے لیڈر تھے اور ہندوستان کے ممتاز اور چوٹی کے لیڈروں کیلئے ان کا گھر سب سے زیادہ آرام دہ مہمان خانہ تھا، ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا کانگریس کے صدر بھی رہے۔ گاندھی جی اور دوسرے بہت سے بڑے لیڈر ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی میں قیام کرتے تھے جو دریا گنج میں واقع تھی، کانگریس کی بہت سی اہم میٹنگیں اور فیصلہ کن نشستیں انھیں کی کوٹھی میں ہوئیں۔ آپ کے بھائی حکیم عبدالرزاق شیخ الہند سے بیعت تھے اور دیوبند آتے جاتے رہتے تھے دوسرے بھائی حکیم عبدالوہاب جو سب سے بڑے تھے مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد تھے اور انھیں سے بیعت بھی تھے، ڈاکٹر انصاری اپنے سب بھائیوں میں چھوٹے تھے تینوں بھائیوں کو شیخ الہند سے بڑی قربت حاصل تھی، ڈاکٹر انصاری نے تحریکِ شیخ الہند کے موقعہ پر بار بار بیش بہا مالی امداد دی، شیخ الہند کو حجاز جانے کا مشورہ بھی

ڈاکٹر صاحب ہی نے دیا تھا اور سارے اخراجات بھی خود ہی پورے کئے تھے۔

جب تحریک سے وابستہ لوگوں کی ہندوستان میں گرفتاری شروع ہوئی تو ڈاکٹر انصاری کے بھائی حکیم عبدالرزاق کو بھی بلایا گیا، پولیس نے ان سے پوچھ تاچھ کی، سوائے مالی امداد کے اور کوئی ثبوت گورنمنٹ کے پاس نہیں تھا، حکام نے کہا کہ شیخ الہند حکومت کے باغی ہیں اور آپ ان کی مالی اعانت کرتے ہیں؟ یہ بھی جرم ہے تو اس کا جواب ڈاکٹر انصاری نے دیا کہ میں نے ان کو ایک مذہبی پیشوا اور مرشد ہونے کی بنا پر مالی تعاون دیا ہے اگر گورنمنٹ ان کو ایسا ہی سمجھتی ہے تو میں حاضر ہوں جو چاہے سزا دے، اس صاف گوئی اور بعض اور دوسری مصلحتوں کیوجہ سے گرفتار نہیں کیا گیا، ڈاکٹر صاحب کی پوری زندگی سیاسی جد وجہد میں گذری اور ہمیشہ کانگریس ہائی کمان میں رہے، کئی مرتبہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر قید وبند کی مصیبتیں جھیلیں ۱۹۳۶ء میں دہرہ دون سے دہلی آتے ہوئے ٹرین میں وقتِ موعود آگیا اور داعیِ اجل کو لبیک کہا، دہلی میں مدفون ہیں۔

مولانا محمد احمد چکوالی۔

چکوال (پنجاب) کے رہنے والے تھے، دارالعلوم دیوبند کے فاضل، شیخ الہند کے شاگرد اور مولانا عبیداللہ سندھی کے مخصوص دوستوں میں تھے، مولانا سندھی ہی کی وجہ سے تحریکِ آزادی اور شیخ الہند کے مشن میں سرگرمی سے حصہ لیا، اس تحریک کی برانچ جو پنجاب میں تھی مولانا موصوف اس کے صدر تھے، بڑی مستقل مزاجی سے تحریک میں شریک رہے اور ہزاروں کو مشن کا ممبر بنایا، دیوبند بار بار آمد و رفت رہتی تھی، ایامِ دار وگیر میں اُن کو بھی گرفتار کیا گیا اور جیل بھیج دیا گیا، ابتدا میں کوئی الزام ثابت نہیں ہوسکا مگر جب کاغذات گورنمنٹ کے ہاتھ آگئے تو اقبالِ جرم کرلیا۔

شاہ عبدالرحیم رائپوری۔

قصبہ رائپور ضلع سہارنپور کے باشندے تھے، مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ تھے دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر اور شیخ الہند کے معتمد دوست تھے جنگِ عظیم کے شروع ہوجانے کے بعد جب شیخ الہند حجاز جانے لگے تو اہم امور کے سلسلہ میں ان کو اپنا قائم مقام

بنا گئے تھے، تمام کارکنوں کو ہدایت اور تاکید تھی کہ ان کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھایا جائے جزوی امور مولانا احمد اللہ پانی پتی انجام دیتے رہیں گے۔ حضرت رائپوری پوری دلسوزی، استقلال، عالی ہمتی اور انتہائی رازداری کے ساتھ تحریک سے متعلق سارے امور کو انجام دیتے رہے، تحریک کی ناکامی کے بعد پولیس رائے پور پہونچی، آپ بستر علالت پر تھے بہت ہی کمزور اور نحیف ہو چکے تھے، آپ سے سی آئی ڈی افسران نے تحریک کے متعلق استفسار کیا آپ نے تمام الزامات کی تردید کی اور بعض امور میں لاعلمی کا اظہار کیا، پولیس ناکام واپس آئی اس واقعہ کے چند دنوں بعد آپ رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔

مولانا محمد مبین دیوبندی۔

قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور کے باشندہ اور عیدگاہ قدیم کے امام، مدرسہ چھاؤنی انبالہ میں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے، شیخ الہند سے وابستہ تھے اور تحریکِ آزادی مشن کے ممبر تھے، امدادی فنڈ اکٹھا کرنے کے سلسلہ میں برما، رنگون کے کئی سفر کئے اور پوری رازداری کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیتے رہے گرفتاری کے بعد پولیس نے آپ پر بڑی سختیاں کیں مگر آپ پوری ہمت اور استقلال کے ساتھ جواب دیتے رہے اور مرعوب نہ ہو سکے۔

مولانا محمد ابراہیم راندیری۔

راندیر ضلع سورت کے مشہور عالم، نہایت پر جوش اور ٹھوس کام کرنے کے عادی تھے شیخ الہند کی تحریکِ آزادی کے ہم نوا تھے، مشن کی مالی امداد کے سلسلہ میں نمایاں کارنامہ انجام دیا، اپریل ۱۹۵۴ء میں اپنے وطن میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

مولانا جلیل احمد کیرانوی

بچپن سے شیخ الہند کے گھر پر رہے، کمسنی کی وجہ سے مشن کے ممبر نہیں تھے، لیکن سارے حالات کا علم رکھتے تھے، شیخ الہند کی گرفتاری کی خبر سن کر ڈاک کا ایک بڑا ذخیرہ جو محفوظ تھا رات کو نذرِ آتش کر دیا، مگر پھر بھی گرفتاری سے بچ نہ سکے، پولیس گرفتار کر کے الہ آباد لے گئی، تصدق حسین سی آئی ڈی افسر اور سٹر یبن نے بہت ڈرایا دھمکایا اور سختیاں بھی کیں مگر کوئی بات معلوم نہ کر سکے، نہایت بے خوفی اور مستقل مزاجی سے ہر بات کا جواب دیتے رہے

رہائی کے بعد انبالہ میں، پھر کراچی میں اور آخر میں دارالعلوم دیوبند میں استاد بنائے گئے اور ایک عرصہ تک حدیث و فقہ کی کتابیں پڑھاتے رہے۔

رحمت علی زکریا۔

یہ لاہور کے مہاجر طلبہ میں سے تھے جو کابل میں مولانا عبیداللہ سندھی کی نگرانی میں کام کرتے تھے، مولانا سندھی کی گرفتاری کے ساتھ ان کو بھی جیل میں رکھا گیا تھا، مگر ایک دن موقع پاکر قیدخانے سے نکل بھاگے اور انقلابِ روس کے کچھ دنوں بعد بخارا پہونچے اور وہیں ساری زندگی گذار دی۔

مولانا محمد بشیر۔

کابل کی عارضی حکومت میں وزیرِ دفاع بنائے گئے تھے اور یاغستان سے لشکر تیار کرنے کی انکو ذمہ داری دی گئی تھی۔ آپکا اصل نام عبدالرحیم تھا۔ بدل کر محمد بشیر رکھ لیا تھا ان کے والد مولانا رحیم بخش ماہلووال ضلع فیروزپور تھے۔ سید احمد شہید کے ایک خلیفہ سے ان کے بھائی بیعت تھے اور خود ان کے وہ استاذ تھے ان کا نام مولوی حیدر علی تھا، مولانا محمد بشیر عالم فاضل تھے ابتداہی سے آپ جماعتِ مجاہدین کے کام میں حصہ لینے لگے تھے اگرچہ ان کا کاروبار اچھا خاصا تھا لیکن مجاہدین کے ساتھ وہ قلبی تعلق پیدا ہوا کہ سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کر گئے ان کے گھر کی معاشی حالت خراب ہو گئی لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی ایک بار ایک شخص نے ان سے وطن لوٹنے کے بارے میں کہا تو اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ :

> "میں جس دن گھربار چھوڑ کر نکلا تھا خدا سے عہد کیا تھا کہ جب تک ہندوستان کی سرزمین پر انگریزوں کا سایہ بھی موجود ہے خواہ اس کی حیثیت کچھ بھی ہو کبھی واپس نہیں جاؤں گا اور غلام ہندوستان میں سانس لینا بھی اپنے لئے حرام سمجھوں گا میں یہ عہد اپنے آخری دم تک نبھاؤں گا۔"

مولانا محمد بشیر اس جذبے کے آدمی تھے افغانستان حکومت کی ہمدردی حاصل کرنا ضروری تھی اور امیر حبیب اللہ خان انگریزوں سے مرعوب تھا اور ہر ایسے اقدام سے بچتا تھا جس سے انگریزوں کو بدگمانی ہو مولانا بشیر نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا، انھوں نے امیر کے مزاج میں اتنا دخل پیدا کر لیا

کہ امیر نے انھیں یاغستان میں تنظیم کے کام کیلئے مامور کیا اور ۱۲ ہزار سالانہ اخراجات کیلئے دیا مشاہداتِ کابل و یاغستان کے مصنف نے لکھا ہے کہ امیر پر انگریزوں کا اسقدر خوف غالب تھا کہ وہ علانیہ ان کے خلاف کسی سازش میں شرکت کرنے سے ڈرتا تھا ملا محمد بشیر کا یہ کمال ہے کہ وہ امیر کو خوف وہراس کے اس گنبد سے نکال لائے وہ مستقلاً یاغستان میں فوجی تنظیم کے کاموں میں مصروف رہے کہ ایک شخص نے ان پر غفلت میں حملہ کر دیا اور وہ شہید ہو گئے۔

مہاجر طلباء ۔

ریشمی رومال تحریک کا جو زمانہ ہے اس زمانے میں مسلمانوں میں انگریزوں سے نفرت کا جذبہ عام ہوا تو کالجوں کے طلبہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور وہ انگریزوں سے جنگ کرنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے جذبے میں عین جوانی کے عالم میں گھر بار، اپنی تعلیم اور وطن چھوڑ کر اس خارزار وادی میں اُتر پڑے جہاں قدم قدم پر کانٹے ہی کانٹے بچھے ہوئے تھے انھوں نے ہجرت کے نام پر خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کی اور ان راہوں کی تلاش میں وہ دربہ در ٹھوکریں کھاتے رہے جس پر چل کر انگریزوں کی حکومت کو ہندوستان میں تہ و بالا کر دیں ۔

تحریکِ شیخ الہند کے سلسلہ میں جو سازش کا مقدمہ چلا تھا اس میں مہاجر طلبہ میں سے ایک طالبِ علم کو وعدہ معافی گواہ بنایا گیا تھا اور اس سے بیان لیا گیا تھا اس کے بیان سے مہاجر طلبہ کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں میں اسی بیان سے مہاجر طلبہ کا مختصر تعارف پیش کرتا ہوں اس نے اپنے بیان میں بتایا کہ ۵ رفروری ۱۹۱۵ء کو کالجوں کے ۱۵ طلبہ مختلف ٹرینوں سے روانہ ہوئے ہری پور پہونچکر ہر ایک نے اپنا نام بدل دیا جس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) عبدالباری بی اے نے اپنا نام بدل کر محمد حسین رکھا (۲) گوجرانولہ کے شیخ عبدالقادر ایم اے طالبِ علم گورنمنٹ کالج لاہور نے اسمٰعیل کا فرضی نام اختیار کیا (۳) ظفر حسن طالبِ علم سالِ چہارم گورنمنٹ کالج لاہور نے جو فرضی نام اختیار کیا تھا وہ مجھے اس وقت یاد نہیں (۴) عبدالرشید طالب علم سال چہارم گورنمنٹ کالج لاہور نے یوسف نام اختیار کر لیا (۵) عبداللہ بی اے طالبِ علم گورنمنٹ کالج لاہور نے صادق نام رکھ لیا۔ (۶) عبدالمجید خان بی اے طالبِ علم

گورنمنٹ کالج لاہور نے ابراہیم نام اختیار کیا (۷) محمد حسن طالب علم سالِ چہارم اسلامیہ کالج لاہور نے یعقوب نام رکھ لیا (۸) اللہ نواز خان بی اے طالبِ علم گورنمنٹ کالج لاہور نے محمد عمر اپنا نام رکھا (۹) شیخ خوشی محمد طالبِ علم سال دوم میڈیکل کالج لاہور نے محمد علی نام رکھا (۱۰) شجاع اللہ طالبِ علم سال دوم میڈیکل کالج لاہور نے محمد یونس نام رکھا (۱۱) عبدالحمید طالبِ علم سال دوم میڈیکل کالج لاہور نے یحییٰ نام رکھا (۱۲) رحمت علی طالبِ علم سالِ دوم میڈیکل کالج لاہور نے زکریا نام رکھا (۱۳) شاہنواز خان نے محمد نام اختیار کیا (۱۴) شیخ عبدالحق نے الیاس نام اختیار کیا۔

ان نوجوانوں کے علاوہ دوسرے طلبہ بھی سرحدی علاقوں میں گئے تھے، مذکورہ بالا طلبہ میں سے بعض گرفتار ہوکر ہندوستان واپس لائے گئے زیادہ تر نے ہندوستان کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیا اور دوبارہ انکو اپنے وطن کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا، رحمت علی زکریا کے بارے میں تو یہ معلوم ہے کہ وہ انقلاب روس کے بعد بخارا چلے گئے یہ تھا وہ جذبہ جو مسلمانوں کے بچوں میں پیدا ہوا کہ انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے خوبصورت اور سنہرا اور حسین زمانہ آزادیِ وطن پر قربان کردیا، یہ وہ مثالیں ہیں کہ آزاد ہندوستان کو اپنے ان بہادر انسانوں پر فخر کرنا چاہئے تھا لیکن مؤرخ کے بددیانت قلم اس سچائی کے اظہار سے فالج زدہ ہوگئے ہیں ؎

جب پڑا وقت گلستاں پہ تو خوں ہم نے دیا
جب بہار آئی تو کہتے ہو تیرا کام نہیں!

باب (۴)

ہندوستان میں انگریزوں کا نادر شاہی دور

بیسویں صدی کے آغاز سے سیاسی بیداری شروع ہوئی، تعلیم یافتہ طبقہ میں غلامی کی ذلت اور آزادی کی قدر و قیمت کا احساس پیدا ہونے لگا، اس میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان اور سکھ بھی اور بعض دوسری اقلیتیں بھی، لیکن غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے پچاس پچپن سال بعد تک وہ سرفروشانہ جذبہ عام نہیں ہوا تھا کہ انسان انجام سے بے نیاز ہوکر کانٹوں بھری وادیوں میں اُترجائے، کیونکہ آزادی کا لفظ زبان سے ادا کرنے کا مطلب تھا کہ انگریزی مظالم کی اذیتوں سے انسانوں کو خون اُگل اُگل کر مرنا پڑے گا، پھانسی پر چڑھا دینا، صف میں کھڑا کرکے گولی مار دینا تو برطانوی حکومت کے نزدیک معمولی سزائیں تھیں وہ اس سے زیادہ دردناک اور عبرتناک سزاؤں پر یقین رکھتی تھی، ان سزاؤں کو بھگتنے کیلئے ابھی برادرانِ وطن میں جرأت وہمت نہیں پیدا ہوئی تھی وہ صرف انگریزی تعلیم حاصل کرکے برطانوی حکومت میں معزز عہدوں کی تلاش میں سرگرداں تھے وفاداریوں کا سرٹیفکٹ فراہم کرتے تھے۔ البتہ کچھ سر پھرے اور بہادر نوجوان ضرور ایسے پیدا ہوگئے تھے جنہوں نے بعض انگریزوں پر قاتلانہ حملہ کرکے ان سے اپنی نفرت کا اظہار کردیا تھا لیکن ایسے نوجوانوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی برادرانِ وطن کا عام طبقہ ابھی مصائب کے اس سمندر میں چھلانگ لگانے کیلئے ساحل پر کھڑا سوچ رہا تھا لیکن مسلمان اتنا مصلحت اندیش اور عواقب پر نظر رکھ کر اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی قوتِ برداشت نہیں پاتا تھا اور ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۵ء تک جنگِ آزادی کے میدان میں صرف مسلمان صف آرا تھا، البتہ دستوری جنگ کے نقشے ضرور بنائے جانے لگے تھے کانگریس پر ترقی پسندوں کا قبضہ شروع ہو گیا تھا، کمیونسٹ پارٹی کے جیالے نوجوان بھی میدان میں آرہے تھے لیکن ابھی تک آزادی حاصل کرنے کا کوئی ایسا واضح راستہ دریافت نہیں ہو سکا تھا کہ کھلے بند کوئی ایسی تنظیم بنائی جائے کہ اسکے پلیٹ فارم سے حکومت کی زیادتیوں پر برملا حرف گیری کی جا سکے، جلسے جلوس اور احتجاج کے دوسرے طریقے تو بعد میں دریافت ہوئے اور اتفاق سے اس میدان میں بھی پیش قدمی کرنے والے مسلمان ہی تھے، یہ کہانی آپ کو بعد میں سنائی جائے گی،

آزادی کی راہ میں آہنی دیوار کھڑی ہو گئی

بات یہ تھی کہ اب تک طاقت ہی کے ذریعہ آزادی حاصل کرنے کا واحد راستہ تھا، اسی لئے مسلمان اس راستے پر چل پڑا اور اس نے اتنی قربانیاں دیں کہ ان کا شمار بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن اب وہ زمانہ آگیا تھا کہ یہ راستہ مسدود ہو گیا پچاس برسوں سے مجاہدینِ آزادی جس راہ پر گامزن تھے اب اس راہ میں آہنی دیوار کھڑی کر دی گئی طاقت کے ذریعہ ہندوستان میں انقلاب لانے کی آخری کوشش ۱۹۱۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۷ء میں ختم ہو جاتی ہے اور اسکے بعد یہ راستہ ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا کیونکہ انقلاب کا جو راستہ سرحدی علاقوں سے ہو کر افغانستان ہوتا ہوا مشرقِ وسطیٰ تک جاتا ہے، افغانستان کی سیاست پر انگریزوں کی اجارہ داری کی وجہ سے مسدود ہو گیا، ہندوستان کے کچھ نوجوانوں نے جاپان، جرمنی اور ترکی کے تعاون سے ایک نئے راستے کی بھی تلاش کی اس راہ سے بھی ایک بار فروری ۱۹۱۵ء میں جرمنی کے جہازوں سے تیس ہزار بندوقیں گولہ بارود اور رقمیں بھیجنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ جہاز ابھی روانہ بھی نہیں ہوا تھا کہ راز فاش ہو گیا اور انگریزوں نے پیش بندی کر لی، ابھی ہندوستان کی قسمت میں بہت دنوں تک غلامی کی ذلت لکھی ہوئی تھی، جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد اب یہ ممالک بھی کسی تعاون کی پوزیشن میں نہیں رہ گئے تھے جرمنی شکست کھا چکا تھا ترکی کی تکا بوٹی کر کے اس کی ساری توانائیاں سامراج کا بھوت نگل گیا تھا اور اس جنگ میں فتح کے بعد انگریزوں کی قسمت کا ستارہ کچھ اور بلندی پر چمکنے لگا تھا

اب اس کی حدودِ حکومت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا، ان دونوں راستوں کے بند ہوجانے کے بعد اب ہندوستان کے انقلاب پسندوں کے سامنے طاقت کے ذریعہ انقلاب وآزادی کی لڑائی لڑنے کیلئے کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔

نادرشاہی احکام

جنگِ یورپ میں لڑی جارہی تھی، اس جنگ میں انگریزوں کی جنم بھومی خطرے میں تھی جرمنی کا خوفناک بھوت انگریزوں پر حملہ آور تھا، انگریزوں کو فوج اور سرمایہ کی ضرورت تھی اسلئے انھوں نے غلام ہندوستان کو بھی اس جنگ کی دہکتی ہوئی بھٹی میں جھونک دیا، دس لاکھ کے قریب ہندوستانی نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا، تنہا پنجاب کے چار لاکھ جوانوں نے انگریزوں کے اقتدار کو بچانے کیلئے میدانِ جنگ میں صف بندیاں کیں کروڑوں نہیں ار بوں میں ہندوستان سے وار فنڈ میں جبری چندہ لیا گیا، چار سال مسلسل آگ اور خون کی بارش ہوتی رہی، اس جنگ میں صرف پنجاب کے اتنے جوان مارے گئے کہ صوبۂ پنجاب کا گھر گھر ماتم کدہ بن گیا، چیزوں کی گرانی، اسبابِ خورد ونوش کی کمیابی نے ہندوستانیوں کی کمر توڑ دی تھی لیکن وہ اپنے آقاؤں کے تعمیلِ حکم میں لگا رہا خیال تھا کہ جنگ کے بعد یہ مصیبتیں دور ہوجائیں گی، معاشی پریشانیوں کا خاتمہ ہوگا لیکن جب جنگ ختم ہوتی ہے تو مہنگائی اور گرانی اور بے روزگاری آسمان کو چھونے لگتی ہے، ہر طرف تنگی وترشی کے اثرات، ہر چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور انگریز ہندوستان کے اس درد وغم سے بے نیاز اور لاپروا بنا رہا، اتفاق سے اس سال بارش بھی نہیں ہوئی جس سے کھیتوں کی پیداوار بھی معمول کے مطابق نہیں ہوئی اس صورتِ حال نے اور قیامت برپا کردی۔

اس زمانے میں رولٹ ایکٹ کمیٹی اپنی تحقیقات میں مصروف تھی اور ۱۸/ جنوری سنہ ۱۹۱۹ء کو اس نے اپنی رپورٹ حکومتِ ہند کو پیش کردی، اس کا نام سیاسی تاریخ میں رولٹ بل ہے، جس کے ذریعہ "ڈیفنس آف انڈیا، قانونِ تحفظِ ہند" ایک مستقل قانون بن گیا اس قانون کے تحت حکام کو جو اختیارات دیے گئے اس نے پولیس کیلئے ظلم وستم کا دروازہ کھول دیا، اس بل میں پولیس کو اختیار دیا گیا:

۱۔ کسی شخص سے ضمانتیں مع مچلکہ یا بغیر مچلکہ کے طلب کرنا۔

۲۔ کسی شخص کی بود و باش کو ایک جگہ میں محدود کر دینا، یا اُسے حکم دینا کہ وہ اپنی نقل وحرکت کی اطلاع پولیس کو دیتا رہے۔
۳۔ اپنی صوابدید کے مطابق اخبار نویسی، پرچے تقسیم کرنا، جلوس میں شریک ہونا ان تمام کاموں کو روک دے۔
۴۔ اس امر کا حکم دینا کہ کوئی شخص وقتاً فوقتاً اپنی موجودگی کی رپورٹ پولیس کو دیا کرے
۵۔ گرفتار کرنا
۶۔ وارنٹ کے ماتحت تلاشی لینا۔
۷۔ بطورِ تعزیر حراست میں مقید رکھنا۔

اِن ظالمانہ قوانین کو برداشت کرنا ہندوستان کے بس میں نہ تھا، لیکن مخالفت کا طریقہ کیا ہو؟ عوامی غم و غصہ کا اظہار کس طرح کیا جائے؟ حکمِ زباں بندی پہلے ہی عام تھا اب اس میں مزید شدت آگئی، بڑے ہی غور و فکر کے بعد ہندوستان کی دو عظیم شخصیتوں نے ملک کو ایک نئے طریقہ جنگ سے واقف کیا جسے عقل نے تو قبول نہیں کیا لیکن آزادی کا نشہ اتنا تیز تھا کہ لیڈر کے حکم کی تعمیل کیلئے پورا ملک آمادہ ہو گیا، صرف اسلئے کہ

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے!

ان دو شخصیتوں میں ایک گاندھی جی تھے اور دوسری شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کی تھی، اس طریقہ جنگ کا نام ستیہ گرہ رکھا گیا (سچائی کا عہد) یعنی ہم ان ظالمانہ قوانین کو تسلیم نہیں کریں گے چاہے ہمارے اوپر پولیس کی لاٹھیاں برسیں یا انکی گولیاں ہمارے سینوں کو چھلنی کردیں، سب سے پہلے بمبئی میں ستیہ گرہ سبھا قائم ہوئی اور اعلان کر دیا گیا کہ جو لوگ ستیہ گرہ کا حلف اٹھائیں گے وہی سول طور پر رولٹ ایکٹ کی مخالفت کریں گے یا اُن قوانین کی مخالفت جن کا کمیٹی اعلان کرے گی۔

حکومت حیرت زدہ رہ گئی

جنگِ آزادی کا اب وہ دور آچکا ہے کہ سیاسی بیداری عام ہو چکی ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سے لے کر عوام تک

سیاسی مسائل پر پوری بصیرت اور بڑے جوش و خروش سے بحثیں کرنے لگے تھے، حکومت کے ایوانوں میں بیٹھ کر ہندوستان کے گلے میں غلامی کا پھندا کسنے والے ہاتھ عوامی جوش و خروش اور ان کے تیز و تند نعروں کو سنکر تھر تھرانے لگے تھے، سیاست محلوں اور بنگلوں سے نکل کر جھونپڑوں، گلیوں، کوچوں اور سڑکوں پر آنے کیلئے تیار کھڑی تھی، ظلم و جبر کا مقابلہ اب تلواروں کے بجائے نہتے عوام کو کرنا ہے، تنی ہوئی رائفلوں اور بندوقوں کے سامنے سے سینے کھول کر گذرنا ہے، اب ملک میں اس عزم و ارادے کے نوجوان پیدا ہو چکے ہیں اس لئے اب ملک عدمِ تشدد کی جنگ کا آغاز کرتا ہے، اور پورے ملک کو اسی راہ پر چلانے کا قومی لیڈروں نے تہیہ کر رکھا ہے۔

جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد

۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو پہلی جنگِ عظیم چار سال سے زائد اپنی تباہیاں پھیلا کر ختم ہو گئی تھی، ہندوستان کو اس کی مرضی کے خلاف جنگ کی اس بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا گیا تھا، یہ وہ وقت تھا کہ ابھی ہندوستان میں وہ دم خم نہیں تھا کہ حکومت کے اس نادر شاہی فیصلے کے خلاف پوری طاقت سے آواز بلند کر سکے، دس لاکھ ہندوستان کے نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا اور محاذِ جنگ پر بھیج کر لاکھوں کی گردنیں اپنے اقتدار کی چوکھٹ پر کٹوا دی گئیں، اخراجاتِ جنگ کے نام پر دو ارب روپیوں کا بوجھ ہندوستان کی پیٹھ پر لاد دیا گیا تھا، اسکی وصولیابی کیلئے انکم ٹیکس کے سخت قوانین نافذ کئے گئے، کئی ضلعوں میں سو فی صدی اور کہیں کہیں دو سو فی صدی انکم ٹیکس بڑھا دیا گیا اور اس کی وصولیابی میں جس جبر و تشدد کا مظاہرہ کیا گیا وہ اپنی جگہ خود ایک دردناک کہانی ہے۔

ہندوستان کے عوام ان حالات کو غم و غصہ کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اپنے لاکھوں جگر پاروں کو انگریزوں کے اقتدار کی بحالی کیلئے جنگ کے دہکتے ہوئے شعلوں میں جھونکا، اپنی جیب کی آخری پونجی دیکر اخراجاتِ جنگ کو پورا کیا، اس کا صلہ یہ ملا کہ نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے، مزید ستم یہ کہ اسی دوران "ڈیفنس انڈیا رولز" نافذ کر دیا گیا جس کے اختیارات لامحدود تھے اس قانون کا سہارا لے کر آزادیٔ رائے اور آزادیٔ تحریر کا

گلا گھونٹ دیا گیا، جس کو چاہا جیلوں میں ٹھونس دیا جسے چاہا ہندوستان سے باہر نکال دیا اور ہندوستان سے باہر پھنسے ہوئے لوگوں کو ہندوستان آنے پر پابندی عائد کر دی۔

نادر شاہ کی روح بیدار ہو رہی ہے

ہندوستان کے عوام بڑی بے بسی کے ساتھ اپنی مجبوریوں کو دیکھ رہے تھے اور برطانوی حکومت کی طرف سے ہونے والے مظالم کو انتہائی درد و کرب کے ساتھ برداشت کرنے پر مجبور تھے لیکن اس کے خلاف کوئی موثر آواز بلند کرنے سے معذور تھے، کیونکہ جنگ کے ختم ہوتے ہی ہندوستان کے سر پر "قانونِ تحفظِ ہند" کی تلوار لٹکا دی گئی تھی جس نے درد سے کروٹ بدلی کہ جبر و تشدد کی تلوار نے اس کا کام تمام کیا، لیکن ان تمام حصار بندیوں کے باوجود کہیں کہیں بے چینیوں کا اظہار ہوتا رہتا تھا، بالخصوص پنجاب جس نے فوج میں تنہا اپنے چار لاکھ جوانوں کو انگریزوں کے اقتدار کی چوکھٹ پر سر کٹانے کیلئے فوج میں بھرتی کیا تھا وہی ظلم وستم کا سب سے پہلا ہدف بھی بنا۔

انگریز ونکوان کی خفیہ پولیس اطلاعات دے رہی تھی کہ پنجاب کے کاشتکار سر اٹھا رہے ہیں، وہ کہہ رہے ہیں کہ ہندوستان سے برطانوی حکومت کا خاتمہ ہو گیا ہے، حکومت کو یہ بھی خبر دی گئی کہ فوج میں بغاوت پھیلانے کی کوشش ہو رہی ہے اور ریلوے ملازمین کو اسٹرائک کیلئے بھڑکایا جا رہا ہے، حقیقت جو کچھ بھی رہی ہو لیکن یہ خبریں انگریزوں کو وحشت میں ڈالنے کیلئے کافی تھیں ان کے غصہ کا پارہ اوپر چڑھتا جا رہا تھا، انھوں نے ہندوستان کو اس کا مزہ چکھانے کا بہانہ بنا لیا، حکومت کو جو اطلاعات پہونچائی گئیں وہ صرف افواہیں تھیں، حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، نادر شاہ کو قتلِ عام کر کے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا، انہیں افواہوں کو ہندوستان پر ظلم و تعدی کا بہانا بنایا جا رہا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف جنگ کیلئے مجاہدینِ آزادی کے سامنے ابھی کوئی متعین راستہ نہیں تھا، وہ راستہ کی تلاش میں ضرور تھے مگر ابھی انکی نگاہوں کے سامنے اندھیرا تھا، وحشت و بربریت کی پھیلائی ہوئی دھند میں ابھی کوئی راہ نگاہوں کو نظر نہیں

آرہی تھی، ہندوستانی قیادت بڑی سنجیدگی سے صورت حال کا جائزہ لے رہی تھی گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی فکرِ فلک پیمانے ملک کے سامنے آزادی کی جدوجہد کا ایک نیا طریقۂ کار رکھا، یہ راہ نئی تھی اور پہلے کی راہ سے قطعی مختلف اور اس سے الگ تھی وہ راہ تھی ستیہ گرہ کی اور سول نافرمانی کی مگر اس کا کوئی تجربہ نہیں کیا گیا تھا پھر بھی ستیہ گرہ کمیٹی کی تشکیل کردی گئی اب ضرورت تھی کہ ملک کو اس طریقۂ کار سے روشناس کرایا جائے ان کے دلوں میں اس لائحۂ عمل کی اہمیت اتار دی جائے اس کام کیلئے مولانا آزاد نے اپنے خارا شگاف قلم سے کام لیا۔

مولانا آزاد نے کہا

ستیہ گرہ کا نسخۂ کیمیا مرتب کرنے والوں میں مولانا آزاد بھی تھے انھوں نے جب ایک بار فیصلہ کر لیا تو اس پر مضبوطی سے جم گئے اور لوگوں کو اس راہ پر چلنے کی دعوت دی انھوں نے پورے ہندوستان کو بالخصوص مسلمانوں کو آواز دی اور کہا کہ:

> "ہم نے اول دن سے اعلان کیا ہے کہ موجودہ جدوجہد کی آخری منزل قید خانہ ہے، اس جنگ کی فتح و شکست کا فیصلہ میدانوں میں نہ ہوگا قید خانے کی کوٹھریوں میں ہوگا، ہم نے اسلئے "سول ڈیس رُوبیڈینس" یعنی سول نافرمانی کو بھی پروگرام میں داخل کیا، کیونکہ قید خانے کی سب سے زیادہ سہل اور سیدھی راہ یہی ہے، پھر کیا واقعی قید و بند کا پیام آگیا ہے؟
>
> ہندوستان نے سفر شروع کیا، ایک سفر اسکے مقاصد کا ہے ایک سفر جاں دادگانِ مقاصد کے فرائض کا ہے، اور پہلے کی کامیابی دوسرے کی کامیابی پر موقوف ہے، طریقِ عمل یہ قرار پایا کہ جو سفر اس وقت چند مسافروں میں محدود تھا، اسکو تمام ملک اپنا شیوہ بنالے اور سیکڑوں ہزاروں جانباز ایسے پیدا ہو جائیں جو کامل خود فروشی اور قربانی کے ساتھ کوچ کردیں ایمان کی لازوال روح ان کے دلوں میں ہو، صبر کی انتھک اور اٹل طاقت انکے قدموں میں، عشق ان کی رہبری کرے، شوق ان کا رفیق اور دمساز ہو،

عزم قدم قدم پر ہمت بڑھائے، ہمت آگے بڑھ کر راستہ صاف کرے اور پھر جب آخری منزل آجائے، قید و بند کی پکار اور طوق و زنجیر استقبال کریں تو ایسا ہو کہ ہزاروں قدم اس کیلئے مضطربانہ دوڑیں، ہزاروں ہاتھ اس کی طرف والہانہ بڑھیں، ہزاروں دل اس طلب و شوق سے معمور ہو جائیں، وہ عشق و نشاط کی پکار ہو، کامرانی و مراد کی بخشش ہو، فتح و اقبال کا نشان ہو، ہر انسان اس کی آرزوئیں کرے، ہر دل اس کے لئے رشک کھائے، اور ہر روح میں اس کیلئے بیقراری سما جائے، قید کرنے والے قید کرنے سے تھک جائیں لیکن قید ہونے والے قید ہونے سے نہ اکتائیں، ہتھکڑی پہنانے کیلئے ہاتھ نہ ملیں لیکن ہتھکڑی پہننے والے ہاتھوں کی کمی نہ ہو، یہاں تک کہ ہندوستان کے جیل خانوں میں ایک نئی بستی زندانیانِ حق کی آباد ہو جائے، اور اس کی کوٹھڑیوں اور محنت خانوں میں چوروں اور ڈاکوؤں کو رکھنے کی جگہ باقی نہ رہے، جب ملک قربانی اور سرفروشی کا یہ جذبہ طے کر لیگا تو پھر اس کی طاقت ناقابل تسخیر ہو جائیگی، کوئی ہتھیار اس پر اثر نہ کریگا، کوئی فوج اس کو فتح نہ کر سکے گی، آسمان کی تمام بجلیاں بھی اگر اتر آئیں اور سمندر کی تمام موجیں بھی اکٹھی ہو جائیں جب بھی قربانی کی قربانی طاقت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، انسانوں کو قید کے نام سے دھمکایا جا سکتا ہے اور موت کے خوف سے وہ مسخر ہو جاتا ہے لیکن جو انسان خود قید کا آرزومند ہو اور موت سے بے خوف ہو اس کا مقابلہ کس ہتھیار سے کیا جائے؟ بالآخر گورنمنٹ کو اپنے گھمنڈ کے تخت سے اترنا ہوگا اور حق و انصاف کے آگے جھکنا ہوگا، یا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے تخت چھوڑ دینا پڑے گا۔"

پنجاب پر آگ اور خون کی بارش

امرتسر اور پنجاب کے دوسرے ضلعوں میں ستیہ گرہ کمیٹی کی جانب سے ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء اور

۷ / اپریل کو ہڑتال کی گئی، پولیس نے گرفتاریاں شروع کر دیں، ۹ / اور ۱۰ / اپریل کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال گرفتار کر لئے گئے اور جلا وطن کر دیے گئے، پھر اسکے بعد جب گاندھی جی کی گرفتاری کی افواہ اڑی تو پورے پنجاب میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا مقامی حکام نے حکومتِ ہند سے مارشل لا نافذ کرنے کی سفارش کی، اور ۱۵ / اپریل ۱۹۱۹ء کو لاہور اور امرتسر میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔

جلیانوالہ باغ میں

جنگِ آزادی کے دور میں سب سے زیادہ خونریز اور کربناک واقعہ اور انگریزی حکومت کی بہیمانہ اور وحشیانہ درندگی کا ہولناک مظاہرہ جلیانوالہ باغ امرتسر میں ہوا، اس سے پہلے ۱۹۱۳ء میں کانپور میں ایک سڑک کو سیدھی کرنے کے نام سے ایک مسجد کو کمالِ لاپرواہی سے شہید کرنے کے نتیجہ میں جو مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوا تھا تو اُسے گولیوں کی بے پناہ بوچھار سے فرو کیا گیا تھا، لیکن جس درندگی و بربریت کا مظاہرہ جلیانوالہ باغ میں ہوا اس کے مقابلے میں یہ سب واقعے ہلکے ہیں

صورت یہ ہوئی کہ پنجاب کے کئی ضلعوں میں مارشل لا لگایا جا چکا تھا، پولیس کو چوکنا کر دیا گیا تھا ستیہ گرہ کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق عملدرآمد کے نتیجہ میں امرتسر میں مکمل ہڑتال ہوئی، انگریزوں کے نادرشاہی مزاج کیلئے یہ جرم کافی تھا، پنجاب کے دو مشہور و مقبول لیڈروں کو گرفتار کر کے جلا وطن کر دیا گیا جن میں سے ایک ڈاکٹر ستیہ پال اور دوسرے ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے جو کانگریس کے ممتاز اور بڑے لیڈروں میں شمار کئے جاتے تھے عوام کو جب پتہ چلا کہ حکومت انتقام پر اتر آئی ہے تو ان میں بھی اشتعال پیدا ہوا اور لوگ گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آگئے تاکہ اپنے لیڈروں کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کر سکیں، مجمع زیادہ تھا اور حکومت کے جابرانہ طرزِ عمل سے مشتعل بھی، مجمع نے ایک بینک پر حملہ کر دیا، عمارت کو آگ لگا دی اور نقصان پہونچایا اور حکومت کے خلاف نعرے لگاتا ہوا واپس ہو گیا اور اعلان کیا گیا کہ شام کو ساڑھے چار بجے جلیانوالہ باغ میں جلسۂ عام ہو گا تاکہ اپنے محبوب لیڈروں کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کیا جائے۔

پنجاب کا ہٹلر، ڈائر

جنرل ڈائر ہٹلرانہ دل و دماغ اور نادر شاہی مزاج کا ایک فوجی افسر تھا وہ فوجیوں کی ایک بڑی تعداد کو لے کر امرتسر پہونچ گیا، اس نے دل میں پہلے ہی سے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ امرتسر کی سرزمین اپنی خوں آشام فطرت کی تشنگی بے گناہ ہندوستانیوں کے خون سے ضرور بجھائے گا، اس نے آتے ہی جسطرح جنگ کے موقعہ پر احکام نافذ کئے جاتے ہیں منادی کرا دی کہ جو لوگ مارشل لا کی خلاف ورزی کریں گے انھیں فوج کے ذریعہ کچل دیا جائے گا ایک ظالم اور بد دماغ انسان اور کیا کہہ سکتا تھا یہ اعلانِ عام عوام نے سنا اور لا پرواہی کے ساتھ اَن سُنا کر دیا، اور حسبِ اعلان جلسہ میں شرکت کرنے کیلئے جلیانوالہ باغ کی طرف چل پڑے اور جلسہ کا مقررہ وقت آتے آتے تقریباً پندرہ ہزار کا مجمع ہو گیا، یہ جلسہ اسلئے منعقد ہو رہا تھا کہ اپنے اوپر ہونے والے مظالم اور نافذ کئے جانے والے جابرانہ قوانین اور پولیس کے ہٹلرانہ رویہ و اختیارات کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کی جا سکے۔

امرتسر خون میں نہا گیا

جب جنرل ڈائر کو اپنے کیمپ میں یہ معلوم ہوا کہ ساڑھے چار بجے شام کو جلیانوالہ باغ میں شہریوں کا ایک جلسہ ہو رہا ہے تو اپنی فوج کے ایک دستہ کو لیکر موقعہ پر پہونچ گیا، فوج اپنے ساتھ مشین گن بھی لے گئی تھی لیکن باغ کا راستہ تنگ تھا اور اتنی بھاری مشین اندر نہیں جا سکتی تھی اسلئے مشین گن کو باغ کے دروازے پر کھڑا کر دیا اور فوج کو باغ کے چاروں طرف پھیلا کر حصار بندی کر لی، اور عوام کے بھاگ کر جانے کے سارے راستے بند کر دیئے، ہر طرف سے مجمع کی اس طرح ناکہ بندی کی گئی جیسے دشمن کی فوج کا محاصرہ کیا جاتا ہے۔

ساری تیاریاں کر لینے کے بعد ڈائر نے دیکھا کہ ایک شخص اسٹیج پر تقریر کر رہا ہے اور مجمع خاموشی سے سن رہا ہے، جنرل ڈائر کے حاکمانہ غرور کو ٹھیس لگی، نہتے عوام کی یہ جرأت؟ نوخیز اور کمسن بچوں کی یہ مجال؟ کوئی خوف نہیں، کوئی ہراس نہیں، مسلح فوج سامنے کھڑی ہے، مشین گن انگلیوں کی ایک جنبش کا انتظار کر رہی ہیں، بندوقیں آگ اگلنے کے لئے بے چین ہیں، لیکن ڈر کا کہیں گذر نہیں، دہشت اور مرعوبیت کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں!

چنگیز و ہلاکو کی روح جنرل ڈائر کے ناپاک جسم میں حلول کر گئی، نادر شاہی درندگی نے ایک چُھرجھری لی اور بغیر کسی انتظار اور مجمع کو منتشر ہو جانے کا حکم دیئے بغیر فوج کو بزن کا حکم اور اور فائرنگ کا آرڈر دے دیا، پھر کیا تھا؟ ایک محشرِ قتل تھا، میدانِ قیامت تھا، موت سراسیمہ بھاگی بھاگی پھرتی تھی، کس کس کی روح قبض کرے، کشتوں کے پشتے لگ گئے، نہتا اور خالی ہاتھ مجمع، ایک ایک فائر میں کئی کئی لاشیں زمین پر تڑپنے لگتیں، مجمع گولیوں کی بوچھار سے بھاگنے کیلئے راستوں کی طرف دوڑا کہ کسی طرح باغ سے نکل جائیں، مگر فوج راستہ رو کے ہوئے کھڑی تھی، بھاگنے والوں کو وہیں بھون کر رکھدیا، بیکسی دبے چارگی میں کچھ لوگ زمینوں پر لیٹ گئے، فوجیوں نے لیٹنے والوں کو نشانہ بنایا، نوجوانوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہوتی گئیں، بوڑھے تو کراہ بھی نہ سکے اور دم توڑ دیا، پھولوں جیسے معصوم اور کمسن بچوں نے جو تماشائیوں کے ہجوم میں شامل تھے خون اُگل اُگل کر جان دیدی، ایک، دو، تین، چار، پانچ فائر پر فائر مسلسل گولیاں برستی رہیں، لاشوں پر لاشیں گرتی رہیں، اور جنرل ڈائر باغ کے ایک گوشے میں کھڑا مسکراتا رہا، فوج نے کہا، گولیاں ختم ہو گئیں، ڈائر نے کہا کھیل بھی ختم ہو گیا، آؤ، واپس چلیں۔

جلیانوالہ باغ کا رُوح فرسا منظر

سرکاری اخباروں نے کہا پونے چار سو آدمی مارے گئے معتبر راویوں نے بتایا کہ پندرہ سو سے کم آدمی شہید نہیں ہوئے، لاشوں کے اعداد و شمار کون جمع کرے، کس میں ہمت تھی کہ اس روح فرسا قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے، لاشیں کچھ اس طرح تہ بہ تہ تھیں کہ شمار کرنا مشکل تھا، فوج واپس جا چکی تھی، پورا باغ لاشوں سے پٹا پڑا تھا، باغ کی پوری زمین انسانی خون سے لالہ زار بنی ہوئی تھی، کوئی قدم خون میں ڈوبے ہوئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا تھا، رات ہو چکی تھی، یہ رات امرتسر کیلئے قیامت کی رات تھی، آوارہ کتوں اور مردہ خور جانوروں کی باغ میں یلغار تھی، لاشیں نوچی اور گھسوٹی جا رہی تھیں۔

گھر والے اپنے اپنے عزیزوں کی تلاش میں نکلے، بیویاں اپنے شوہروں کی جستجو میں آئیں انھوں نے دیکھا کہ ابھی بہت سے لوگ لاشوں کے انبار میں پڑے ہوئے ہیں جن میں

زندگی کی رمق باقی ہے، کچھ لوگ پانی مانگ رہے ہیں، کچھ زخمی اور گھائل اپنے جسم کے درد سے چیخ رہے ہیں، کچھ آوارہ کتوں اور جانوروں کے حملوں سے بچاؤ کیلئے فریاد کر رہے ہیں، مگر اس محشرستانِ قتل میں کون تھا جو ان کی فریاد کو سنتا اور فریاد رسی کرتا؟

دردناک منظر کی ایک جھلک

مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے بڑی جرأت کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے اپنے ہی ہم جنس انگریزوں کے بے رحمانہ قتل اور خوں ریزی کے بہت سے واقعات سے پردہ اٹھایا ہے، انھوں نے اپنی مشہور کتاب "غدر ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ" میں جلیانوالہ باغ کے سلسلہ میں جو دردناک کہانی سنائی ہے اسے سننے کیلئے پتھر کا دل اور فولاد کا کلیجہ چاہیئے انھوں نے ایک ایسی عورت سے کچھ سوالات کئے جو اس محشرستانِ قتل میں اپنے شوہر کی لاش تلاش کرنے ٹھیک اس وقت گئی تھی جب جنرل ڈائر ان لاشوں کو میدان میں چھوڑ کر اپنے کیمپ رام پور واپس جا چکا تھا، عورت نے بتایا کہ:

"میدان مردہ لاشوں سے بھرا پڑا تھا، میں نے اپنے شوہر کی لاش کو لاشوں کے انبار سے کھینچ کر نکالا، وہ تمام جگہ خون کا تالاب نظر آتی تھی، میں نے لاش کو گھر لے جانے کیلئے امداد تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہی، آخر مایوس ہو کر اپنے شوہر کی لاش کے پاس بیٹھ کر پوری رات گذار دی، یہاں کتوں کی کثرت کی وجہ سے اکثر اپنی چھڑی استعمال کرنی پڑتی تھی، رات کے دو بجے ایک سکھ زخمی کے کراہنے کی آواز سن کر اسکے پاس گئی اور اُس کی زخمی ٹانگ ٹھیک کر کے رکھدی جس سے اس غریب کو کچھ افاقہ ہوا، وہاں پر ایک بارہ سال کا زخمی بچہ بھی تھا جو تمام رات روتا رہا اور بار بار مجھ سے یہی التجا کرتا رہا کہ میں اسکے پاس بیٹھی رہوں کیونکہ وہ اس تاریکی میں بہت ڈر رہا تھا پاس ہی ایک اور زخمی تھا جو نہایت دردناک آواز میں تمام رات پانی مانگتا رہا، میں نے ہر چند کوشش کی کہ کہیں سے پانی حاصل کر سکوں، لیکن افسوس کہ ناکام رہی تمام رات زخمیوں کی چیخیں سنتی رہی یا کتوں کے

بھونکنے اور گدھوں کے ہنہنانے کی مکروہ اور بھیانک آواز کانوں میں آتی رہی۔"

بربریت کی انتہا

ایک روایت کے مطابق کم از کم بارہ سو آدمی زخمی ہوئے لیکن جنرل ڈائر نے انکے ورثا کو اجازت نہیں دی کہ وہ زخمیوں کو ہسپتال لے جاکر مرہم پٹی کرائیں، اسی طرح لاشوں کے ورثا کو یہ بھی اجازت نہیں دی کہ وہ اپنے اعزہ کی لاشوں کو لے جاکر اپنے اپنے مذہب کے مطابق تجہیز و تکفین کر سکیں۔

اس دردناک داستان کے ساتھ شقاوتِ قلبی کا یہ واقعہ بھی سن لیجئے کہ برطانوی حکومت کے تحقیقاتی ٹریبونل کے سامنے چنگیز و ہلاکو کی اولاد انگریز افسران نے بیان دیا کہ ہمارا مقصد ان کارروائیوں سے یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے دماغ سے بغاوت کے جذبات فنا کر دیئے جائیں۔

خونِ شہادت کی سرخی

جلیانوالہ باغ میں انسانی خون کا سیلاب آگیا صرف اس جرم میں کہ ہندوستان نے اپنے آقاؤں کے ظالمانہ قوانین اور جابرانہ احکام کے سامنے بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کیوں نہیں کیا؟ برطانوی حکومت کی نگاہ میں یہ جرم کشتنی اور گردن زدنی تھا امرتسر شہر میں سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ آبادی تھی، اسلئے جلیانوالہ باغ میں سکھ بھی تھے اور ہندو و مسلمان بھی، برطانوی فوج کی گولیوں نے سینوں کو چھلنی کرنے میں کسی طرح امتیاز نہیں کیا، ہر قوم، ہر ملت کے لوگوں کا خون جلیانوالہ باغ میں ایک ساتھ اس طرح بہا کہ اس خون میں فرق کرنا ممکن نہ تھا کہ یہ خون ہندو اور سکھ کا ہے اور یہ مسلمان کا، ہر ایک کی رگوں میں مادرِ ہند کا خون تھا جو آزادی کی راہ میں اور مادرِ ہند کی عظمت و حرمت کو بچانے کیلئے ایک ساتھ بہنا ہی چاہیئے تھا، وہ بہا، گورنمنٹ ریکارڈ میں جو تفصیلات درج ہیں اور لاشوں کے بارے میں جو رپورٹ آئی ہے اس میں ہم ہر فرقہ کے لوگوں کے نام پاتے ہیں، اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جلیانوالہ باغ کے امتحان گاہ سے ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگ سرخ رو ہوکر نکلے اس موقعہ پر مسلمان اگر اپنے دوسرے بھائیوں سے آگے نہیں تو کسی سے پیچھے بھی نہیں ہے، ۴۳ سال سے وہ تنہا جہادِ آزادی کے میدان میں اپنا خون بہاتا رہا اور جب تمام برادرانِ وطن کے ساتھ بھی وطن اور وطن کی عزت و آزادی کیلئے خون بہانے کی نوبت آئی تو بھی وہ اپنی روایت کے مطابق پیش پیش تھا۔"

شمعِ آزادی کے پروانے

۱۹۱۹ء

ڈاکٹر سیف الدین کچلو۔

امرتسر کے باشندہ، انڈین نیشنل کانگریس کے چوٹی کے لیڈروں میں شمار تھا، امرتسر میں آپ ہی کی گرفتاری پر احتجاج کیلئے جلیانوالہ باغ میں اجلاس ہو رہا تھا، انکی مقبولیت کا یہ عالَم تھا کہ ان کی گرفتاری کو جب پردۂ راز میں رکھا گیا تو عوام بھڑ اُٹھے اور تاریخِ آزادیٔ ہند کا وہ باب لکھا گیا جس کی تحریر میں ڈیڑھ ہزار ہندوستانیوں کا گرم لہو شامل تھا اور جنرل ڈائر امرتسر کے اس واقعہ میں تاریخِ ہند کا ہٹلر بن کر نمودار ہوا۔

عبدالغنی۔

۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے عمر ۲۵ سال، دہلی کے رہنے والے تھے، رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہرہ کی رہنمائی کی، دہلی ٹاؤن ہال کے سامنے فوج سے مڈبھیڑ ہوگئی پولیس نے فائرنگ جھونک دی، دہیں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

عبدالکریم۔

والد کا نام پیر بخش تھا پیدائش ۱۹۰۱ء میں ہوئی ۱۸ سال عمر تھی، امرتسر کے باشندہ تھے جلسہ میں شریک ہوئے اور جلیانوالہ باغ میں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

عبدالکریم۔

باپ کا نام لال محمد تھا، ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے عمر ۱۷ سال تھی، اسٹوڈنٹ تھے ایک کالج میں پڑھتے تھے، امرتسر کے رہنے والے تھے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے موقعہ ہی پر شہید ہوئے۔

عبدالخالق۔

امرتسر کے رہنے والے تھے، ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام رحیم خاں تھا، ۶۹ سال عمر تھی، کارپٹ فیکٹری میں کام کرتے تھے، آزادیِ وطن کے جذبے سے جلیانوالہ باغ کے احتجاجی جلسہ میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے موقعہ ہی پر شہید ہو گئے۔

عبدالمجید۔

پشاور کے رہنے والے تھے، والد کا نام بھودو کمہار تھا، جلیانوالہ باغ کے احتجاجی جلسہ میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

عبداللہ۔

امرتسر کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام پیر بخش تھا، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور وہیں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

عبداللہ۔

۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام لال محمد تھا، امرتسر کے رہنے والے تھے، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

احمد دین۔

والد کا نام کریم بخش تھا، امرتسر کے رہنے والے تھے، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور وہیں فوج کی گولی سے شہید ہوئے۔

احمد دین۔

۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے ۳۴ سال عمر تھی، گوجرانولہ پنجاب کے رہنے والے تھے دودھ کا کاروبار کرتے تھے، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک تھے پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

احمد دین۔

۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے، عمر ۱۴ سال تھی، امرتسر کے رہنے والے تھے والد کا نام دین پوتا کر تھا، جلیانوالہ باغ میں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

احمد خان۔
گیارہ سال کا کمسن بچہ تھا، ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوا، امرتسر کے رہنے والے دارا خاں کا لڑکا تھا، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک رہا اور درجۂ شہادت پایا۔

احمد اللہ۔
۱۸۸۴ء میں لاہور میں پیدا ہوئے، عمر ۳۵ سال تھی، امرتسر میں رہتے تھے جلیانوالہ باغ کے جلسے میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

اللہ بخش۔
۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے، ۵۵ سال عمر تھی، لاہور کے رہنے والے تھے جلیانوالہ باغ کے جلسے میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

اللہ دتا۔
۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے، عمر ۳۴ سال تھی، امرتسر کے رہنے والے تھے، والد کا نام میگھا تھا، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور وہیں شہید ہوئے۔

برکات احمد۔
۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۰ سال عمر تھی، والد کا نام شیخ بھلا تھا، امرتسر کے رہنے والے تھے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک رہے اور پولیس کی گولی کا شکار ہوئے۔

برکت علی۔
۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے، ۳۸ سال عمر تھی، والد کا نام الٰہی بخش تھا، امرتسر کے رہنے والے تھے، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور وہیں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے

بھیروالیاس نظام الدین
۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے، عمر ۱۸ سال تھی، ہوشیارپور (پنجاب) کے رہنے والے تھے، طبی گوجر کے لڑکے تھے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شہید ہوئے۔

بچراغ الدین۔
۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے، عمر ۱۸ سال تھی، والد کا نام محمد بخش تھا، لاہور کے رہنے والے

تھے ،جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے ۔

فتح محمد۔

۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے ، ۲۴ سال عمر تھی والد کا نام عطا محمد تھا، امرتسر کے رہنے والے تھے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور وہیں شہید ہوئے ۔

رکن الدین ۔

۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے ، والد کا نام الٰہی بخش تھا ، ۱۸ سال کی عمر تھی ، موضع چھندا ضلع امرتسر کے رہنے والے تھے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور شہید ہوئے ۔

شمس الدین

شمس الدین کے والد کا نام شیخ سکندر تھا ، امرتسر کے رہنے والے تھے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک تھے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے ۔

شرف الدین ۔

عمر ۱۹ سال تھی ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے والد کا نام جمال الدین تھا ، امرتسر کے رہنے والے تھے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شہید ہوئے ۔

شیخ جان ۔

پشاور کے رہنے والے تھے ، امرتسر میں رہتے تھے ۱۰ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں ریلوے پل کے پاس جلوس پر پولیس نے فائرنگ کی تھی اسمیں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے ۔

شیر خان ۔

پشاور کے رہنے والے تھے بسلسلۂ کاروبار امرتسر میں سکونت پذیر تھے ۱۰ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں نکلنے والے احتجاجی جلوس میں شریک تھے پولیس کی گولی سے شہید ہوئے ۔

شیر باز خان ۔

پشاور کے رہنے والے تھے ، امرتسر میں رہتے تھے ۱۰ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلوس پر جو فائرنگ ہوئی تھی ، اسی میں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے ۔

حافظ تاج الدین۔

سنہ ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام علی محمد ٹیلر ماسٹر تھا، ۲۵ سال عمر تھی امرتسر کے رہنے والے تھے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک تھے پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

عمر بخش۔

سنہ ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد کا نام شیخ لدا تھا، امرتسر کے رہنے والے تھے۔ جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور وہیں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

عمر بہی۔

سنہ ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے والد کا نام امام الدین تھا وُلا ضلع امرتسر کے رہنے والے تھے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک تھے اور وہیں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

عمر دین۔

سنہ ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے، عمر ۳۴ سال تھی آپ کے والد کا نام محمد دین تھا امرتسر کے رہنے والے تھے اور نوکری پیشہ تھے، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شہید ہوئے۔

فضل احمد۔

عمر ۱۸ سال گوجرانوالہ میں سنہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے والد کا نام مولا بخش تھا، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

فیروز الدین۔

عمر ۱۹ سال امرتسر میں سنہ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے، باپ کا نام شیر محمد تھا، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شرکت کی اور پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

غلام محمد۔

عمر ۱۸ سال سنہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام رحیم بخش تھا، امرتسر کے باشندہ تھے، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شرکت کی اور پولیس کی گولی کا شکار ہوئے۔

غلام محمد دین۔

عمر ۴۳ سال، امرتسر میں سنہ ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام محمد جان کشمیری تھا

جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک رہے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

غلام رسول۔

کشمیر کے رہنے والے تھے، والد کا نام صمد شاہ تھا، امرتسر میں سکونت پذیر تھے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں پولیس فائرنگ میں شہید ہوئے۔

حمید۔

عمر ۲۴ سال، ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے، امرتسر کے باشندہ تھے احمد دین کشمیری کے صاحبزادے تھے، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک تھے پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

حشمت اللہ خان۔

عمر ۲۹ سال، ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے، دہلی کے رہنے والے تھے ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو رولٹ ایکٹ کے خلاف دہلی میں ہونے والے مظاہرہ میں سرگرمی سے حصہ لیا جلوس پر پولیس نے اندھا دھند گولیاں برسائیں انکو بھی گولی لگی اور موقعہ ہی پر جان جاں آفریں کو سپرد کر دی۔

محمد حسن۔

فضل دین امرتسری کا معصوم اور کمسن بچہ تھا عمر کل ۹ سال کی تھی، پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا ڈائر کی گولیوں سے یہ نو شگفتہ پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا۔

حسی

حسی کے والد کا نام سکندر تھا، امرتسر کے رہنے والے تھے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے شہادت پائی۔

محمد ابراہیم

امام الدین کنڈکٹر کے لڑکے، ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے، امرتسر کے رہنے والے تھے، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شرکت کی اور وہیں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

امام الدین۔

والد کا نام مراد بخش تھا، عمر ۴۰ سال تھی، امرتسر میں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

علم الدین۔

عمر ۲۰ سال، چک نکند ضلع امرتسر کے رہنے والے تھے، ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے جلیانوالہ باغ میں ہونے والے جلسہ میں شرکت کی اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

محمد اسمٰعیل۔

والد کا نام میرن بخش تھا، ۱۸۸۵ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور وہیں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

محمد اسمٰعیل۔

عمر صرف ۱۴ سال، گوجرانوالہ میں ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے والد کا نام نظام الدین تھا جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں پولیس کی گولیوں سے درجۂ شہادت پایا۔

کریم بخش۔

عمر ۴۹ سال، امرتسر میں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے جلیانوالہ باغ میں شہید ہوئے۔

خیرالدین

عمر ۲۵ سال ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے والد کا نام منگتو روغن فروش تھا، امرتسر کے رہنے والے تھے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک رہے اور پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

خدابخش۔

عمر ۳۶ سال ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام عثمان شاہ تھا، امرتسر کے رہنے والے تھے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولیوں کا شکار ہوئے۔

محبوب شاہ۔

عمر ۳۰ سال ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام سید میر احمد شاہ تھا، امرتسر کے رہنے والے تھے، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شہید ہوئے۔

میران بخش۔

عمر ۳۴ سال ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے، امرتسر کے رہنے والے تھے والد کا نام نیکا کشمیری تھا، قلعی کا کام کرتے تھے، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک تھے، پولیس کی گولی کا نشانہ بنے۔

محمد دین۔

عمر ۲۲ سال ۱۸۹۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، والد کا نام خدا بخش تھا، رولٹ ایکٹ کیخلاف ہونے والے مظاہرہ میں شرکت کی ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو دہلی میں جلوس پر فائرنگ ہوئی تھی اسمیں شہید ہوئے

محمد اسماعیل۔

عمر صرف ۷ سال، امرتسر میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا اس کے باپ کا نام کریم الدین تھا جو الیاس کا مو کشمیری کے نام سے مشہور تھا یہ بچہ ایک پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا، بستہ پیٹھ پر لٹکا ہوا تھا اور جلسہ میں پہونچ گیا پولیس کی گولی اسکو لگی، شگفتہ پھول بننے سے پہلے ہی یہ غنچۂ نو دمیدہ انگریزی بربریت کا شکار ہو کر ہمیشہ کیلئے مرجھا گیا۔

محمد رمضان۔

عمر ۲۴ سال، امرتسر میں ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام رحیم بخش کشمیری تھا جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شرکت کیلئے گئے تھے پولیس کی گولی نے عالمِ آخرت میں پہونچا دیا۔

محمد صادق۔

عمر ۲۵ سال، ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام مراد بخش تھا، امرتسر کے رہنے والے تھے کینال ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے جلیانوالہ باغ کے جلسے میں شہید ہوئے۔

محمد شفیع۔

عمر ۳۰ سال، ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے والد کا نام جان محمد تھا ڈ نگر کا ظفر وال ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شرکت کیلئے گئے تھے وہیں پولیس کی گولی لگی اور شہید ہو گئے۔

محمد شفیع۔

عمر ۱۷ سال، ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے آپکے والد کا نام عبدالرحیم تھا، امرتسر ہی کے رہنے والے تھے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک تھے پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

محمد شفیع۔

عمر ۱۸ سال ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام رحیم بخش تھا، امرتسر کے باشندہ تھے

جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک تھے، وہیں پولیس کی گولی لگی اور وطن پر قربان ہوگئے۔

محمد شریف۔

والد کا نام محمد رمضان تھا، امرتسر کے رہنے والے تھے، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

محمد بخش۔

عمر ۲۵ سال ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے، امرتسر کے رہنے والے تھے، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک رہے اور پولیس کی گولی سے وہیں شہید ہوئے۔

محمد موسیٰ۔

عمر ۲۱ سال ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام جمال الدین کشمیری تھا، امرتسر میں سکونت تھی، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شہید ہوئے۔

نور محمد۔

عمر ۲۳ سال ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے، جھنڈو آئل مرچنٹ کے لڑکے تھے امرتسر کے رہنے والے تھے، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شہید ہوئے۔

نور محمد۔

عمر ۵۰ سال ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے باپ کا نام بوٹا ارائین تھا، امرتسر کے باشندہ تھے جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک تھے پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

رمضان علی۔

عمر ۲۳ سال، امرتسر میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام معلوم نہیں، ایک فیکٹری میں ٹرنر تھے، جلیانوالہ باغ کے جلسے میں شہید ہوئے۔

رحمت علی۔

عمر ۲۱ سال ۱۸۹۸ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے، والد کا نام شیخ نواب الدین تھا، جلیانوالہ باغ کے جلسہ میں شریک ہوئے اور وہیں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

باب (۵)

ہندوستان گیر سطح پر محاذ آرائی

پہلی جنگِ عظیم میں جو نومبر ۱۹۱۸ء میں ختم ہو گئی ترکی حکومت کے ساتھ برطانوی سامراج نے جو کچھ کیا اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں کو چھلنی کر دیا اور غم و غصہ کی تیز لہر پیدا کر دی ترکی کے بادشاہ کو خلیفۃ المسلمین کہا جاتا تھا، عالمِ اسلام میں ترکی حکومت کو خلافتِ اسلامیہ کے مقدس لقب سے یاد کیا جاتا تھا، مسلمانوں کے دونوں مقدس اور مذہبی شہر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی حفاظت و نگرانی اسی ترکی خلافت کے تحت تھی کیونکہ پورا عرب ترکوں کے زیرِ حکومت تھا انگریزوں نے ترکی کے حصے بخرے کر کے اس کی طاقت کو پاش پاش کر دیا اور مسلمانوں سے جو وعدہ تھا کہ مسلم حکومتوں سے ہماری کوئی جنگ نہیں ہے لیکن جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد جو ذلیل شرائط حکومتِ ترکی کے سامنے پیش کی گئیں تو مسلمانوں نے سمجھ لیا کہ ہمارے ساتھ دھوکہ کیا گیا حکومت کی اس بد عہدی نے مسلمانوں کے دلوں کو زخمی کر دیا جس کا نتیجہ خلافت تحریک کی شکل میں رونما ہوا۔

جس سال جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر کی وحشت و بربریت کا ننگا ناچ ہوا اسی سال یعنی ۱۹۱۹ء میں مسلمانوں نے خلافت کمیٹی قائم کی اور اپنے جذبات کے اظہار کیلئے ایک پلیٹ فارم بنایا، یہ تحریک طوفان کی طرح اُبھری اور آندھی کی طرح بڑھی اور سیلاب کی طرح پھیلی، اسکے رہنما بجلی کی طرح کڑکے اور رعد کی طرح گرجے، پورے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک انگریزی حکومت کے خلاف نفرت و حقارت اور غم و غصہ کی ایک تیز لہر چل پڑی، اس تحریک کو دو عظیم المرتبت اور قد آور رہنما مل گئے، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی تو سیاسی تاریخ میں علی برادران کے نام سے مشہور ہیں ان کی گرم قیادت نے مسلمانوں کے دلوں میں

آتشِ سیال بھردی، ان کی قومی، ملی غیرت وحمیت کی رگوں میں گرم خون دوڑنے لگا جو ۱۸۵۷ء کے بعد ہونے والے مظالم اور کربناک سزاؤں کی وجہ سے رگوں میں منجمد ہوگیا تھا۔

خلافت کا مسئلہ خالص مسلمانوں کا مسئلہ تھا، لیکن گاندھی جی نے اس کی حمایت کرکے برادرانِ وطن کے دلوں میں بھی اس کی تائید کا جذبہ پیدا کردیا، ہندوستان کی دونوں بڑی قومیں ہندو اور مسلمان اس طرح شیر وشکر ہوگئیں کہ ابتک کی تاریخ میں اس طرح کا عملی اتحاد کبھی نہیں پیدا ہوا تھا، پورے ملک پر خلافت تحریک اس طرح چھاگئی کہ اس کے فلک شگاف نعروں کے سامنے دوسری کوئی آواز اس وقت نہیں سنائی دے رہی تھی، دوسری سیاسی پارٹیوں کے خیموں میں سناٹا چھاگیا۔

اسی ۱۹۱۹ء میں مسلمانوں کی ایک اور جماعت وجود میں آئی جو جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی قیادت ورہنمائی کی ذمہ داری سنبھالنے کیلئے وجود میں آئی، اس کا نام جمیعۃ علمار ہند تھا اس کے بانی وہی علمار تھے جو تحریک خلافت میں آگے بڑھ کر حصہ لے رہے تھے اسلئے جمیعۃ علمار کی تنظیم سے وابستہ سارے رہنما مفتی کفایت اللہ، مولانا ثنار اللہ امرتسری، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا محمد صادق کراچوی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی وغیرہ نے خلافت تحریک کو پروان چڑھانے میں اپنی پوری توانائیاں لگادیں، بدیسی مال کا بائیکاٹ کیا اور دیسی کپڑوں کا رواج دیا، اس سلسلہ میں جوش وجذبے کا یہ عالم تھا کہ چوراہوں پر ولایتی کپڑوں کے انبار لگاکر ان میں آگ لگادی جاتی تھی اور لوگ اپنے کپڑے اتار اتار کر اس آگ میں جھونکتے جاتے تھے۔

اسکولوں، کالجوں اور دوسری سرکاری تعلیم گاہوں کا مقاطعہ کیا گیا، نان کوآپریشن اور عدمِ تعاون کی اتنی تیز آندھی چلی کہ حکومت کا نظام درہم برہم ہوگیا، شہر شہر، گاؤں گاؤں عدالتی پنچایتیں قائم ہوگئیں، لوگوں کے مقدمات انھیں پنچایتوں میں آتے، ان کے فیصلے کئے جاتے اور فیصلوں کا باقاعدہ نفاذ ہوتا اور کسی شخص کو عدالتوں میں جانے نہیں دیا جاتا تھا، کچہریوں میں سناٹا چھانے لگا، وکلار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے کوئی مقدمہ ان کے پاس نہیں آتا تھا، شراب کی دکانوں پر پکیٹنگ کی جاتی گاؤں اور قصبوں میں رضا کارانہ

تنظیمیں قائم کی جاتیں، یہی رضا کار گاؤں میں پہرے دیتے، ملزموں کو گرفتار کرتے، وردیاں، پیٹی، بلے اور عہدے تقسیم کرکے باقاعدہ عوامی پولیس کی حیثیت انکو دیدی گئی، ترکوں کی مالی امداد کیلئے گاؤں گاؤں جلوس نکالے جاتے انگریزوں کے خلاف نظمیں پڑھی جاتیں، جوش وجذبے کا یہ عالم کہ عورتیں اپنے جسم سے زیورات اتار کر چندے میں دے دیتیں۔

غرضیکہ خلافت کی تحریک ایک زلزلہ انگن اور ہولناک طوفان کی طرح ہندوستان میں اُبھری، مسلمانوں میں غیرت وحمیت جاگ اٹھی اور مادرِ وطن کی حرمت وعزت بچانے کے لئے سر سے کفن باندھ کر جد وجہدِ آزادی کے میدان میں اُتر چکے تھے، جیل جانا ایک کھیل بن گیا اور سینہ پر گولیاں کھانا باعثِ فخر اور روزمرہ کا مشغلہ ہوگیا تھا مسلمانوں نے دار ورسن کی رسمِ کہنہ کو پھر زندہ کر دیا، امنگوں کا یہ عالم تھا کہ محسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان سے برطانوی اقتدار کا جنازہ نکالا جارہا ہے۔

تحریک کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی یہ کیفیت تھی کہ جس نے اس طوفان کے رُخ کو موڑنے کی کوشش کی اس کی پگڑی سلامت نہ رہ سکی، خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کی موت وزیست کا مسئلہ بن کر رہ گیا تھا، خلافت تحریک کے رہنماؤں نے طے کرلیا تھا کہ جو انکے ساتھ ہے وہ انکا دوست ہے اور جو ان کے ساتھ نہیں ہے وہ دشمن کے سوا اور کچھ بھی نہیں جسے انھوں نے اپنا مخالف سمجھا اس کا سیاسی وجود ختم کر دیا، تحریک خلافت کے مخالف مسلمانوں کی لاشیں پڑی رہ جاتی تھیں لیکن قبریں دفن کرنے والے اور قبرستان تک جانے والے لوگ نہیں ملتے تھے، انکی نماز جنازہ پڑھنے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا، مخالفین کا سیاسی وسماجی بائیکاٹ کیا جاتا تھا، انھیں مسلم آبادیوں میں چلنا پھرنا دوبھر ہوجاتا تھا۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے ہندوؤں کے "سنگھٹن" کے مقابلے میں مسلمانوں کی مجلسِ تنظیم قائم کی وہ مسلمانوں کی نگاہوں سے گر گئے، خواجہ حسن نظامی نے "شدھی" کے مقابلے میں "تبلیغ" کا نعرہ بلند کیا لیکن مسلمانوں نے خواجہ حسن نظامی کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اُڑا دیا کیونکہ اس قسم کی تنظیموں اور تحریکوں سے ہندو مسلم اتحاد میں خلل آنے کا اندیشہ تھا اور اس سے تحریک خلافت کے کمزور پڑ جانے کا خطرہ تھا اور

ملک کے متحدہ محاذ میں شگاف پڑ جانے کا ڈر تھا اور یہ اس وقت مسلمانوں کو کسی قیمت پر منظور نہیں تھا۔

تحریک کے اثرات

تحریک خلافت اگرچہ ایک وقتی تحریک بن کر چند برسوں میں کچھ قدرتی اسباب کے تحت اپنے انمٹ اثرات چھوڑ کر ختم ہوگئی لیکن اس تحریک نے جو سیاسی شعور اور عوامی بیداری کی لہر پیدا کی اس سے قبل کبھی نظر نہیں آئی، یہ سیاسی بیداری آگے چل کر قائم ہی نہیں رہی بلکہ بڑھتی رہی بیس برس بعد ۱۹۴۲ء کی ہنگامہ خیز داستان پر جاکر پایۂ تکمیل کو پہونچی، جس نے برطانوی حکومت کو اتنا خوف زدہ کر دیا کہ لندن سے پے درپے مشن آنے لگے اور ہندوستان کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوششیں ہونے لگیں

تحریک ختم ضرور ہوگئی لیکن اس نے ہندوستان میں سیاسی بھونچال پیدا کر دیا اس نے برطانوی اقتدار کے تختِ طاؤس میں زلزلہ ڈالدیا اور حکومت کو تھر تھرا دیا، اس نے پورے ملک میں وہ تیز مشعل جلادی کہ ہندوستان کے عوام کو اس کی روشنی میں اپنی منزل نظر آنے لگی، ان میں سرفروشی اور جانبازی، جرأت وبیباکی کی وہ روح پھونک دی تھی کہ انکے دلوں سے برطانوی حکومت کا جاہ وطمطراق، رعب داب اور انگریزوں کے مغرورانہ جاہ وجلال کی ہیبت کو ختم کر دیا، ان کے ذہنوں سے انگریزوں سے مرعوبیت کے داغ دھبہ کو کھرچ کھرچ کر پھینک دیا اس تحریک کی یہ سب سے بڑی دین ہے۔

آزادی کا لفظ پہلی بار ہماری زبان پر آیا

ہندوستان میں ابھی تک تعلیم یافتہ اور اونچا طبقہ تھر تھراتے ہوئے ہونٹوں اور لڑکھڑاتی ہوئی زبانوں سے حقوق کی بھیک مانگ رہا تھا انگریزی سامراج کے سامنے بھکاری کی طرح دستِ سوال دراز کرتا رہا، اس تحریک نے ہندوستان کا تیور بدل دیا اس نے غیرت وخودداری کا جوہر پیدا کیا، تحریکِ خلافت کے بعد محمد علی نے انگریزوں کے پایۂ تخت لندن میں گرج کر کہا کہ:

"میں غلام ہندوستان میں واپس نہیں جاؤں گا، میں یہاں سے اسوقت لوٹوں گا جب میرے ہاتھ میں ہندوستان کی آزادی کا پروانہ ہوگا اور اگر

تم مجھے آزادی کا پروانہ نہیں دے سکتے تو میرے لئے اِسی سرزمین میں
ایک قبر کی جگہ تو دینی ہی پڑے گی ۔"

مولانا محمد علی جوہر کی یہ تقریر سنہرے حرفوں میں اسلئے بھی لکھی جانے کی مستحق ہے کہ ابتک کانگریس کے کسی مردِ مجاہد نے آزادیِ کامل کا نعرہ نہیں لگایا تھا اور نہ اس مطالبہ کی جرأت دکھائی تھی ابھی اس کو اس منزل تک پہونچنے کیلئے آٹھ دس برسوں کی مسافت اور طے کرنی تھی۔

روشن چراغ

محمد علی جوہر اور خلافت تحریک کے رہنماؤں نے مرعوبیت اور خوف و دہشت کے اس دور میں نعرۂ حق بلند کر کے ہندوستانیوں کے دلوں میں حریت و آزادی جرأت و بیباکی کی آتشِ سیال بھر دی تھی اور یہ جوش و جذبہ کی آگ اس وقت تک دہکتی رہی جبتک کہ ۱۵؍ اگست ۱۹۴۷ء کو حریت و آزادی کا ابرِ نیساں ہندوستان پر ٹوٹ ٹوٹ کر نہ برسا اسلئے کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۲۵ء تک جدوجہدِ آزادی کی جرأتمندانہ قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی اور پورا ہندوستان اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا، اس قیادت نے جرأت و بے خوفی کا وہ چراغ روشن کیا کہ مشکلات و مصائب کی ظلمتوں نے از خود راستہ چھوڑ دیا۔

نان کوآپریشن کا آغاز

اب ہندوستان میں مسلمانوں کی دو فعال اور متحرک تنظیمیں جنگِ آزادی کے میدان میں ملک کی رہنمائی کیلئے وجود میں آچکی ہیں ایک خلافت کمیٹی اور دوسری جمعیۃ علماء ہند، دونوں جماعتوں میں وہی روح کارفرما ہے جو ہمیشہ سے مسلمانوں کی تاریخ رہی ہے۔ جرأت و بے خوفی، حق گوئی و بیباکی، مصلحت اندیشی اور مداہنت سے مسلمانوں نے نہ سمجھوتہ کیا ہے اور نہ ان کے مزاج کو یہ چیزیں راس آتی ہیں، اس لئے سیاسی میدان میں آئینی جنگ کا آغاز کرتے ہوئے خلافت کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں ترکِ موالات (نان کوآپریشن) کا ریزولیشن ۹؍ جون ۱۹۲۰ء کو منظور کیا، ۲۲؍ جون کو وائسرائے کو اطلاع بھیج دی گئی کہ اگر یکم اگست ۱۹۲۰ء تک ترکوں کی شکایات رفع نہیں ہوئیں تو تحریکِ عدمِ تعاون شروع کر دی جائے گی، پہلی اگست کو دوبارہ نوٹس دیا گیا اور

۳۱ اگست ۱۹۲۰ء سے عدمِ تعاون کی تحریک شروع کر دی گئی۔

فتویٰ یا اعلانِ بغاوت

مسلمانوں کی دوسری تنظیم جمعیۃ علمار کا دہلی میں ایک اجلاس نومبر ۱۹۲۰ء میں ہوا اس اجلاس میں خلافت کمیٹی کے فیصلے کی تائید کرتے ہوئے انگریزی حکومت کے ساتھ ہر طرح کے تعاون کو حرام قرار دیا گیا۔ یہ اجلاس بڑا اہم اجلاس تھا کیونکہ اس کی صدارت حضرت شیخ الہند فرما رہے تھے جو ابھی تازہ تازہ جزیرۂ مالٹا کے قید خانے سے برسہا برس کی اذیتیں جھیلنے کے بعد ہندوستان واپس آئے تھے اور سیاسی لیڈروں کی آنکھوں کا تارا بن چکے تھے، عزت و احترام کے لحاظ سے نام کے بجائے ان کو شیخ الہند کے معزز لقب سے لوگ یاد کرنے لگے تھے۔

جلسہ میں ہندوستان کے مشاہیر علمار کے علاوہ صوبائی سطح پر کام کرنے والے مختلف صوبوں میں سے بنگال، سندھ، سرحد، بہار، آسام وغیرہ کے تقریباً پانچ سو علمار شریک اجلاس ہوئے، اس اجلاس نے فیصلہ کیا کہ اس تجویز کو فتویٰ کی شکل میں مرتب کر کے شائع کر دیا جائے فتویٰ مرتب کیا گیا اور اس پر ۴۷۴ علمار کے دستخط ہوئے اور طبع کرا کے ملک میں عام کر دیا گیا، اور ہندوستان کے ہر خطے میں بھیج دیا گیا، اس فتویٰ میں ترکِ موالات و تعاون کی وضاحت بھی کی گئی تھی کہ انگریزی حکومت کی معاونت اور قتلِ مسلم کی ملازمت کرنا، ملازم رہنا، ملازم کرانا، فوج میں بھرتی ہونا، بھرتی کرانا سب حرام ہے۔

فتویٰ ضبط کر لیا گیا

۸ اگست ۱۹۲۱ء کو یہ فتویٰ اور اس کا خلاصہ جو شائع کیا گیا تھا دونوں گورنمنٹ نے خلافِ قانون کہکر ضبط کر لیا اور وسطِ ستمبر ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ علمار کے رہنماؤں کو ملک کے مختلف مقامات سے گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا دو دو سال کی قیدِ بامشقت ہوئی، سزا کا فیصلہ سنانے والے سیشن جج نے اپنے فیصلہ میں جو ریمارک دیئے ہیں ان سے جمعیۃ علمار کے بارے میں حکومت کے نقطۂ نگاہ کا پتہ چلتا ہے، جج نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ

"ملزمان کے مذہب، عقائد اور جذبات کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے، یہ اندرونِ ہند اسلام نوازی ہے، ان تمام کارروائیوں سے یہ حقیقت روشن

ہوگئی کہ دراصل موجودہ انقلاب اور بے چینی کا اصل باعث نام نہاد علماء کی سازشی جماعت جمعیۃ علماء ہند ہے، جو خفیہ سازشیں نہیں عظیم الشان جلسے طلب کرکے بڑے بڑے پنڈالوں میں کھلم کھلا سازش کرتی ہے۔"

تجویز کیا تھی؟

ترکِ موالات کی جو تجویز پاس ہوئی اس میں واضح کیا گیا کہ موجودہ حالات میں گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ موالات ونصرت کے تمام تعلقات اور معاملات رکھنا حرام ہے جسکے تحت حسب ذیل امور بھی واجب العمل ہیں:

۱ - خطابات اور اعزازی عہدے چھوڑنا۔
۲ - کونسلوں کی ممبری سے علیحدگی اور امیدواروں کیلئے رائے دینا۔
۳ - دشمنانِ دین کو تجارتی نفع نہ پہونچانا۔
۴ - کالجوں اور اسکولوں میں سرکاری امداد نہ قبول کرنا اور سرکاری یونیورسٹیوں سے تعلق قائم نہ رکھنا
۵ - دشمنانِ دین کی فوج میں ملازمت نہ کرنا اور کسی قسم کی فوجی امداد نہ پہونچانا۔
۶ - عدالتوں میں مقدمات نہ لے جانا اور وکیلوں کیلئے ان مقدمات کی پیروی نہ کرنا۔

یہ تجویز اجلاس میں مولانا احمد سعید دہلوی ناظم جمعیۃ علماء ہند نے پیش کی اور تجویز کی تائید کرنے والوں میں مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا عبدالحلیم صدیقی لکھنوی اور مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری تھے۔

ہنگامۂ داروگیر شروع ہوگیا

سیاسی میدان میں مسلمانوں کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ سر سے کفن باندھ کر جہاد کے میدان میں وہ اتر چکے تھے، جیل جانا کھیل ہوگیا، یہ وہ زمانہ ہے جب انڈین نیشنل کانگریس بھی ابھی اتنی دور تک جانے کیلئے تیار نہیں تھی اور اتنی تیز اور گرم سیاست کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء ہند کے فیصلوں کے بعد کانگریس نے اپنے اجلاس کلکتہ میں نان کوآپریشن کا رزولیشن بعد میں منظور کیا۔

ترکِ موالات کی یہی تجویز اور یہی فتویٰ تھا جس کی بنیاد پر کراچی کا مشہور مقدمہ ہوا جس کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی اور مسلمانوں کی جرأت، حق گوئی اور اپنے نصب العین

سے عشق و محبت کا لوگوں نے ایک دلکش نظارہ دیکھا اور اس سے سبق لیا۔

مقدمہ کراچی ۸ / ۹ / جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں زیرِ صدارت مولانا محمد علی جوہر آل انڈیا خلافت کانگریس کا اجلاس ہوا، اس اجلاس میں ایک تجویز وہ بھی تھی جس میں انگریزی حکومت کی پولیس اور فوج میں ملازمت کو حرام قرار دیا گیا تھا کسی چیز کی حلت و حرمت کا فیصلہ ایک عالمِ دین ہی کرسکتا ہے، اس اجلاس میں وہ عالمِ دین مولانا حسین احمد مدنی کی ذات تھی، مولانا مدنی نے یہ تجویز اجلاس میں پیش کی، اس کی تائید میں تقریر کرنے والوں میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، اور مولانا نثار احمد تھے، بعد میں اس تجویز کو فتویٰ کی شکل میں مرتب کرکے شائع کردیا گیا اس فتویٰ پر دستخط کرنے والوں میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا نثار احمد اور پیر غلام مجدد شامل تھے، اس کو طبع کراکے ملک میں تقسیم کیا گیا حکومت نے اس کو قانون کے خلاف قرار دیکر ضبط کرلیا اور تجویز پیش کرنیوالوں اور تائید کرنے والوں اور فتویٰ پر دستخط کرنے والوں کے نام بلا ضمانتی وارنٹ جاری کردیے گئے

مولانا حسین احمد مدنی کو دیوبند سے ایک انگریز افسر نے گورا فوج کے جوانوں کو لیکر رات میں گرفتار کیا اور فوجی پہرے میں دیوبند سے کراچی پہونچایا، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا نثار احمد، اور پیر غلام مجدد کو اپنے اپنے مقامات سے گرفتار کرکے کراچی جیل بھیج دیا گیا ان لوگوں پر دفعہ ۱۲۰ (ب) دفعہ ۵۰۵، دفعہ ۱۱۷ تعزیراتِ ہند کے تحت ان لوگوں کو کراچی جیل کی حوالات میں بند کردیا گیا، ۲۰ / ستمبر ۱۹۲۱ء کو خالق دینا ہال بندر روڈ کراچی میں ان لوگوں پر مقدمہ چلایا گیا، چونکہ مقدمہ انتہائی سنگین تھا اور بڑی سے بڑی اور سخت سے سخت سزا دی جاسکتی تھی اس لئے متوقع شورش کے پیشِ نظر حکومت نے پبلک کو مرعوب اور خوف زدہ کرنا ضروری سمجھا، اس لئے اُس نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا، مسلح پولیس اور فوج کا بھاری انتظام کیا اور انکو خالق دین ہال کے چاروں طرف پھیلا دیا گیا اور یہ بھی پابندی لگا دی گئی کہ مقدمہ کی کارروائی سننے اور دیکھنے کیلئے بغیر اجازت نامہ کوئی شخص احاطۂ عدالت میں داخل نہیں ہوسکتا، ۲۶ / ستمبر کی صبح ہی سے پولیس اور فوج نے عدالت کو حصار میں لے لیا شہر کے لوگ حیرت زدہ تھے کہ خلافِ معمول آج مسلح پولیس اور فوج کی

اتنی بڑی تعداد کیوں بلائی گئی، حقیقتِ حال معلوم کرنے کیلئے لوگ گھروں سے نکل آئے اور سڑکوں پر پھیل گئے، بھیڑ بڑھتی گئی، کچھ دیر بعد پولیس اور فوج نے لوگوں کو سڑکوں سے ہٹانا شروع کیا ۱۱ بجے ملزمان پولیس کی گاڑی میں اس طرح لائے گئے کہ پولیس کی کئی گاڑیاں آگے آگے چل رہی تھیں اور کئی گاڑیاں پیچھے پیچھے، ملزمان کی جیپ بیچ میں چل رہی تھی۔

اس مقدمہ میں جو بیانات دیئے گئے وہ زبان سے نکلے ہوئے چند الفاظ نہیں تھے بلکہ انکو زبان سے ادا کرنے کیلئے فولاد کا جگرا اور آہنی عزم وارادہ کی طاقت چاہیئے تھی، عدالت میں بیان نہیں تھا جہادِ اکبر تھا، اس مقدمہ میں دوسروں کے بیانات بھی حق گوئی دبیباکی کے شاہکار تھے لیکن مولانا حسین احمد مدنی نے جو بیان دیا وہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا جائیگا آپ نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

اگر گورنمنٹ کا منشا مذہبی آزادی کو سلب کرنا ہے تو صاف صاف اعلان کر دیا جائے تاکہ سات کروڑ مسلمان اس بات پر غور کر لیں کہ آیا انکو مسلمان رہنا منظور ہے یا گورنمنٹ کی رعایا، اسی طرح ۲۲ کروڑ ہندو بھی غور کر لیں کہ انکو کیا کرنا چاہیئے، کیونکہ جب مذہبی آزادی چھینی جائے گی تو سب کی چھینی جائے گی۔

"اگر لارڈ ریڈنگ اس لئے ہندوستان بھیجے گئے ہیں کہ قرآنِ مجید کو جلا دیں اور حدیثوں کو مٹادیں اور فقہ کی کتابوں کو تباہ و برباد کر دیں تو سب سے پہلے اسلام پر اپنی جان قربان کرنے والا میں ہوں گا۔"

اس بیان پر بے قابو ہو کر حاضرین نے نعرۂ تکبیر بلند کر دیا اور مولانا محمد علی نے بڑھ کر مولانا مدنی کے ہاتھ چوم لیے سارے ملزمان کو سیشن سپرد کر دیا گیا، سیشن جج نے خلافِ توقع صرف دو دو سال کی قیدِ بامشقت کا فیصلہ سنایا اور تمام ملزمان مولانا حسین احمد مدنی مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا نثار احمد، پیر غلام مجدد کو سابرمتی جیل بھیجدیا گیا۔

سول نافرمانی جاری رہی

۱۹۲۲ء میں تحریکِ خلافت کی سرگرمیاں شباب پر تھیں ہندوؤں اور مسلمانوں میں مثالی اتحاد تھا، اس لئے

سول نافرمانی کی تحریک شدت اختیار کرتی جا رہی تھی، جس طرح علی برادران اور جمعیۃ علماء کے رہنما تحریکِ خلافت کی روح رواں تھے اسی طرح گاندھی جی بھی ستیہ گرہ کی قیادت کر رہے تھے اور اب گاندھی جی ملک کے متفقہ لیڈر ہو چکے تھے اور انقلاب پسندوں کا پورا اعتماد انکو حاصل ہو چکا تھا اس لئے جب انھوں نے ستیہ گرہ کا اعلان کیا تو پورے ملک میں یہ سلسلہ چل پڑا اور مسلمانوں کے ساتھ دوسرے برادرانِ وطن بھی بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لینے لگے، دونوں کی تحریکیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں کیوں کہ دونوں کا نشانہ برطانوی سامراج تھا، خلافت تحریک سے سیاسی بیداری عام ہوتی جارہی تھی شہروں سے نکل کر وہ گاؤں تک پہونچ چکی تھی، عوام اپنی طاقت پہچاننے لگے تھے اور سول نافرمانی میں آگے بڑھ کر حصہ لینے لگے تھے۔

انگریزی حکومت سے نفرت اتنی عام ہو چکی تھی کہ ملک میں ہر طرف شورش برپا تھی ترکِ موالات اور عدمِ تعاون نے جس طرح عدالتوں کا بائیکاٹ کیا تھا اسی طرح پولیس اور انتظامیہ سے بھی نفرت اور غصہ عام ہوتا جا رہا تھا اور نوبت یہاں تک آچکی تھی کہ عوام حکومت کی مشنری کے ایک ایک پُرزے سے اپنی بیزاری کا اظہار ضروری سمجھنے لگے تھے، اسی نفرت و غصہ اور انگریزی حکومت سے بیزاری کا نتیجہ تھا کہ دیوریا ضلع کے ایک گاؤں چوری چورہ میں عوام نے تھانے پر دھاوا کیا، عمارت میں آگ لگا دی اور چھ سپاہیوں کو اس آگ میں پھونک دیا۔

چوری چورہ میں کیا ہوا؟

چوری چورہ پہلے گورکھپور ضلع میں تھا اور جب دیوریا کو ضلع بنا دیا گیا تو وہ دیوریا ضلع میں شمار کیا جانے لگا یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے یہاں کھالوں کی تجارت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے اس لئے یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی آبادی ہے۔

کانگریس کی تحریک نان کوآپریشن شباب پر تھی، اسی زمانے میں چوری چورہ کا واقعہ ظہور پذیر ہوا، یہ واقعہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے یہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے، گورکھپور ضلع میں اس تحریک میں روح پھونکنے والا عبداللہ تھا جو موضع راجدھانی کا رہنے والا تھا جو تھانہ چوری چورہ کے حلقہ میں آتا ہے، اس نے احمد آباد

کے کانگریس سیشن میں والنٹیر کے فرائض انجام دیئے تھے اور مطبخ کا نظام اس کے سپرد تھا، وہ بسلسلۂ روزگار احمد آباد گیا ہوا تھا، وہاں سے واپسی کے بعد اس نے ضلع گورکھپور میں والنٹیرو کی تنظیم کی، کسانوں اور کھیت مزدوروں کو منظم کیا، اس کام میں اس کے دو ساتھی لعل محمد اور بھگوان یادو بھی تھے چوری چورہ گاؤں میں ان نوجوانوں نے ۳۵ والنٹیر بھرتی کیے، لعل محمد کو منڈل کانگریس کا سکریٹری چنا گیا، اب باقاعدہ ان والنٹیروں نے شراب کی دکانوں پر پکٹنگ شروع کر دی شراب کے ٹھیکیداروں نے پولیس سے شکایت کی، پولیس نے ان والنٹیروں کو پکڑ کر بید سے مارا اور پیٹا، اور پھر ان کے زخموں پر نمک چھڑک کر تھانے سے باہر ڈھکیل دیا اور یہ حکم سنایا گیا کہ اس علاقہ کو چھوڑ کر کہیں نکل جائیں، اس ظلم و بربریت کے خلاف لعل محمد نے ضلع کانگریس کے صدر سبحان اللہ کو تحریری شکایت بھیجی، اس پر فیصلہ ہوا کہ تھانے پر مظاہرہ کیا جائے، اور تھانے دار سے پوچھا جائے کہ اس نے والنٹیروں کے ساتھ یہ بہیمانہ سلوک کیوں کیا؟ ایک مقررہ تاریخ پر مظاہرہ کرنے والوں کا جتھہ ڈومری گاؤں سے چل کر چوری چورہ تھانے پر پہونچا، تھانیدار نے جلوس کے سامنے حاضر ہو کر معافی مانگ لی اور جلوس لوٹنے لگا، تھانے سے کچھ دور جانے کے بعد فائرنگ کی آواز سن کر جلوس پھر لوٹ پڑا، پولیس نے لوٹتے ہوئے جلوس پر گولی چلا دی، جلوس نے تھانے پر پتھراؤ شروع کر دیا، پولیس نے پتھر کا جواب بندوق کی گولیوں سے دیا، جلوس کے تین آدمی وہیں خاک و خون میں تڑپ تڑپ کر مر گئے، جس میں چوری چورہ کے مولوی نذر علی کے علاوہ رام کھلاون اور بھگوان کے نام شامل ہیں پولیس کی گولیاں ختم ہو گئیں تو وہ تھانے میں گھس گئی۔

جلوس والوں نے میدان خالی دیکھا تو مٹی کا تیل چھڑک کر تھانے میں آگ لگا دی جس میں تھانیدار اور ایک انسپکٹر، ہیڈ کانسٹبل، دس سپاہی، مسلح گارد کے چھ سپاہی اور چار چوکیدار جل کر راکھ ہو گئے۔

جلوس نے تھانے سے واپس ہو کر ٹیلیگراف کی لائن کاٹ دی اور موضع کرمہا کے قریب ریلوے لائن کو اکھاڑ دیا، ڈاکخانہ اور ریلوے اسٹیشن پر کانگریس کا جھنڈا لہرا دیا۔

اس دیار پر قیامت ٹوٹ پڑی

پولیس کی اطلاع پر گورکھپور کے کلکٹر نے پٹنہ سے فوج اور سول پولیس کو طلب کیا، اس نے آکر علاقہ کی تیار فصل میں آگ لگا دی اور جو بھی مل گیا اس کے ہاتھ پاؤں مار کر توڑ دیئے، گاندھی جی اس وقت کانگریس کے لیڈر تھے انھوں نے پولیس والوں کو جلا دینے کی مذمت کی اور نان کوآپریشن کی تحریک کو واپس لینے کا اعلان کر دیا جس کی وجہ سے سیاسی لیڈروں میں گاندھی جی کے خلاف بدگمانیاں پھیل گئیں اور پورے ہندوستان میں مایوسی اور بد دلی پھیل گئی اور پولیس نے اس علاقہ میں من مانی کارروائی شروع کر دی۔

ڈپٹی انسپکٹر جنرل سینڈے نے اندھا دھند گرفتاریاں شروع کر دیں، ۲۳۷ افراد پر دفعہ ۱۲۰ شہنشاہ کے خلاف بغاوت، دفعہ ۳۰۲ قتلِ عمد، دفعہ ۳۹۵ ڈکیتی، دفعہ ۴۳۵ آتش زنی، دفعہ ۳۳۲ سرکاری ملازموں پر حملہ، ٹیلیگراف ایکٹ کی دفعہ ۱۲۵ اور ریلوے ایکٹ کی دفعہ ۱۲۶ کے تحت مقدمہ چلایا گیا، ۲۳۷ ملزمان میں ۵۶ افراد فرار تھے، ۱۸۱ کو سیشن سپرد کیا گیا ان میں سے ۱۷۲ کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا، ہائیکورٹ میں اپیل کے بعد ۱۹ کو سزائے موت ۱۶ کو عمر قید اور ۹۳ کو مختلف المیعاد سزائیں دی گئیں، ان پھانسی دیئے جانے والوں میں تحریک کے دونوں لیڈر عبداللہ اور لعل محمد بھی شامل تھے، ان تمام لوگوں کو ۲ر جولائی ۱۹۲۳ء کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا ان سے پہلے مولوی نذر علی کو تھانے ہی پر گولیوں سے بھون چکی تھی،

(یہ ساری تفصیل شمبھو ناتھ چترویدی کے مضمون شائع شدہ قومی آواز لکھنؤ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۱ء سے لی گئی ہے)

حکومت جھک گئی

تھانے میں آگ لگانا، پولیس کو آگ میں بھون دینے کی جرأت اس لئے پیدا ہوئی کہ عوام محسوس کرنے لگے کہ اب انگریز ہندوستان میں چند دنوں کا مہمان ہے اور اس کا سارا نظام درہم برہم ہو کر رہیگا یہی وجہ تھی کہ سول نافرمانی اور ستیہ گرہ کی تحریک طوفان کی شکل اختیار کرتی جارہی تھی اور اس نے ایوانِ حکومت میں زلزلہ ڈالدیا تھا، تحریک کی ہمہ گیری اور شدت سے

مجبور ہو کر حکومت سوچنے لگی تھی کہ ہندوستان کی منہ بھرائی کئے بغیر نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے، اسلئے "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء" کا اعلان کرتے ہوئے کہا گیا کہ پارلیمنٹ کی پالیسی کا اعلان کیا جا چکا ہے، حکومت کے ہر شعبہ میں ہندوستانیوں کی تعداد مسلسل بڑھائی جائے تاکہ اس سے برٹش انڈیا میں بحیثیت سلطنتِ برطانیہ کے اہم جزر کے ذمہ دارِ حکومت کا مسلسل احساس پیدا ہو۔

اس اعلان کی پھر تجدید ۹ر فروری ۱۹۲۱ء کو جدید اسمبلی کے افتتاح کے وقت بادشاہ کی طرف سے ڈیوک آف کیناٹ نے کی، آپ نے کہا کہ:

"سالہا سال سے بلکہ چند نسلوں سے ہمدردانِ ملک اور وفادار ہندوستانی اپنی بھارت ماتا کیلئے سوراج کا خواب دیکھ رہے ہیں، آج میری سلطنت میں آپ کیلئے سوراج کی ابتدا ہو رہی ہے اور آپ کو ترقی کے وسیع ترین اور اعلیٰ درجہ کے مواقع مل رہے ہیں، جن سے میری نوآبادیات کے مانند آزادی حاصل ہو۔"

اس کے بعد وائسرائے ہند اور دوسری بار ڈیوک آف کیناٹ کی تقریر ہوئی تو اس میں بھی صاف لفظوں میں بیان کیا گیا کہ اب مطلق العنان حکومت کا اصول قطعی طور پر ختم کر دیا گیا، بس اس وقت سے ہندوستان معتدبہ درجہ میں اپنا بوجھ خود اٹھائے گا۔

گاندھی جی کی قیادت پر شک وشبہ کا اظہار

چوری چورہ کے واقعہ کے بعد جب گاندھی جی نے تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا تو حکومت کا اندازِ گفتگو یک بیک بدل گیا ۲ر اگست ۱۹۲۲ء کو مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے پارلیمنٹ کے اجلاس میں حکومت کی طرف سے دیئے گئے سابقہ بیانات کے برعکس صاف صاف کہدیا کہ:

"ہندوستان میں بغیر انگریزوں کے گاڑی چلنے والی نہیں ہے، اگر انگریز ہٹ گئے تو یہ عمارت منہدم ہو جائے گی، ہماری غرض اصلاحات دینے سے یہ نہیں کہ انجام کار ہم اپنی امانت سے بالکل دست بردار ہو جائیں۔

اسی لئے گاندھی جی کے تحریک کو یک بیک ختم کر دینے کی وجہ سے وطن میں جو شکوک وشبہات کی فضا پیدا ہوئی وہ بہت دیر میں معتدل ہوئی، اعتراض کرنے والوں نے گاندھی جی کی نیت پر بھی شک کیا اور کہنے لگے کہ گاندھی جی کو مسلمانوں کی پیش قدمی پسند نہیں تھی، لیکن خود گاندھی جی نے جو وجہ بیان کی وہ کانگریس کے چوٹی کے لیڈر سی، آر، داس جیسے لیڈروں کو مطمئن نہ کر سکی، پنڈت جواہر لال نہرو جیل میں تھے گاندھی جی نے انکو اپنی صفائی میں ایک طویل ترین خط لکھا کیونکہ اب ان کا بھی دل صاف نہیں تھا۔

گاندھی جی نے تحریک سول نافرمانی کی بنیاد عدمِ تشدد پر رکھی تھی، ان کا عذر یہ تھا کہ چوری چورہ میں چھ کانسٹبلوں کو قتل کر کے عوام نے ظاہر کر دیا کہ اہنسا اور عدمِ تشدد کی تحریک چلانے کی ان میں ابھی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی ہے، مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنی آخری تصنیف "انڈیا ونس فریڈم" میں اس واقعہ کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ :

> "گاندھی جی کے علاوہ سب لیڈر (خود مولانا آزاد بھی) جیل میں تھے، گاندھی جی نے چوری چورہ واقعہ کی وجہ سے تحریک کو معطل کر دیا سیاسی حلقوں میں اس کا شدید ردعمل ہوا اور سارے ملک میں شکست کی فضا پیدا ہو گئی، مسٹر سی، آر، داس کو یقین تھا کہ تحریک بند کرنے میں گاندھی جی نے ایسی غلطی کی ہے جس سے شدید نقصان ہوگا اس نے سیاسی کام کرنے والوں کی ہمتیں پست کر دیں کہ اب پبلک میں ایسا جوش برسوں تک پیدا نہیں کیا جا سکے گا۔"

گاندھی جی کے اس طرزِ عمل سے ایک طبقہ مسلمانوں میں وہ بھی تھا جو اگرچہ تحریکِ آزادی کا حامی تھا مگر اس کو گاندھی جی کی قیادت پر اعتماد نہیں تھا، اسے خطرہ تھا کہ گاندھی جی اپنے مخصوص عقیدہ کی وجہ سے کسی بھی مرحلے پر بلا استصواب و بلا مشورہ تحریک بند کرنے کی پرانی غلطی دہرا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک ظاہری اور کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ انگریزی حکومت چونکہ اس کا نشانہ تھی اسلئے اس نے اپنے جملہ ذرائع تحریکِ آزادی سے لوگوں کو برگشتہ

کرانے میں لگادیے تھے، آزادی کی راہ میں پیش قدمی کرنے کے سلسلہ میں یہ تذبذب ایک زبردست رکاوٹ تھا کیونکہ قائد اپنا اعتماد کھوچکا تھا یہ صورتِ حال کچھ کم و بیش سنہ ۱۹۲۹ء تک رہی۔

تحریکِ آزادی پھیلتی رہی

خلافت تحریک اور جمعیۃ علماء کے رہنماؤں کے دلیرانہ اقدامات و بیانات نے پورے ملک میں گرمی پیدا کردی تھی اور سیاسی کارکنوں کو جھنجھوڑ کر رکھدیا، اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں بسنے والے ہر طبقہ کے لوگوں نے بڑی ذہنی اذیت کے ساتھ یہ محسوس کرنا شروع کردیا کہ ہم غلام ہیں، محکومی اور غلامی کی ذلت میں ہم گرفتار ہیں، سمندر پار کی ایک سفید فام قوم نے ہماری خودداری اور غیرتِ قومی کو کچل کر رکھدیا ہے ہماری قومی، مذہبی، اقتصادی اور سماجی تباہیوں کا واحد سبب صرف برطانوی حکومت ہے، اس لئے قدرتی طور پر ملک کے ہر طبقہ میں ان کے خلاف نفرت وغصہ کا جذبہ بھڑک اٹھا، جس طبقہ کو جب بھی اور جہاں بھی موقعہ ملا اس نے انگریزی حکومت کے خلاف اپنی شدید نفرت وغصہ کا اظہار کیا، جس کی پاداش میں اس کو کڑی سے کڑی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا، ہم نے شروع میں بنگال، پشاور، مدراس، سنگاپور، چاٹگام اور مانڈلے وغیرہ میں انگریزوں کے خلاف کی جانے والی مسلمانوں کی جدوجہد اور برطانوی حکومت کے خلاف کی جانیوالی بغاوتوں کا تذکرہ کیا ہے، اسی سلسلہ میں کیرالہ کے مسلمان موپلاؤں کی تحریکِ آزادی کا ذکر بھی ضروری ہے۔

مسلمان کسانوں میں آزادی کی تحریک

جنوبی ہند میں کیرالہ میں خصوصیت کے ساتھ مالابار کا نام جنگِ آزادی کی تاریخ میں یادگار رہے گا موپلا کسانوں نے انگریزوں کے خلاف شاندار لڑائی لڑی اور بڑی بہادری کے ساتھ ان مسلمان کسانوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا، یہ آگ سنہ ۱۹۲۱ء میں پورے طور پر مالابار میں بھڑک اٹھی تھی، یہی وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں نے سول نافرمانی اور ترکِ موالات کی تحریک پوری قوت سے چلائی تھی اور کانگریس نے اپنے پلیٹ فارم سے ستیہ گرہ کا سلسلہ شروع کیا تھا، ملک کے سیاسی حالات سے متاثر ہوکر

مالابار کے مسلمان کسانوں نے بھی اس تحریک میں حصہ لیا اور بھرپور حصہ لیا، موپلے خود انتہائی بُردبار، شریف اور نرم دل ہیں لیکن جب وطن کی آزادی کا سوال آیا تو اُن کے دل سخت چٹان ثابت ہوئے، اور فولادی عزم وارادے کے انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ انھوں نے سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیا اور اس علاقے میں نافذ ہونے والی دفعہ ۱۴۴ توڑی، انگریز کلکٹر سرٹامسن نے تحریک کو کچلنے کیلئے نہایت بہیمانہ مظالم کیے۔ پہلے لیڈروں کو پکڑا گیا، اس کے بعد کالی کٹ کی پولیس نے خلافت کمیٹی کے رضا کاروں کو گرفتار کر کے مارا پیٹا، رضا کاروں کی وردیاں اتروالیں، پھر بلا امتیاز عام مسلمان کسانوں کی گرفتاری شروع کر دی، موپلوں کے مذہبی پیشوا کو گرفتار کر لیا گیا تو احتجاج کیلئے جمع ہونیوالے مجمع پر پولیس نے فائرنگ کی اور اندھا دھند گولیاں برسائیں، جس کی وجہ سے چارسو موپلے موقعہ ہی پر ہلاک ہوگئے، فرعونیت کے اس مظاہرہ سے موپلے اور مشتعل ہوگئے، انھوں نے بجلی کے تار کاٹ دیے، ریل کی پٹریاں اُکھیڑ دیں، جیل کا دروازہ توڑ کر قیدیوں کو نکال لائے پولیس والوں کے ہتھیار لوٹ لئے، شراب کی دکانوں میں آگ لگا دی، کچہریوں کے فرنیچر توڑ پھوڑ دیے، تمام پل اور راستے تباہ وبرباد کر دیئے، اس ہنگامہ میں ہزاروں موپلے مارے گئے جو پکڑے گئے انکو جیلوں میں ٹھونس دیا۔

دردناک سزا

گرمیوں کا موسم تھا، پولیس ایک سو موپلوں کو گرفتار کر کے مال گاڑی کے ایک ڈبے میں جانوروں کی طرح بند کر کے لے گئی، ان میں سے ۶۴ آدمی گرمی حبس اور پیاس کی شدت سے تڑپ تڑپ کر اس مال گاڑی کے ڈبے ہی میں مر گئے اور بقیہ دوسرے لوگ جب نکالے گئے تو ان میں سے کسی میں بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت نہیں تھی اس وحشیانہ حرکت کے ذمہ دار حکام سے نہ باز پرس کی گئی اور نہ ان کے خلاف کوئی محکمہ جاتی کارروائی ہوئی گویا کچھ ہوا ہی نہیں جیسے وہ انسان نہیں تھے مکھی مچھر تھے جو یوں ہی روز مرتے رہتے ہیں، شقاوتِ قلبی کی یہ انتہا تھی۔

ظالم حکومت کا ظالمانہ فیصلہ

۶۴ موپلوں کی دردناک موت اور بند گاڑی میں دم گھونٹ کر مار دیئے جانے پر صرف ایک انگریز

سارجنٹ پر مقدمہ چلایا گیا اور وہ بھی بری کر دیا گیا، اور چوری چورہ میں سات کانسٹبلوں کے مارے جانے پر ۲۷ اکے لئے یہی انگریزی عدالت پھانسی کا فیصلہ سناتی ہے! یہی وہ ظالمانہ طرزِ عمل حکومت کا تھا جس نے ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں سے غم و غصہ اور نفرت کے جذبے کو تیز سے تیز تر کر دیا، طاقت کا بے محابا استعمال غیر تمند انسانوں کے لئے چیلنج بن جاتا ہے جیسا کہ ہم انھیں موپلا کسانوں کی جدوجہدِ آزادی کی سرگرمیوں میں پاتے ہیں۔
ان کسانوں کی رہنمائی اس علاقے کی کمیونسٹ پارٹی کر رہی تھی اور مرکزی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں کی نگاہیں اس علاقے میں چلنے والی تحریک پر ہمیشہ لگی رہیں، انھوں نے ان مظالم کے چند ہی سالوں بعد شاندار طور پر یومِ آزادی منایا، اس میں اتنا جوش و خروش تھا کہ وہ خطرناک سے خطرناک قدم بھی اٹھا سکتے تھے، برطانوی حکومت بھی اس خطرے کو محسوس کر رہی تھی، اس نے پولیس کے ذریعہ کسانوں پر ڈنڈے برسائے، کسانوں نے بھی پولیس کو ترکی بہ ترکی جواب دیا، دونوں طرف سے باقاعدہ جنگ چھڑ گئی وہ بھی مسلح جنگ، بہت سے لوگ مارے گئے، بہت سے گرفتار ہوئے اور پھانسی پر چڑھائے گئے، مگر اس کے بعد اس تحریک نے اور بھی زور پکڑا سیاسی سرگرمیوں میں اور بھی تیزی آئی جگہ جگہ باغیانہ کارروائیوں کا ظہور ہونے لگا۔

موپلا کسانوں کی تحریک کا مقبول ترین لیڈر ابوبکر تھا، ابوبکر کی والدہ خدیجہ خاتون شمالی مالابار کی رہنے والی تھی، بڑی بہادر اور جری عورت تھی اس نے خود کسانوں کی اس تحریک میں جرأتمندانہ حصہ لیا تھا، ابوبکر نے ایسی بہادر ماں کی آغوش میں تربیت پائی تھی ماں کے جذبۂ آزادی نے نوجوان ابوبکر پر گہرا اثر ڈالا تھا اور وہ موپلا کسانوں کی باغیانہ تحریک کا ہیرو بن گیا، ۱۹۳۷ء میں کسان سبھا نے ایک بڑا جلوس نکالا جو اشتعال انگیز اور برطانوی حکومت کے خلاف گرما گرم نعرے لگاتا ہوا بڑھ رہا تھا، جلوس کی قیادت ابوبکر اور اس کے دو ساتھی کر رہے تھے جب کہ پولیس کی طرف سے ان تینوں کے نام وارنٹ تھے، ابوبکر اور اس کے دونوں ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا، عدالت میں ان تینوں پر مقدمہ چلایا گیا اور ہر ایک کے لئے پھانسی کا حکم ہوا۔

سی پی آئی (ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی) کے لیڈران پی سی جوشی، سُندریا اور کرشن کرپلانی کو جب ابوبکر اور اس کے ساتھیوں کی پھانسی کے حکم کی خبر ملی تو یہ سب کے سب ان سے ملنے جیل گئے، تینوں چوٹی کے لیڈروں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے وہ جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور بے اختیار رو پڑے، ابوبکر اور اس کے ساتھیوں نے جب اپنے لیڈروں کو روتے ہوئے دیکھا تو جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے چیخ پڑے اور کہا کہ مادرِ وطن کی آزادی کیلئے ہم خوشی سے مرنے کیلئے تیار ہیں، آگے بڑھو، انقلاب زندہ باد پھر انھوں نے اپنی جانیں دے کر مادرِ ہند کے نام پر شہید ہونے والے سپوتوں میں اپنا نام روشن کر لیا اور اپنی بہادری کی بے نظیر مثال بعد میں آنے والی نسلوں کیلئے چھوڑ گئے۔

کیرالا میں ایک اور بہادر لیڈر تھا جس کا نام عبدالرحمٰن تھا اس نے پوری زندگی جنگِ آزادی کے میدانوں میں گذار دی، اپنی تیز تر سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے اسکو پولیس گرفتار کرتی رہی اور جیلوں میں بند کرتی رہی لیکن اس کا آگے بڑھا ہوا قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹا، اسکی زندگی کا بہت سا بہترین زمانہ برطانوی حکومت کی جیلوں میں گذرا۔

مسلمان سُرخ پرچم کے تلے

آزادی کی جد وجہد کے سلسلہ میں ہندوستان کے اندر کمیونسٹ پارٹی کی داغ بیل ڈالنے والوں میں مسلمان لیڈروں کے نام سرِ فہرست ہیں، مسلمانوں کا پر جوش نوجوان اور بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ اس طرف پہلے مائل ہوا اور اس نے کمیونسٹ پارٹی کے جھنڈے کے نیچے بڑے جرأتمندانہ اقدامات کئے اور اپنے خونِ جگر سے آزادی کی مشعل کو جلائے رکھا، منظفر احمد، نذرالاسلام جو کمیونسٹ پارٹی کے مشہور رہنما ہیں، عبدالرزاق خاں جو وہابی تحریک کے لیڈر اور مولوی فیض اللہ کے خاندان کے چشم و چراغ تھے ان تمام لوگوں نے جنگِ آزادی میں مردانہ وار حصہ ہی نہیں لیا بلکہ ملک کی رہنمائی کی اور ایک مدت تک عوام میں رہ کر انھوں نے بڑے ہی اہم کارنامے انجام دیئے، ان لوگوں نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز اس دور میں کیا جب انگریزوں کے جاہ و جلال کا سورج نصف النہار پر تھا، انگریزوں کے خلاف زبان کھولنا بھی بڑے دل گردے کا کام تھا، ان میں سے ہر ایک بار بار گرفتار ہوتا رہا؛

پولیس نے سخت سے سخت تر ان کو اذیتیں پہونچائیں، قید و بند کی مصیبتیں انھوں نے برداشت کیں لیکن وہ اپنے مشن کو لے کر ہمیشہ آگے بڑھتے رہے۔ بنگال کے قطب الدین احمد، محمد عبد العلی، عبد الحلیم، مظفر احمد کے ساتھ انکی ساری سرگرمیوں میں دوش بدوش رہے۔

کمیونسٹ پارٹی نے کسان سبھا اور مزدور پارٹی کی تشکیل کی، یوپی میں ستیہ بھگت اور مولانا شوکت عثمانی نے اس کی تنظیم کی، بنگال میں کسان سبھا قائم ہوئی، بردوان کے ایک معزز گھرانے کے دو اشخاص سید شہید اللہ اور ان کے بھائی ابو المنصور حبیب اللہ اس انقلابی تحریک سے وابستہ تھے، انھیں کے ساتھ ابو الحیات اور عبد اللہ رسول کا نام لینا بھی ضروری ہے یہ لوگ ۱۹۳۳ء سے کسان تحریک میں شامل تھے اور شہید اللہ حبیب اللہ کے ساتھ انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے، ان سے بھی پہلے کسان تحریک میں شامل ہونے والوں میں شمس الہدیٰ اور عبد المومن کا نام بہت ہی نمایاں ہے، یہ لوگ انقلابی جدوجہد میں پیش پیش تھے ــــ شمس الہدیٰ ۱۹۲۳ء اور عبد المومن ۱۹۲۴ء میں یکے بعد دیگرے مزدور تحریک میں شامل ہوئے، اسی دور میں چٹکل مزدوروں کی تحریک چلائی گئی، اس تحریک میں حصہ لینے والے زیادہ تر مسلمان ہی تھے، سندھ میں جلال الدین نے کسان تحریک چلائی۔

کمیونسٹ پارٹی نے طلبہ کو بھی آزادی کی تحریک میں کھینچ لیا اور ان کی تنظیم بنائی ۱۹۳۷ء میں بنگال میں اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر ایک مسلمان نوجوان احمد دہلوی تھا، یو۔ پی میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر مسٹر انصار ہروانی تھے۔

مجاہدینِ آزادی کارواں در کارواں

اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سب سے پہلے کمیونسٹ پارٹی اور اس کے انقلاب ۱۹۱۷ء سے متاثر ہوا، کئی لوگ جو انگلینڈ حصولِ تعلیم کیلئے گئے اور وہاں انھوں نے کمیونزم اور سوشلزم کا مطالعہ کیا اور اس تحریک کے مضمرات کو سمجھا تو ہندوستان واپس آکر اسی نہج پر کام کرنا شروع کر دیا، کسانوں اور مزدوروں کی تنظیمیں بنائیں اور ان میں حرکتِ عمل پیدا کی ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر زیڈ اے احمد، بیگم ہاجرہ، سید سجاد ظہیر، اتر پردیش میں میاں افتخار الدین، فرید الحق انصاری، بیرسٹر ایٹ لا، پنجاب میں یوسف مہر علی بمبئی میں

سرگرمِ کار ہوگئے، ان تمام لوگوں نے اپنی سرگرمیوں کے سلسلہ میں وہ تمام اذیتیں برداشت کیں جو جنگِ آزادی کے ہر سپاہی کا مقدر بن چکی تھی۔

اتر پردیش کے محمود الظفر بہت ہی ذہین اور سیاسی سوجھ بوجھ کے لیڈر تھے۔ علی اشرف اور امجد علی بہترین آرگنائزر اور تنظیم کار تھے، دہلی میں محمد فاروق نے اپنی تنظیمی سرگرمیوں کو جاری رکھا اور آزادی کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا، آندھرا میں مخدوم محی الدین مانے ہوے لیڈر تھے، انھوں نے نظام شاہی کے خلاف زبردست تحریک چلائی اور جیل کی چہار دیواری میں انکی زندگی کے سنہرے دن گذرتے رہے مگر اسکی پروا نہیں کی۔

انقلاب پسند شاعروں کا بھی ایک شاندار گروہ تھا جنہوں نے اپنی شاعری سے تلوار کا کام لیا آتش نوائی اور شعلہ بیانی سے عوام کے سینوں میں جذبۂ آزادی کی آتش سیال بھر دی، بنگال میں غلام قدوس نے انقلابی شاعری سے بڑا کام لیا جنگِ آزادی کے رجز خواں اور مشہور انقلاب پسند شاعروں میں مجاز لکھنوی، علی سردار جعفری، نیاز حیدر، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، پرویز شاہدی، شورش کاشمیری، شفیق نقوی، منظر، جوش ملیح آبادی، علامہ انور صابری، ضیا ر الحسن، مرزا اشفاق بیگ، عمار تسنیم، بمبئی میں دولھا میاں، مرادآباد میں داؤد خاں، کامریڈ شاہد صدیق بخشی، لاہور میں احسان دانش شاعر مزدور یہ سب کے سب کاروانِ آزادی کے حدی خوانوں میں شامل تھے انھوں نے اپنے آتشیں نغموں سے ہزاروں لاکھوں دلوں میں انقلاب کی آگ دہکا دی، نوجوانوں میں جوش و جذبہ کی فضا بنائی، خود بھی جنگِ آزادی میں شریک رہے جیلوں کی ہوا کھائی، مگران کی آتش نوائی کا سلسلہ بند نہیں ہوا کاروانِ آزادی کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے رہے۔

آہنی عزم و ارادہ کے لوگ

محمد شاہد لکھنوی بمبئی میں ٹکسٹائل مزدور کی حیثیت سے کام کرتے تھے اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے بعد میں مزدور لیڈر ہوگئے، اسی کشاکش میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے، میر داد خاں عرف امتیاز پٹھان بمبئی میں کام کرتے تھے وہاں سے امریکہ پہونچ گئے، لالہ ہردیال اور مولوی برکت اللہ بھوپالی کی غدر پارٹی میں شامل ہوگئے ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس

آئے تو بمبئی، کانپور اور پنجاب میں اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں دوسری جنگِ عظیم کے دوران گرفتار ہو گئے، لاہور جیل سے ملتان جیل کے لئے جاتے ہوئے ریل کے ڈبے سے کود پڑے، کسی طرح بمبئی پہونچے اور امتیاز نام سے کام کرتے رہے، کسی غنڈے نے آپکو چھرا مار دیا اور یہ سیماب صفت انسان بندِ غلامی سے آزاد ہو گیا۔

امیر حیدر خان عرف فرنانڈیز عرف شنکر جنگِ آزادی کا ایک اور سورما تھا جس نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آزادی کی لڑائی کو جاری رکھا، امیر حیدر خاں پنجاب کا رہنے والا تھا، وہاں سے بمبئی گیا، پھر امریکہ پہونچا، ڈیٹ رائٹ میں میکنک بن کر کام کرتا رہا یہیں پر ایک کمیونسٹ کارکن شمس الہدیٰ سے جو کلکتہ کا رہنے والا تھا متاثر ہو کر کمیونسٹ ہو گیا ۱۹۲۶ء میں امریکہ سے ماسکو گیا کمیونسٹوں کی عالمگیر کمیونسٹ تحریک سے وابستہ رہا، وہاں سے ہندوستان آیا اور گرفتار ہوا اور اس پر میرٹھ سازش کیس چلایا گیا وہاں سے بھاگ کر گوا چلا گیا اور بھیس بدل کر فرنانڈیز کے فرضی نام سے کام کرتا رہا، یہاں بھی اس کی سیاسی سرگرمیوں نے چین سے رہنے نہیں دیا تو بھاگ کر مدراس چلا گیا اور شنکر کے فرضی نام سے میکنک بنا رہا، یہاں بھی مزدور تنظیم بنائی اس کی سیاسی سرگرمیاں زیادہ بڑھیں تو پولیس نے گرفتار کر لیا اور جیل میں ڈال دیا، ۱۹۳۸ء میں جیل سے رہا ہو کر بمبئی آیا اور مسلم مزدوروں کی تنظیم بنائی اور ان کے مسائل کو لے کر تحریک کو آگے بڑھایا تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلا گیا لیکن وہاں کمیونسٹ پارٹی خلاف قانون تھی اسلئے جیل بھیج دیا گیا، ایک عرصہ تک راولپنڈی جیل میں رہا اب خدا جانے زندہ ہے یا نہیں۔

ایسے ایسے جیالے مسلمان جوان تھے کہ آزادی کیلئے اپنی زندگیاں تج دیں اور انکو اس کا کوئی غم نہیں ہوا، مصائب کی بھٹیوں میں جلتے سلگتے رہے لیکن آزادی کی تلاش و جستجو میں کوئی کوتاہی اور سستی نہیں آنے دی۔

کچھ اور بہادرانِ صف شکن

کشمیر میں مسٹر صادق علی کمیونسٹ پارٹی سے متعلق تھے انھوں نے کشمیر کے مشہور لیڈر شیخ عبداللہ کے ساتھ جاگیردارانہ نظام کے خلاف جنگ میں بھرپور حصہ لیا ان پر چین سے ساز باز کا

بھی الزام لگایا گیا، آزادی کے بعد کشمیر کے وزیر بنائے گئے۔

اس طرح مزدور تحریک میں کام کرنے والے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ہے بالخصوص بنگال میں کسانوں اور مزدوروں کی تحریک مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں تھی، محمد یعقوب، محمد اسمٰعیل، محمد خیر علی مزدوروں میں خفیہ طور پر کام کرتے تھے، حاجی دانش علی، شجاعت علی، مجمدار، امداد اللہ کسان لیڈروں کی حیثیت سے مشہور تھے ان لوگوں نے بنگال، نواکھالی، کومیلہ کے کسانوں میں زبردست تحریک چلائی، اسی طرح محمد الیاس بھی مزدوروں کے ایک لیڈر کی حیثیت سے مانے جاتے تھے، ایک مسلمان نوجوان ضمیرالدین ۱۹۳۸ء میں کشتیاں میں مزدوروں کی تحریک کا روحِ رواں تھا، اس کو غنڈوں کی ٹولی نے قتل کر دیا، محمد یوسف گودی کے مزدوروں کا رہنما تھا ۱۹۴۲ء میں اسکی سرگرمیاں جب عروج پر تھیں تو اس نے اہم خدمات انجام دیں۔

سراج الدین انٹروگوما کا رہنے والا تھا، گودی میں کام کرنے والے مزدوروں میں کام کرتا تھا اور ان کی سیاسی رہنمائی کرتا تھا، بارلسیال میں ایک انقلابی تنظیم قائم کرنیوالوں میں احمد، الطاف علی، اور دلی نواز کے نام قابلِ ذکر ہیں، انھوں نے اس تنظیم کے ذریعہ ۳ راگست ۱۹۴۲ء میں زبردست تحریک چلائی دوسرے مقامات پر بھی مسلم نوجوان اپنی اپنی سیاسی تنظیمیں بناکر آزادی کی لڑائی لڑتے رہے، علی محمود بیر بھوم میں، علی محمد ڈھاکہ میں، ایوب علی، محمود الزماں، غلام حسین چاٹگام میں، مولوی صدیق الرحمن بڑا کشور گنج میں، سراج الحسن راجشاہی میں جنگِ آزادی کا صور پھونک رہے تھے کھلنا کے قادر حسین اور شیخ مطلوب، محمد حارث نے کمیونسٹ پارٹی کے سرخ جھنڈے کو لے کر آزادی کی راہ میں عظیم قربانیاں دیں ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے علاقوں میں قائدانہ رول ادا کیا اور جنگِ آزادی کے میدان میں سپاہیوں کی قیادت ورہنمائی کی، کلکتہ کے قدم رسول اور حلیم جونیر نے عبدالرزاق خاں کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی میں حصہ لیا، قدم رسول انتھک جد وجہد کرنے والے اور بہت پرجوش لیڈر تھے ۱۱ رفروری ۱۹۴۲ء کو راشد علی ڈے منانے کا پروگرام بنایا، اس سلسلہ میں فوجی سپاہیوں سے اس کا تصادم ہوگیا اور انکی گولیوں سے شہید ہوگیا۔

جنگِ آزادی کے نڈر سپاہی

عبدالحق ایک بڑے اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے ۱۹۴۲ء میں اسٹوڈنٹ لیڈر ہو گئے انھوں نے جیسور میں ۱۹۴۵ء میں کسانوں کی زبردست تحریک چلائی پولیس مدتوں انکی تلاش میں رہی مگر وہ انڈر گراونڈ ہو گئے بعد میں گرفتار ہو کر جیل گئے، اب وہ بنگلہ دیش میں ہیں، جیسور میں ایک اور لیڈر پیدا ہوا اس کا نام سید نوشیر علی ہے کسان تحریک کی رہنمائی کرتا رہا، کسانوں میں بہت مقبول تھا، معروف حسین کی قومی خدمات کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے، برطانوی حکومت کی سختیوں اور مسلم لیگ کے ورغلانے کے باوجود وہ ہندو مسلم ایکتا کے لئے جد و جہد کرتا رہا اور کسی خطرہ اور لالچ کی پرواکئے بغیر اس نے اپنے سامنے حصولِ آزادی کا جو نصب العین اور طریقۂ کار رکھا تھا اس سے سرِمو انحراف نہیں کیا۔

بہادر خواتین

جنگِ آزادی میں حصہ لینے والی بہادر خواتین میں ماجدہ بیگم اور حسینی بیگم کے نام جلی حروف میں لکھے جائیں گے، خلوص اور سچائی سے کام کرنیوالی یہ خواتین تھیں، حسینی بیگم ایک جاروب کش کی لڑکی تھی، اپنے حقوق اور سوشل انصاف کیلئے اس نے لڑائی کو بہت تیز کیا جس کے نتیجہ میں اسے جیل جانا پڑا، قید کی مدت گذار کر واپس آئی تو اس کی سرگرمیاں اور بڑھ گئیں، پولیس نے دوبارہ اس کو جیل بھیجدیا، اس نے پولیس مظالم کے خلاف آواز بلند کی اور پوری جرأت وہمت کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہی، مسلم لیگ کے اندازِ فکر اور تنگ نظری کی سخت دشمن تھی اور مسلم لیگ کے خلاف برابر جد وجہد کرتی رہی اور فرقہ وارانہ منافرت کا اس نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

مثالی مسلمان نوجوان

کلکتہ کے ٹراموے مزدوروں کی تنظیم میں بھی کمیونسٹ پارٹی کے ورکروں نے بھرپور حصہ لیا، ان میں بڑی تعداد مسلمان ورکروں کی تھی، ۱۹۴۶ء میں بحری بیڑے میں کام کرنے والوں نے بمبئی اور کراچی میں انقلاب کا نعرہ بلند کیا، بمبئی کے بحری بیڑے میں کرنل خان کی سرگرمیاں تیز تر تھیں، انھوں نے گودی کی بغاوت میں اہم رول ادا کیا انھوں نے سارے ہندوستان سے اپیل کی کہ بلاامتیازِ مذہب و قوم ہماری مدد کی جائے، کراچی کی بحری بغاوت کا یہ واقعہ ناقابلِ فراموش ہے

کہ ایک مسلمان نوجوان طالب علم انور حسین لاہوری جہاز کے ڈیک پر ہاتھ میں سرخ جھنڈا لے کر چڑھ گیا اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کیا، پولیس نے نشانہ لگا کر انور حسین کو وہیں گولی ماری اور جھنڈا ہاتھ میں لیے ہوئے وہیں شہید ہو گیا۔

بنگال کے انقلابیوں میں فضلِ حق، تمیز الدین خان، لعل میاں (فرید پور) ہیں جو ۱۹۳۰ء میں سیاسی جدوجہد کی وجہ سے جیل گئے اور تحریکِ آزادی کی رہنمائی کرتے رہے اور ہمیشہ ایک بہادر اور نڈر کمانڈر اور سپہ سالار بن کر رہے۔

آزادی کے دیوانے

ضلع بردوان کے تین لیڈر جنگِ آزادی کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ابوالقاسم، حمایت علی اور ابوالحیات ان سب لوگوں نے جیل اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور پولیس کے مظالم برابر سہتے رہے مگر ان کے پاؤں میں کبھی جنبش نہیں آئی۔

بنگال کے انقلابیوں میں اور بھی بہت سے نام ملتے ہیں جنہوں نے اپنے مقام پر اہم کردار انجام دیے، ان میں سب سے نمایاں نام مولانا عبدالحمید بھاشانی کا ہے جو اب بنگلہ دیش میں ہیں، دوسرے لوگوں میں مولانا طیب علی، حامد میاں، غیاث الدین پٹھان، میمن سنگھ اور جیسور کے مشہور مقرر جلال الدین ہاشمی، پروفیسر ہمایوں کبیر جو آزادی کے بعد مرکزی گورنمنٹ میں شامل رہے، ابوحسین سردار، ابوالحسین احمد، رضاء الکریم عبدالکریم (ڈھاکہ) قاضی عبدالودود کے نام سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

اس دور کے اہم اور بڑے رہنماؤں میں پروفیسر مجیب (دہلی) سید محمود (بہار) شفیع داؤدی (بہار) رفیع احمد قدوائی (بارہ بنکی) حافظ ابراہیم (بجنور) مظہر الحق بیرسٹر (بہار) انصار ہروانی (یوپی) فخر الدین علی احمد (آسام) جو بعد میں صدرِ جمہوریہ ہند ہوئے، ڈاکٹر ذاکر حسین صدرِ جمہوریہ ہند کے نام ہندوستان کی تاریخ میں چاند اور سورج کی طرح روشن اور تابناک ہیں اور رہیں گے۔

کاکوری میں سرکاری خزانے پر حملہ

ہم نے ابتک ان مسلمانوں کا ذکر کیا جو سرخ پرچم کے سایہ میں آزادی کی راہوں میں

آگے بڑھے تھے اسی ضمن میں کچھ غیر کمیونسٹ رہنماؤں، اہم اور ہندوستان گیر شہرت کے مالک لیڈروں کے بھی نام آگئے، اس ذیل میں بہت سے غیر اہم علاقوں میں مجاہدینِ آزادی میں سے کچھ منچلے نوجوانوں نے ایسے اقدامات کیے جو ان کے جذبۂ آزادی کی قدر و قیمت کو بتاتے ہیں، اور دل انکی عزت کرنے پر مجبور ہوتا ہے، انھیں واقعات میں سے ایک واقعہ اس مقدمہ کے سلسلے کا ہے جو ,, کاکوری ڈکیتی کیس ،، کے مکروہ نام سے حکومت نے چلایا تھا، یہ گھناؤنا نام اور عنوان پولیس نے اس لیے استعمال کیا کہ اس سے ان نوجوانوں کی وطنی خدمت کی قدر و قیمت کو کم کیا جائے۔

یہ کیس ۱۹۲۵ء میں ,, کاکوری ڈکیتی کیس ،، کے نام سے چلایا گیا، یہ مقدمہ ایک مسلمان نوجوان اشفاق اللہ اور اس کے ساتھیوں چندر شیکھر، بھگت سنگھ، اور باگیشور دت پر چلایا گیا، اس پارٹی کا روحِ رواں اشفاق اللہ خان تھا جو شاہجہاں پور کا رہنے والا تھا، یہ تمام نوجوان تشدد پسند انقلابی پارٹی سے وابستہ تھے، اشفاق اللہ نے اپنے ایک درجن ساتھیوں کو لے کر کاکوری کے قریب ایک ٹرین میں سرکاری خزانے پر حملہ کیا اور فرار ہوگئے، پولیس نے بڑی سرگرمی سے تفتیش کی اور بالآخر اشفاق اللہ اور اس کے تمام ساتھی پولیس کے ہاتھ آگئے، لکھنؤ کی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا، عدالت نے اشفاق اللہ کو پھانسی کا حکم دیا وہ اس وقت فیض آباد جیل میں تھا اس کو وہیں جیل میں پھانسی دی گئی۔

اشفاق اللہ نے کس بہادری سے جان دی اس کی بڑی قدر و قیمت ہے، آزادیٔ وطن کی کتنی تڑپ اس کے سینے میں تھی یہ اس کے اس بیان کے ایک ایک حرف سے ٹپکتی ہے جو اس نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے سامنے اس وقت دیا تھا جب اس کی پھانسی کی تاریخ پر وہاں جمع ہوگئے تھے، اشفاق اللہ نے پھانسی کے تختے پر کھڑے ہوکر انکو مخاطب کرکے کہا:

,, اگر مجھے آخری رسم ادا کرنے کی اجازت باعزت طور پر نہیں دی گئی تو اس موقع کا تقدس مجروح ہو جائے گا، میں آج عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہوں اسلئے کہ مادرِ وطن کی آزادی کیلئے پھانسی کے تختہ پر چڑھایا جارہا ہوں

تمہیں فخر کرنا چاہیے اور خوش ہونا چاہیئے کہ تمہارا ایک عزیز ایک مقدس فرض کو پورا کرنے کے سلسلہ میں اپنی جان دے رہا ہے ہندو قوم کے افراد کنھئی لال اور خودی رام نے جان دی، مجھے بحیثیت مسلمان ہونے کے اس راستہ میں شہادت نصیب ہو رہی ہے یہ تو خوشی کی بات ہے۔"

پھانسی کے وقت تختہ دار پر چڑھتے ہوئے قرآنِ پاک کی آیتیں اس کی زبان پر تھیں اور پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں لگایا جا رہا تھا۔

شولاپور میں سیاسی سرگرمیاں

۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کی گرفتاری پر شولاپور (مہاراشٹر) کے مزدوروں نے بھی گرفتاری کے خلاف زبردست احتجاج کیا، یہ احتجاج بعد میں تشدد کی شکل اختیار کر گیا، نوجوانوں نے آزادی کے جوش میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھا اور ان کی جرأتِ رندانہ اور نعرۂ مستانہ رنگ لایا، کئی مزدور لیڈر گرفتار کر لئے گئے اور ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا، ان بہادر لیڈروں میں دو مسلمان جوان عبدالرشید اور قربان حسین بھی تھے، دونوں کو بڑودہ جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا، دونوں نے مادرِ وطن کی آزادی پر اپنی جانیں دیکر مسلمان قوم کے بازو پر فخر کا ایک اور ستارہ بڑھا دیا، اور جنگِ آزادی کی تاریخ میں خون کی سرخی سے اپنا کارنامہ تحریر کر گئے۔

جنوبی ہند میں جنگِ آزادی

جنوبی ہند میں تاملناڈو نیشنلسٹ مسلمانوں کا گہوارہ رہا ہے، وہاں کے مشہور انقلابیوں میں عبدالرحیم کا نام سرِ فہرست ہے، یہ جری اور بہادر لیڈر مشہور بہادر بادشاہ سلطان ٹیپو کے خاندان سے تھے، اپنی سیاسی اور انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں پانچ سال تک مسلسل جیل میں رہے، ان کے بیٹے پروفیسر عبدالعلیم نے نوجوانوں کی قیادت کی اور جدوجہدِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا جسکے نتیجہ میں پولیس کے مظالم برداشت کیے اور مدتوں جیل میں حکومت کی مہمانی کی عزت حاصل کی۔

ویلور میں دی، ایم عبداللہ بھی تاملناڈو کے سیاسی لیڈروں میں اپنا ایک بلند

مقام رکھتے تھے، بار بار جیل جاتے رہے اور پولیس کی سختیاں برداشت کرتے رہے مگر ان کے پائے ثبات میں کبھی ہلکی سی بھی لغزش نہیں آئی بلکہ ع بڑھتا ہے اور ذوقِ گناہ ہر جفا کے بعد انکی سیاسی سرگرمیوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

ڈنڈیگل میں عبدالستار، شریف تجوری برادران، مسٹر ایس اے رحیم نے جنگِ آزادی میں حصہ لیا اور جیل جاتے رہے، ای۔اے ایم اللہ پچھی مدراس کے رہنے والے تھے جدوجہدِ آزادی کے سلسلہ میں قید و بند کی مصیبت اٹھاتے رہے، کیرالہ میں عبدالرحمٰن کا نام بہت نمایاں ہے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، انھوں نے آزادی کی راہ میں بیش از بیش قربانیاں دیں بلکہ اپنی پوری زندگی آزادی کی راہ میں تج دی۔

پشاور میں سول نافرمانی

۱۹۳۰ء میں جب پورے ملک میں سول نافرمانی اور ستیہ گرہ کی دوبارہ ایک زبردست لہر چل پڑی تھی اور ہندوستان کے کونے کونے میں عدمِ تشدد کی اس جنگ میں شریک ہونے والوں نے جس جرأت و بہادری سے اپنی جانیں دیکر بتا دیا کہ ہم اپنے وطن کی آزادی کو اپنی جانوں سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں اور جانوں کی قربانیاں دے کر اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کو غلامی کی زہر ملی فضا میں سانس لینے سے بچا سکیں تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے پشاور کے قصہ خوانی بازار میں ان گنت غیور پٹھانوں نے اپنی جانیں دے کر یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان آزادی کی راہ میں کبھی پیچھے چلنے والوں میں نہیں رہا، اس کا قدم ہمیشہ ساتھ چلنے والوں سے آگے رہا، جنگِ آزادی کی راہ میں پسینہ بہانے والوں کو غیرت دلائی اور للکارا کہ جہاں خون بہانے کی ضرورت پڑ جائے تو وہاں صرف پسینہ بہانا کام نہیں آتا ہے۔

قصہ خوانی بازار پشاور

۱۹۳۰ء کی نان کوآپریشن کی تحریکِ عدمِ تشدد جس حیرتناک اور جرأتمندانہ مظاہرہ کے ساتھ پشاور کے بہادروں نے چلائی وہ جنگِ آزادی کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے، قومی آواز لکھنؤ کی ۲۴ر اپریل ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں جناب ملک کلدیپ کپور کا ایک مفصل مضمون پشاور کے قصہ خوانی بازار کے واقعہ کے سلسلہ میں شائع ہوا ہے، موصوف ان دنوں خود

پشاور میں طالب علم تھے اور بہادر پٹھانوں کی جرأت و بہادری کے چشم دید شاہد ہیں اسلئے میں انھیں کے الفاظ مستعار لیتا ہوں آپ انھیں کی زبانی اس داستان کو سنیں :

۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کا دن صوبہ سرحد، پختونستان کی انقلابی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے جب پختونوں نے مجاہدانہ بانکپن سے آزادی کا نعرہ لگایا، جسکے بدلے میں اپنے کھلے ہوئے سینوں پر برطانوی فوج کی گولیاں کھائیں۔

"سونگیری گران" میں کانگریس کا دفتر تھا، یہیں سے تحریک سول نافرمانی کا آغاز ہوا، دفتر کے سامنے کی سڑک مجاہدینِ آزادی کے خون سے لالہ زار بن گئی، جلوس دفتر سے نکل کر قصہ خوانی بازار کی طرف بڑھا "ڈھکی نعلبندی" کے قریب گورا فوج کے سپاہی بندوقیں تانے ہوئے جلوس کے استقبال میں کھڑے تھے، بے پناہ ہجوم، ترنگا جھنڈا لہراتا، انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگاتا ہوا آگے بڑھا، فوجیوں نے سیدھا نشانہ لیا، لاشوں پر لاشیں گرنے لگیں، بہنوں اور ماؤں کے سہارے لوٹ گئے، بچے یتیم ہوگئے، اور عورتیں بیوہ، بہادر پٹھانوں نے کئی سو کی تعداد میں جامِ شہادت پی لیا، مگر ہجوم ڈٹا رہا، کسی نے بھی قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔

کانگریس کمیٹی نے فیصلہ کیا تھا کہ شراب خانوں پر پکٹنگ کی جائے بدیشی مال کے بائیکاٹ کی مہم چلائی جائے اور نمک بنایا جائے، ان کاموں کیلئے ایک وار کونسل بنائی گئی تھی، اس کے صدر آغالال بادشاہ، مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، اللہ بخش برقی اور غلام ربانی سیٹھی اس کے خاص رکن تھے حکومت کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے گرفتاریاں شروع کیں ۲۲ / ۲۳ اپریل کی درمیانی رات میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، اللہ بخش برقی اور غلام ربانی سیٹھی گرفتار کرلئے گئے، پولیس انھیں کابل تھانے لے جارہی تھی، ہجوم نے گاڑی کے ٹائر کاٹ دیئے، پھر قیدیوں کو پیدل

تھانے لے گئے، قصہ خوانی بازار میں اس وقت تک بہت بڑا مجمع ہوچکا تھا اور انقلاب زندہ باد کا فلک شگاف نعرہ لگایا جارہا تھا، انگریز ڈپٹی کمشنر نے طیش میں آکر فوجی ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دیدی، فوراً بکتر بند گاڑیاں اور مشین گنیں دندناتی ہوئی کابلی دروازے سے اندر آگئیں مجاہدوں نے بازوؤں میں بازو ڈال کر ایک دیوار سی کھڑی کردی فوجی گاڑیاں ان بہادروں کے اوپر چلادی گئیں، سارے جوانوں کی لاشیں ایک ساتھ سڑک پر پس کر رہ گئیں، کچھ جیالے جوانوں نے پولیس گاڑی کی پٹرول ٹنکی میں آگ لگادی، آگ لگانے والے نوجوان تو وہیں شہید ہوگئے، مگر اس آگ میں چار انگریز بھی بھسم ہوکر رہ گئے، ایک فوجی افسر کا کلہاڑی سے کام تمام کردیا، اس کے بعد فوجیوں نے اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کردیں، یہ سلسلہ کئی گھنٹوں تک جاری رہا اور کچھ کم و بیش ایک ہزار لاشیں اور محتاط اندازے کے مطابق تقریباً سات سو بہادر پٹھان قصہ خوانی بازار میں شہید کردیئے گئے اور اپنے خون سے ہندوستان کی آزادی کا فرمان لکھ گئے۔

قصہ خوانی بازار سے، ہجوم یادگار چوک کی طرف بڑھا، یہاں گورے فوجی مکانوں کی چھتوں پر، مکان کے برآمدوں اور سائبانوں میں بندوق کی نالیں سیدھی کئے ہوئے پہلے سے موجود تھے، جب ہجوم یہاں پہونچا تو گڑھوال فوج نے گولی چلانے سے انکار کردیا، گورا فوج کی ہمت چھوٹ گئی اور اس نے مورچہ چھوڑدیا اور جلوس نعرے لگاتا ہوا آگے گذر گیا، قصہ خوانی بازار اور یادگار چوک کا علاقہ پولیس اور فوج سے خالی ہوگیا، تھانے اور پولیس چوکیاں بند ہوگئیں، پولیس کا پہرہ اٹھا لیا گیا، پھر شہر میں دن بھر عوامی حکومت رہی، کہیں کوئی پولیس نظر نہیں آئی، جیسے پشاور آزاد ہوگیا اور انگریز صوبہ سرحد سے رخصت ہوگیا۔

۲۳ راپریل ہی کی شب میں شہیدوں کی یادگار بنادی گئی تھی اس کے بنانے کا فخر عاشق حسین خاں فرنٹ سرجنٹ کو حاصل تھا، دوسرے دن حکومت نے اس کو توڑ پھوڑ دیا، چند دنوں بعد پھر ایک سرخ یادگار بن کر تیار ہو گئی یہاں ہر سال پھولوں کے ہار چڑھائے جاتے ہیں، چراغ جلائے جاتے ہیں اور آزادی کا ترانہ گایا جاتا ہے اور یہ یادگار ۱۹۴۷ء تک مجاہدوں کے دلوں میں آزادی کا جوش وجذبہ اور ترنگ پیدا کرنے کا سب سے موثر مقام تھا اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک ان سترہ برسوں میں آزادی کی ہر تحریک کی ابتدا اسی یادگار اور مجاہدینِ آزادی کے خون سے سیرا زمین سے ہی ہوتی تھی ہر سال یہاں ایک بڑا میلہ سا لگ جاتا ہے اور ہر طرف سے یہ نغمہ گونجتا سنائی دیتا ہے۔

پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر

سیاسی پس منظر

ہم نے اس باب میں مختلف علاقوں میں مسلمانوں نے جنگِ آزادی کی راہ میں جو قربانیاں دی ہیں اور جن لوگوں نے دی ہیں ان کی نشاندہی کی کوشش کی ہے لیکن ضرورت ہے کہ گیارہ بارہ سالوں میں ملکی سطح پر سیاسی حالات کیا تھے؟ اس کی وضاحت کردی جائے، اور بتایا جائے کہ مرکزی قیادت کن حالات سے دوچار تھی، حکومت ہندوستان کے بارے میں کیا پالیسی رکھتی تھی! کیا وہ ہندوستان میں ہونے والی تیز تر سیاسی سرگرمیوں کی طرف سے آنکھیں بند کئے پڑی رہی یا اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی؟ بغیر اس پس منظر کے سمجھے ہوئے مسلمانوں کی قربانیوں کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا مختصر طور پر ہم آپ کو یہ داستان سناتے ہیں۔

ملک میں سول نافرمانی، ترکِ تعاون، ترکِ موالات اور ستیہ گرہ عدمِ تشدد کے اصولوں پر ہو رہی تھی لیکن بیشتر مقامات پر حکومت خود ان تحریکوں کو تشدد کی راہ پر ڈال دیتی تھی اس کا ردِعمل انگریزوں کے دل ودماغ پر پریشانی کا باعث تھا، لندن پارلیمنٹ اور قصرِ بکنگھم کے خلوتخانوں میں ان حالات کو تشویش کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا تھا اور

اس آگ پر پانی چھڑکنے کی حکومت تدبیریں کرتی رہتی تھی ، ہندوستان کے بپھرے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کیلئے حکومت نے اعلان کیا کہ مسٹر سائمن کو ہندوستان بھیجا جارہا ہے وہ ملک کے حالات کا جائزہ لے کر جو اصلاحات تجویز کریں گے ان پر ہماری حکومت عمل کریگی سائمن کمیشن کے آنے سے قبل ہندوستان کے اخباروں میں سائمن کمیشن پر اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے اظہارِ خیال کیا جانے لگا تھا، مسلمانوں کی ایک جماعت جمعیۃ علماء نے سائمن کمیشن کی آمد سے کچھ دنوں پیشتر ستمبر ۱۹۲۷ء میں اپنے اجلاسِ پشاور میں اپنا نقطۂ نگاہ ملک کے سامنے پیش کر دیا کہ سائمن کمیشن آزادی کا تحفہ لے کر نہیں آرہا ہے، آزادی بھیک میں نہیں ملتی ہے بلکہ عزم و عمل اور زورِ بازو سے حاصل کی جاتی ہے ، اگر ہندوستان اپنا زورِ بازو استعمال نہیں کرے گا تو آزادی کو حاصل نہیں کر سکے گا ، اسلئے سائمن کمیشن کی طرف پُرامید نگاہوں سے دیکھنا ہماری بہت بڑی سیاسی غلطی ہوگی اسلئے ہمارا فیصلہ ہے کہ سائمن کمیشن کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے اور اس سے کوئی گفتگو نہ کی جائے ۔

اس کے بعد ہندوستان کی مختلف سیاسی پارٹیوں نے بھی کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور اس کا اخباروں میں اعلان کر دیا ، اس کے خلاف مظاہرے کئے ، مظاہرہ کرنے والوں پر پولیس نے ڈنڈے برسائے سیاسی کارکنوں کے مجمع پر فوجیوں نے گھوڑے دوڑائے مگر بائیکاٹ کامیاب رہا اور سائمن کمیشن بے نیلِ مرام ناکامی کی سیاہی چہرے پر ملے ہوئے انگلینڈ واپس چلا گیا ۔

نہرو رپورٹ کا قضیہ

اسی دوران وزیر اعظم برطانیہ نے لندن پارلیمنٹ میں اعلان کیا بلکہ چیلنج کیا کہ اگر ہندوستان آزادی کا مطالبہ کرتا ہے تو اس کو چاہیئے کہ وہ ایک دستور مرتب کر کے پیش کرے ہم اس دستور کو منظور کر کے انکی مرضی کے مطابق حکومت بنا لینے کا موقعہ فراہم کریں گے ۔

اس چیلنج کے جواب میں موتی لال نہرو کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بنائی گئی تاکہ ایک دستور مرتب کرے اور اس کو ملک کے سامنے پیش کر کے استصواب کر لیا جائے اور اسکے بعد حکومت کو پیش کر دیا جائے ، یہ دستور مرتب کیا گیا لیکن اس کمیٹی میں تنگ نظر افراد کی

تنگ نظری نے زہر بو دیے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی فرقے نے دستور کی تائید نہیں کی اور نہ اس کو تسلیم کیا، تاریخ میں اسی دستور کے مسودہ کو نہرو رپورٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، لکھنؤ، کلکتہ اور بعض دوسرے مقامات پر آل پارٹیز کنونشن بلائے گئے تاکہ اس دستور پر اتفاق رائے ہوجائے مگر ہندو مسلم خلیج بڑھتی رہی، نہرو رپورٹ کی حمایت کرنے والوں سے اس کی نفی اور اختلاف کرنے والوں کی تعداد بڑھ گئی آخر کار کانگریس نے تنگ آکر اپنے لاہور کے اجلاس کے موقعہ پر اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور تین سال کے قریب اس منحوس رپورٹ کی وجہ سے انتشار رہا، اور حکومت سے محاذ آرائی بند رہی۔

ڈانڈی مارچ

سنہ ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے اپنی ستیہ گرہ کا دوبارہ آغاز نمک سازی سے کیا، حکومت نے اس وقت نمک سازی پر پابندیاں عائد کر دی تھیں اس حکم کی خلاف ورزی کو ستیہ گرہ کی بنیاد بنایا گیا، گاندھی جی نے بمبئی کے ایک مقام ڈانڈی میں نمک بنانے کی تحریک کی، کانگریس کے ورکر ڈانڈی کی طرف مارچ کرتے، نمک بناتے اور گرفتار ہوکر جیل چلے جاتے، جس کے بارے میں یہ علم ہوجاتا کہ یہ ڈانڈی جارہا ہے اس کو وہیں گرفتار کر لیا جاتا، مسلمانوں کے ایک جری اور بہادر لیڈر مولانا حفظ الرحمٰن ڈابھیل سے چل کر ڈانڈی پہونچے اور گاندھی جی کے ساتھ نمک سازی کی ستیہ گرہ میں حصہ لیا اور گرفتار ہوئے۔

پسِ دیوارِ زنداں

مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت جمعیۃ علماء کا اخبار الجمعیۃ جو دہلی سے نکلتا تھا اور مسلمانوں کو جنگِ آزادی کی دعوت دینے اور ان میں جذبۂ سرفروشی پیدا کرنے میں اہم رول ادا کر رہا تھا حکومت نے اسکو بہت سے آرٹیکلوں کو بنیاد بنا کر ضمانت ضبط کر لی، مئی سنہ ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علماء کا سالانہ اجلاس مرادآباد میں ہوا اور ترکِ موالات اور عدمِ تعاون کی تجویز کی تجدید کی گئی، اس اجلاس کے تیسرے ہی ہفتہ بعد مسلمانوں کے ایک عظیم رہنما مولانا حفظ الرحمٰن کو گرفتار کرکے حکومت نے جیل بھیجدیا، اس سے پہلے سنہ ۱۹۲۹ء میں سول نافرمانی کے سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید فخر الدین احمد شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ مرادآباد "علماء ہند کا شاندار ماضی" کے

مصنف مولانا سید محمد میاں اور یوپی جمعیۃ علماء کے رہنما مولانا بشیر احمد بھٹہ کو گرفتار کر کے میرٹھ کی جیل میں حکومت کی مہمانی کی عزت حاصل ہو چکی تھی، مسلمانوں کی یہ جماعت انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ حکومت کی نگاہ میں تمام جرموں میں ملوث تھی اس لئے اس کے مرکزی جمعیۃ اور صوبائی جمعیۃ کے رہنماؤں میں سے اکثر اس سول نافرمانی میں سلاخوں کے پیچھے بند کئے جا چکے تھے،

مارچ ۱۹۳۰ء میں گاندھی اردن پیکٹ ہوا، اس پیکٹ کے بعد سول نافرمانی اور ستیہ گرہ کا پروگرام عارضی طور پر ملتوی کر دیا گیا اور تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے لیکن مولانا حفظ الرحمٰن کو نہیں چھوڑا گیا، ۱۹۳۰ء کے آخر میں مجلسِ احرار کے مشہور آتش بیان خطیب رہنما مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔

سول نافرمانی کا دوسرا مرحلہ

۱۹۳۰ء میں گاندھی اردن پیکٹ کے بعد عارضی طور پر سول نافرمانی کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا لیکن حالات نے پھر پلٹا کھایا اور صورت حال بدل گئی، حکومت معاہدہ کی پابند نہ رہ سکی، اس لئے ۱۹۳۲ء میں کانگریس اور جمعیۃ علماء دونوں نے ستیہ گرہ اور سول نافرمانی کا آغاز کر دیا، جمعیۃ کی طرف سے سول نافرمانی کا اعلان ہوتے ہی اس کے اکابر رہنما گرفتار کر لئے گئے اور جیلوں میں بھیج دیئے گئے، سول نافرمانی کی تحریک اپنے ساتھ اب کی بار بہت سی ہولناکیاں لیکر آئی، اب جو شخص گرفتار کیا جاتا تو اس کو جیل کی سزا کے ساتھ ساتھ اس کی جائداد بھی ضبط کر لی جاتی تھی، یا ان پر بڑے بڑے جرمانے عائد کئے جاتے اور اس جرمانے کی وصولیابی کے لئے سول نافرمانی کرنے والے رضا کاروں کی جائدادوں کو حکومت نیلام کرا دیتی تھی اور رضا کار کے اہل و عیال نانِ شبینہ کے محتاج ہو جاتے تھے۔

ڈکٹیٹر شپ قائم کی گئی

۱۹۳۲ء میں جب سول نافرمانی کی تحریک شروع کی گئی تو جماعتی نظام کو تحلیل کر کے پارٹیوں نے صدر و سکریٹری کی جگہ پر اپنا ڈکٹیٹر منتخب کر لیا تھا مسلمانوں کی جماعت جمعیۃ علماء نے بھی یہی طریقۂ کار اختیار کیا، اس نے اپنے دس پندرہ بڑے رہنماؤں کو نمبر وار ڈکٹیٹر چن لیا تھا اور

اسکی فہرست مرتب کرلی تھی تاکہ ایک ڈکیٹیٹر جب گرفتار ہوجائے تو اس کے بعد دوسرا ڈکیٹیٹر فوراً نظام کو اپنے ہاتھ میں لے لے، کانگریس نے بھی جماعتی نظام کو توڑ کر ایک وار کونسل بنائی تھی، یہی جمعیۃ علمار نے بھی کیا تھا، کانگریس کے لوگ اپنے مرکز کو جنگی کونسل کہتے تھے اور جمعیۃ علمار والے ادارۂ حربیہ کہتے تھے، جمعیۃ علمار کے رہنما بھیس بدل کر ملک میں گشت کرکے رضا کاروں کی بھرتی کرتے اور ان سے عہدنامے پر دستخط کراتے اور مقررہ تاریخ پر دہلی بھیجتے رہتے تاکہ حسبِ اعلان رضا کار سڑکوں پر آکر سول نافرمانی کا مظاہرہ کرتے رہیں، ہفتہ میں دو دن رضا کاروں کے جتھے سڑکوں پر نکلتے تھے، انقلاب زندہ باد، جمعیۃ علمار زندہ باد، کانگریس زندہ باد کے نعرے لگاتے اور خلافِ قانون جماعت کا جھنڈا بلند کرتے، چونکہ ہمہ وقت ۱۴۴ نافذ رہتی تھی اسلئے پولیس ان رضا کاروں کو گرفتار کرتی اور جیل بھیجدیتی تھی، یہ سارا پروگرام اور نظام مسلمان انڈر گراؤنڈ ہوکر چلاتے تھے، کیونکہ پولیس کو ذرا بھی بھنک مل جاتی تو پولیس کی دوشش دفتر پر ٹوٹ پڑتی اور جو کچھ ملتا سب کچھ اٹھالے جاتی۔

مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاری رضا کاروں کے نظام کے ذمہ دار تھے اور مولانا حفظ الرحمٰن کی ذمہ داری تھی کہ اضلاع میں جاکر رضا کاروں کو تیار کرکے دہلی روانہ کریں، اس طرح مولانا موصوف رضا کاروں کے کمانڈر اور مولانا بہاری کمانڈر انچیف تھے، جمعیۃ علمار کے ایک ڈکیٹیٹر مولانا سید محمد میاں بھی تھے جو مراد آباد سے دہلی جاکر گرفتار ہوئے، مولانا منت اللہ رحمانی چند دن پہلے گرفتار ہوچکے تھے ان علمار فضلا سے جیلوں میں مشقت بھی لی جاتی تھی، مولانا محمد میاں نحیف الجثہ اور کمزور شخص تھے مگر آپ کو چکی پیسنے کی مشقت دی گئی تھی۔

مثالی جذبۂ آزادی

مولانا حفظ الرحمٰن جمعیۃ علمار کے رہنما تھے مگر کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے بھی ممبر تھے ان کو کانگریس کے اجلاس میں شرکت کرنی تھی اور اس وقت کانگریس خلافِ قانون جماعت قرار دی جاچکی تھی پھر بھی اس نے اپنے سالانہ اجلاس کا اعلان کردیا اور شارعِ عام کو جلسہ گاہ قرار دیا اور اسکے

لئے گھنٹہ گھر کا مردم خیز بازار تجویز کیا، چند ہی قدم پر کوتوالی ہے، پولیس اور سی آئی ڈی کو چوکنا کر دیا گیا کہ جو کانگریسی جہاں ملے وہیں گرفتار کر لیا جائے اور کسی کو بھی مقررہ جلسہ گاہ تک پہونچنے نہ دیا جائے، دہلی کے باہر سے آنے والوں کے لئے ریلوے پلیٹ فارم پر سی آئی ڈی کی ڈیوٹی لگا دی گئی، مولانا سیوہاروی کو دہلی جانا ضروری تھا مولانا نے اپنی وضع بدلی کھدر کا لباس گٹھری میں باندھا، لٹھے کا پاجامہ، ولایتی کپڑے کی شیروانی بدن پر، جے پوری صافہ زیب سر، ایک عمدہ اور قیمتی چھڑی ہاتھوں میں لی، کسی ریاست کے نواب کی طرح دہلی اسٹیشن پر اُترے، پولیس دیکھ رہی ہے کہ ایک مولوی نما جوان نوابی شان سے اس کے سامنے سے گذر رہا ہے، پولیس کو شبہ بھی نہ ہو سکا کہ یہ مولانا حفظ الرحمٰن ہیں جو ہمیشہ موٹے کھدر میں ملبوس رہتے ہیں اس طرح پولیس کی آنکھ میں دھول جھونک کر گھنٹہ گھر پہونچ گئے۔

پولیس دیکھتی رہ گئی

کانگریس کا یہ اجلاس حکومت اور کانگریس دونوں کے وقار کا سوال بن کر رہ گیا حکومت نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ کسی قیمت پر جلسہ نہیں ہونے دے گی، دہلی کی گلی کوچوں میں سی آئی ڈی بھری ہوئی تھی مگر کوئی گرفتار نہیں ہو رہا ہے، نہ کہیں کوئی کانگریسی نظر آرہا ہے اجلاس کے مقررہ وقت میں چند منٹ رہ گئے تھے، گھنٹہ گھر کے پاس نہ میز نہ کرسی نہ فرش فروش نہ رضاکار نہ والنٹیر نہ کوئی ممبر، سی آئی ڈی مطمئن ہو گئی پالا مار لیا اور کانگریس کو شکستِ فاش دے دی گئی، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اسی پولیس اور سی آئی ڈی کے سامنے آس پاس کی گلیوں سے کوچوں سے آئی، سی، سی کے ممبروں کی آمد شروع ہو گئی اور ایک جھپکے میں ان کی اتنی بڑی تعداد آ گئی کہ باوردی اور بے وردی پولیس جو وہاں موجود تھی اپنی تعداد کو ناکافی سمجھ کر مزید پولیس بلانے کے لئے کوتوالی کی طرف بھاگی، آل انڈیا کانگریس کے جو ممبران دفعتہً یہاں برآمد ہو گئے تھے انھوں نے ٹھیک گھنٹہ گھر کے نیچے اپنا اجلاس شروع کر دیا، انقلاب زندہ باد، ہندوستان زندہ باد، کانگریس زندہ باد کے نعرے لگائے گئے، یہ سب نعرے خلافِ قانون تھے،

نعرے اتنی بلند آوازسے لگائے گئے کہ پورا بازار گونج گیا، پھر صدر نے حلفنامۂ آزادی پڑھا آزادی کی تجویز پیش کی جو بالاتفاق پاس ہوئی اور جلسہ بخیروخوبی ختم ہوگیا ابھی پولیس پہنچنے بھی نہیں پائی تھی کہ یارانِ تیزگام نے منزل کو جالیا، جب پولیس جلسہ گاہ تک پہونچی تو میدان خالی تھا، کوئی ممبر ہاتھ نہ آسکا، حکومت بازی ہار گئی، اب ہندوستان اتنا آگے جاچکا تھا کہ پولیس سے بھی آنکھ مچولی کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔

شمعِ آزادی کے پروانے

سنہ ۱۹۲۰ء تا سنہ ۱۹۳۲ء

عبداللہ۔

تھانہ چوری چورہ ضلع گورکھپور کے حلقہ میں واقع ایک گاؤں راجدھانی کا نوجوان تھا جو تلاشِ معاش میں احمدآباد پہونچ گیا ایک برس وہاں رہ کر وطن واپس لوٹ آیا، اس کے زمانہ قیام احمدآباد میں وہاں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا اس میں عبداللہ نے والنیٹر کی حیثیت سے کام کیا اور مسلم باورچی خانے کا نظام سنبھال رکھا تھا، اسی اجلاس سے عبداللہ کو کسان مزدور تنظیم کی ضرورت و اہمیت کا احساس ہوا اور وہ کسان مزدور راج کا خواب دیکھنے لگا، اسی دوران گاندھی جی گورکھپور آئے تھے، نان کوآپریشن کا سلسلہ ہوچکا تھا، عبداللہ نے اپنے علاقے میں کانگریس کے والنیٹروں کی بھرتی شروع کی، اسی نے لعل محمد اور نذر علی کو کانگریس کا والنیٹر بنایا، اسی کی رہنمائی میں نان کوآپریشن کی تحریک میں چوری چورہ تھانے کو پھونکا گیا اور اس میں تھانیدار اور کئی سپاہی جل کر خاک ہوگئے تھے، الٰہ آباد ہائیکورٹ سے اس کو پھانسی کی سزا ملی اور ۲ر جولائی سنہ ۱۹۲۲ء کو شمعِ آزادی پر پروانہ وار نثار ہوگیا۔

لعل محمد۔

موجودہ ضلع دیوریا میں واقع قصبہ چوری چورہ کا رہنے والا تھا پڑھا لکھا نوجوان تھا منڈل کانگریس کمیٹی کا سکریٹری تھا، اس کے گھر کے سامنے ایک وسیع صحن تھا یہیں اس نے کانگریس کے والنیٹروں کی ڈرل کا انتظام کیا اور بھگوان یادو جو ریٹائرڈ فوجی تھا اور اب کانگریس کے رضاکاروں میں شامل تھا اس نے چھاپہ مار لڑائی کی تربیت دینی

شروع کی، منڈل کانگریس کمیٹی کا دفتر ڈومری خورد میں رکھا گیا اور لعل محمد کو اس کا سکریٹری چنا گیا، والنیٹروں کے اخراجات کیلئے ہر گھر سے چٹکی وصول کرنے کا سلسلہ جاری کیا گیا، شراب کی دکانوں پر پکٹنگ کا اس نے آغاز کیا۔

گاندھی جی نے جب عدمِ تعاون کی تحریک شروع کی تو ۱۳ر جنوری ۱۹۲۲ء کو دیوریا کے سب ڈویژنل مجسٹریٹ نے زمینداروں، بیوپاریوں اور پولیس کے دلالوں کی ایک میٹنگ بلائی جس میں لوگوں کو انگریزی حکومت کے دلالوں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ عدمِ تعاون کی تحریک میں کسی کو حصہ نہیں لینا چاہئے، اس میٹنگ کے خاتمہ کے بعد اسی جگہ لعل محمد، عبداللہ اور بھگوان یادو نے ایک جلسۂ عام کیا اور عدمِ تعاون کی تحریک میں پرجوش حصہ لینے کیلئے عوام سے اپیل کی گئی اور اس کیلئے لوگوں کو تیار کیا گیا، لعل محمد نے ضلع کانگریس کے صدر سبحان اللہ کو تھانیدار کے مظالم کے خلاف مظاہرہ کرانے کیلئے آمادہ کیا تھا اور تھانے پر مظاہرہ کا پروگرام بنایا تھا، جسکے نتیجہ میں گولی چلی، تھانے کو نذرِ آتش کیا گیا، الٰہ آباد ہائیکورٹ سے لعل محمد کو پھانسی کی سزا دی گئی اور ۲۲ر جنوری ۱۹۲۳ء کو اُسے پھانسی دیدی گئی۔

نذر علی۔

ڈومری خورد کا رہنے والا نوجوان تھا کانگریس کے پرجوش ورکروں اور والنیٹروں میں شامل تھا، اس جلوس کی رہنمائی کرنے والوں میں شامل تھا جو تھانے پر مظاہرہ کیلئے جارہا تھا جس نے بعد میں تھانے کو پھونکا اور جلایا تھا، نذر علی بھی اس میں شریک تھا اس کو بھی الٰہ آباد ہائی کورٹ سے پھانسی کی سزا ملی اور ۲۲ر جنوری ۱۹۲۳ء کو تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا۔

مولوی نذر علی۔

یہ خاص چوری چورہ کے رہنے والے تھے، مظاہرہ کرنے والے جلوس میں اور تھانے پر پتھراؤ کرنے والوں اور آگ لگانے والوں میں پیش پیش تھے، پولیس نے جب جلوس پر گولی چلائی تو سب سے پہلے پولیس کی گولی سے یہی تھانے پر ہی شہید ہوئے ان کے

ساتھ پولیس کی گولی سے تھانے پر مرنے والوں میں رام کھلاون اور منڈیروا بازار کے بھگوان یادو شامل تھے۔

اشفاق اللہ خان۔

شاہجہاں پور کے رہنے والے تھے ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام شفیق اللہ خان تھا تعلیم کے دوران انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور انقلابی پارٹی کے ممبر بن چکے تھے، ۹ر اگست ۱۹۲۵ء کو لکھنؤ کے قریب کاکوری اسٹیشن پر ریل سے جانے والے سرکاری خزانے پر اپنے انقلابی ساتھیوں کو لیکر حملہ کیا تھا، بعد میں پولیس نے انکو گرفتار کر کے فیض آباد جیل بھیجدیا، لکھنؤ میں مقدمہ چلایا گیا عدالت نے پھانسی کی سزا تجویز کی اور ۳ر اپریل ۱۹۲۶ء کو فیض آباد جیل میں پھانسی دیدی گئی۔

عبدالرشید۔

۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کی گرفتاری پر شولاپور (مہاراشٹر) میں مزدوروں نے زبردست جلوس نکالا اور احتجاج کیا، یہ احتجاج تشدد کی شکل اختیار کر گیا اور توڑ پھوڑ کی، جس کی وجہ سے بعد میں کئی نوجوان لیڈر گرفتار ہوئے، عبدالرشید بھی انھیں گرفتار ہونے والوں میں شامل تھے، کیونکہ جلوس کی قیادت کرنے والوں میں سے تھے ان پر بغاوت کا کیس چلایا گیا، عدالت نے فیصلہ کر دیا کہ تختۂ دار پر چڑھا دیا جائے چنانچہ ان کو بڑودہ جیل میں ۱۹۳۰ء میں پھانسی دیدی گئی، عبدالرشید کے ساتھ بعض دوسرے لوگوں کو بھی سزا دی گئی۔

قربان حسین۔

۱۹۳۰ء میں شولاپور کے احتجاج میں جو گاندھی جی کی گرفتاری کے خلاف ہوا تھا عبدالرشید کے ساتھ انھوں نے بھی زبردست حصہ لیا تھا اور جلوس کی قیادت کرنیوالوں میں شامل تھے، عبدالرشید کے ساتھ ہی یہ بھی گرفتار ہوئے، پولیس نے بغاوت کا مقدمہ چلایا انگریزی عدالت نے پھانسی کی سزا تجویز کی اور اسی سال بڑودہ جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

عبدالرحیم۔

انگریزوں کے مشہور دشمن سلطان ٹیپو، شاہِ میسور کے خاندان سے تھے، تاملناڈو کے مشہور انقلابی لیڈروں میں ان کا شمار تھا اپنی گرم سیاست وقیادت کی وجہ سے پانچ سال مسلسل جیل کی چہار دیواری میں گذارے، جیل سے رہائی کے بعد اپنی سیاسی وانقلابی سرگرمیوں کو برابر جاری رکھا اور عوام کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

پروفیسر عبدالعلیم۔

یہ مسٹر عبدالرحیم کے صاحبزادے تھے، شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، سیاسی تحریکات میں اپنے والد اور اپنے مورثِ اعلیٰ سلطان ٹیپو کے نقشِ قدم پر چلتے رہے، تعلیم یافتہ نوجوان تھے اسلئے فطری طور پر پرجوش تھے، انکا اندازِ بیان بڑا جارحانہ ہوتا تھا جو حکومت کیلئے ناقابلِ برداشت ہوجاتا تھا کئی بار گرفتار ہوئے، پولیس نے مظالم کئے مگر ان کی انقلابی سرگرمیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

شیخ عبداللہ۔

شیخ عبداللہ شیر کشمیر کہے جاتے تھے، کشمیر کی نیشنل کانفرنس کے بانی ہیں جس نے ریاستِ کشمیر میں جاگیردارانہ نظام کے خلاف زبردست جنگ کی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ہائی کمان سے ہمیشہ بہت قریبی رابطہ رہا، بہت ہی مدبر اور بلند پایہ کے سیاستداں تھے آزادی کے بعد کشمیر کے وزیرِ اعلیٰ رہے لیکن اپنے بے لچک اصولوں کیوجہ سے وزارتِ اعلیٰ کو لات ماردی اور آزاد ہندوستان میں طویل عرصہ تک نظر بند رہے بالآخر دوبارہ کشمیر کی سیاست وقیادت ان کے ہاتھوں میں آئی پھر تادمِ اخیر کشمیر کے وزیرِ اعلیٰ رہے، راقم الحروف کو دہلی کے ایک جلسہ میں ان سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔

ایم عبداللہ۔

ایم عبداللہ دیلور کے رہنے والے تھے اور تاملناڈو کے نیشنلسٹ مسلمانوں کے لیڈروں میں انکو نمایاں مقام حاصل تھا، سرگرم سیاست میں حصہ لیتے رہے۔

مسٹر صادق علی۔

شیخ عبداللہ شیرِ کشمیر کے ساتھیوں میں سے تھے کشمیر میں جاگیردارانہ نظام کے خلاف تحریک چلانے والوں میں شامل تھے، کمیونسٹ پارٹی کے چوٹی کے لیڈروں میں شامل تھے، چین سے ساز باز کرنے کا بھی ان پر الزام لگایا گیا تھا، آزاد کشمیر کی وزارت میں شامل رہے اور اہم وزارتوں پر فائز رہے۔

عبدالستار۔

ڈنڈیگل کے رہنے والے تھے، اپنے علاقے کے مشہور سیاسی لیڈر تھے، اپنی سیاسی اور انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے جیل جاتے آتے رہے۔

مسٹر ایس اے رحیم۔

یہ بھی ڈنڈیگل کے باشندے تھے تحریکِ آزادی میں قائدانہ حصہ لیتے رہے اور اس راہ میں ہر قومی لیڈر کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے مسٹر عبدالرحیم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے، جیل گئے، چکیاں پیسیں، پولیس کے ظلم و زیادتی کو برداشت کیا۔

اے، ایم اللہ بخش۔

مدراس کے رہنے والے تھے، جد وجہدِ آزادی کے سلسلہ میں تاملناڈ کی مسلم نیشنلسٹ لیڈر شپ میں شامل تھے اور مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی اور قیادت کی ذمہ داریوں کو پورا کرتے رہے۔

عبدالرحمٰن۔

کیرالہ کے رہنے والے تھے مشہور قومی کارکن اور کیرالہ کے مشہور سیاسی لیڈر تسلیم کئے جاتے تھے پوری زندگی سرگرم سیاست سے وابستہ رہے۔

مظہر الحق بیرسٹر۔

صوبۂ بہار کی مشہور ترین شخصیت، قومی لیڈروں کے میزبان "صداقت آشرم" پٹنہ کے بانی تھے "صداقت آشرم" آپ کی قومی و سیاسی خدمات کا مرکز، کانگریس ہائی کمان کی قیامگاہ، مجاہدینِ آزادی کی بہترین تربیت گاہ، صدرِ جمہوریۂ ہند راجندر پرشاد

اسی صداقت آشرم سے وابستہ رہے، گاندھی جی، پنڈت جواہر لال، مولانا آزاد اور دوسرے بڑے لیڈروں کی آمد و رفت یہاں برابر جاری تھی، سید مظہر الحق صائب الرائے، مدبر اور سیاستداں اور سیاسی امور میں بہترین مشیرِ کار کی حیثیت رکھتے تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین (صدرِ جمہوریۂ ہند)

ہندوستان کے فرزندِ جلیل، علم و فضل، سیاست و تدبر، جوہرِ حکمرانی، دانشوروں کی رہنمائی ہر ایک جوہر آپ کی ذات میں تھا، جامعہ ملیہ دہلی کے روحِ رواں شیخ الجامعہ، ماہرِ تعلیم، بہار کے گورنر، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے وائس چانسلر، پھر نائب صدرِ جمہوریہ اور آخر میں صدرِ جمہوریہ کے عہدے پر رہتے ہوئے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ سچے اور پکے مسلمان، مثالی نیشنلسٹ، قومی رہنما، پابندِ صوم وصلوٰۃ، علماء ومشائخ سے قربت و محبت اور عقیدت رکھنے والے قدرداں، ہندوستان میں مسلمانوں کی آبرو بنکر رہے

پروفیسر مجیب۔

مشہور علمی شخصیت، نیشنلسٹ مسلمان اور قائد، کانگریس کے اصولوں کے پابند، سنجیدہ و متین، جامعہ ملیہ کے استاد اور بعد میں شیخ الجامعہ ہوئے، چوٹی کے قومی رہنماؤں میں شمار تھا۔

فخر الدین علی احمد (صدرِ جمہوریۂ ہند)

آسام کے رہنے والے، پوری زندگی سرگرم سیاست میں گذری جنگِ آزادی میں زبردست قربانیاں دیں، پہلے آسام کی وزارت میں شامل رہے، پھر مرکز میں بلا لیے گئے، پھر دہلی کے ہوکر رہ گئے، دینی و مذہبی ذہن و مزاج، مخلص مسلمان، سچے قومی لیڈر، ہندوستان کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ہوئے، ہندوستان کے صدرِ جمہوریہ بنائے گئے، اسی عہدۂ صدارت کے زمانے میں داعیِ اجل کو لبیک کہا اور پارلیمنٹ کے ایریے میں آسودۂ خواب ہیں۔

مولانا سید فخر الدین احمد۔

ہندوستان کے مایۂ ناز محدث، حافظِ بخاری، علامہ انور شاہ اور حضرت

شیخ الہند کے ارشدِ تلامذہ میں شامل تھے شاہی مرادآباد اور دارالعلوم دیوبند میں آدھی صدی تک بخاری شریف کا درس دیا، جمعیۃ علماء ہند جو نیشنلسٹ مسلمانوں کی سب سے طاقتور جماعت تھی اس سے ہمیشہ وابستہ رہے کئی بار جیل گئے۔ بہت ہی نازک اندام، جامہ زیب، علمی وجاہت چہرے سے نمایاں تھی، مولانا حسین احمد مدنی کے سانحۂ انتقال کے بعد شاہی مرادآباد سے دارالعلوم دیوبند بلالئے گئے، اور ہزاروں علماء کے استاذ ہوئے، آخر میں کئی سالوں تک جمعیۃ علماء ہند کے صدر رہے، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کے عہدے پر رہتے ہوئے ربِ حقیقی سے جا ملے۔

سید محمود (بہار)

پوری زندگی جنگِ آزادی کے میدانوں میں گذری، اس راہ میں بڑی قربانیاں دیں سیاست میں اخلاص کے قائل تھے، ہمیشہ کانگریس ہائی کمان میں شامل رہے۔ اگست ۱۹۴۲ء میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے جن افراد کو احمد نگر قلعہ میں نظر بند رکھا گیا تھا جن میں مولانا آزاد، پنڈت نہرو وغیرہ تھے سید محمود بھی انھیں میں شامل تھے، حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز رہے آزادی کے بعد مسلم مجلسِ مشاورت کی رہنمائی کرتے رہے لیکن جلد ہی اس سے کنارہ کش ہوگئے۔

حافظ محمد ابراہیم۔

آپ بجنور کے رہنے والے تھے، اتر پردیش کی سیاست میں اہم رول ادا کیا ۱۹۳۷ء کے الکشن میں انکو بہت زیادہ شہرت ملی، پورے ہندوستان کی نگاہیں انکے انتخاب پر لگی ہوئی تھیں کانگریس کی جو وزارت ۱۹۳۷ء میں بنی تھی اس میں وزیر رہے آزادی کے بعد اتر پردیش کی وزارت میں اہم قلمدانوں کے مالک رہے بعد میں گورنر بنا دیئے گئے تھے۔

مسٹر انصار ہروانی۔

اسٹوڈنٹ تحریک کے روحِ رواں، بلکہ طلبہ کی تنظیم کرنے والوں میں آپ کو اولیت حاصل ہے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کو سیاست میں لانے والے آپ ہی تھے۔

انھوں نے طلبہ کو کھینچ کر جنگِ آزادی کے میدان میں لاکر کھڑا کر دیا، تنظیم کی بہترین صلاحیت رکھتے تھے، تحریکِ آزادی میں بڑی قربانیاں دیں۔

شفیع داؤدی۔

شفیع داؤدی بہار کے مشہور لیڈروں اور قومی رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے، سیاست آپکی پوری زندگی کو گھیرے ہوئے ہے، اپنے دور میں ممتاز اور نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

پروفیسر ہمایوں کبیر (بنگال)

انگریزی زبان وادب کے ماہر، بہترین انشاء پرداز، مولانا ابوالکلام آزاد کی آخری تصنیف "ہندوستان نے آزادی جیت لی" کو انگریزی لباس پہنانے والے "انڈیا وینس فریڈم" کے نام سے آپ ہی ہیں، میدانِ سیاست میں پیش پیش اور بنگال کی سیاسی تحریکوں سے وابستہ رہے، آزادی کے بعد مولانا آزاد کے وزارتِ تعلیم میں سکریٹری رہے، بعد میں مرکزی وزارت میں شامل کئے گئے اور اہم قلمدانوں کے مالک رہے۔

عبداللہ۔

پشاور کے رہنے والے تھے، آپ کے والد کا نام محمد تھا، ۱۹۳۰ء کی عوامی تحریک اور سول نافرمانی میں حصہ لیا، جلوس میں شامل ہوئے اور پولیس کی گولی سے قصہ خوانی بازار میں شہید ہوئے۔

عبدالغفار خاں۔

پشاور کے باشندہ، والد کا نام محمد قاسم خاں تھا، پشاور میں چلنے والی نان کو آپریشن تحریک میں بھرپور حصہ لیا، جلوس میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

عبدالرسول۔

۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے، شولاپور (مہاراشٹر) کے رہنے والے تھے، انکے والد کا نام قربان حسین تھا، ٹریڈ یونین لیڈر تھے، ہمہ وقتی لیڈر تھے، ۱۹۳۰ء کی تحریکِ ترکِ موالات و عدمِ تعاون میں حصہ لیا، شولاپور، پولیس اسٹیشن پر ۸ را پریل ۱۹۳۰ء کو ہونیوالے

مظاہرہ میں جلوس کی رہنمائی کی، وہیں گرفتار ہوئے، آپ پر بغاوت کا سنگین جرم عائد کیا گیا، عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا کہ پولیس نے جیل میں اتنی پٹائی کی تھی کہ وہ چوٹ اور زخموں کی تاب نہ لاکر ۱۲ رجنوری ۱۹۳۱ء کو انتقال کر گئے۔

عبدالجلیل۔

پشاور کے رہنے والے تھے، والد کا نام داور تھا، ۱۹۳۰ء کی عوامی تحریک میں حصہ لیا پشاور میں ہونے والے مظاہرے میں شریک رہے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

عبداللہ۔

عبداللہ کے والد کا نام سعداللہ تھا، پشاور کے رہنے والے تھے ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی میں حصہ لیا جلوس میں شریک تھے پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

آغا خان۔

پشاور کے رہنے والے تھے، والد کا نام ظفر خاں تھا ۱۹۳۰ء کے مظاہرہ پشاور میں شہید ہوئے۔

آغا محمد۔

آغا محمد کے والد کا نام ممناری لکھا گیا ہے، صحیح نام کیا ہے معلوم نہیں، پشاور کے عوامی مظاہرہ اور تحریک سول نافرمانی کے سلسلہ میں نکلنے والے جلوس میں شامل تھے پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

احمد سرور۔

بالا گڈھ ضلع ہگلی (بنگال) کے رہنے والے تھے، ۱۹۳۰ء کی نان کوآپریشن تحریک اور ستیہ گرہ میں حصہ لیا اور گرفتار کیے گئے، جیل میں پولیس نے اتنا مارا کہ چوٹ اور زخموں کی تاب نہ لاکر جیل ہی میں انتقال کر گئے۔

کریم خان۔

پشاور کے رہنے والے تھے ان کے والد کا نام عبدالغفور تھا، ۱۹۳۰ء میں پشاور کی نان کوآپریشن تحریک میں شامل تھے اور جلوس میں شریک ہوئے، پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

چودھری عبداللہ۔

پشاور کے باشندہ تھے آپ کے والد کا نام محمد یوپٹ تھا، پشاور میں چلنے والی ستیہ گرہ میں حصہ لیا، جلوس میں شریک رہے اور قصہ خوانی بازار میں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

دلاور خان۔

پشاور کے رہنے والے تھے، ۱۹۳۰ء کی نان کوآپریشن تحریک میں حصہ لیا اور جلوس میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

فقیر محمد۔

پشاور کے رہنے والے تھے، ۱۹۳۰ء کی تحریک نان کوآپریشن میں حصہ لیا جلوس میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

فضل الدین۔

ہزارہ ضلع پشاور کے رہنے والے تھے، والد کا نام محمد بخش تھا، ۱۹۳۰ء میں پشاور کی تحریک نان کوآپریشن میں حصہ لیا اور جلوس میں شریک ہوئے پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

فضل محمد۔

فضل محمد کے والد کا نام نور محمد تھا پشاور کے رہنے والے تھے ۱۹۳۰ء کی تحریک نان کوآپریشن میں حصہ لیا پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

فضل الرحمٰن۔

پشاور کے رہنے والے تھے آپ کے والد کا نام محمد سلطان تھا ۱۹۳۰ء کی تحریک میں حصہ لیا اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

غفار خان۔

جھبّوال ضلع پشاور کے باشندہ تھے سول نافرمانی کے جلوس میں شریک تھے پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

غلام حسنین۔

غلام حسنین کے والد کا نام میاں خان تھا، پشاور کے رہنے والے تھے ۱۹۳۰ء کی نان کوآپریشن تحریک میں شریک ہوئے پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

غلام محمد۔

غلام محمد پشاور شہر کے باشندہ تھے، ۱۹۳۰ء کی نان کوآپریشن تحریک میں حصہ لیا اور جلوس میں پولیس فائرنگ کی وجہ سے شہید ہوئے۔

گل محمد۔

گل محمد کے والد کا نام میاں جانی تھا پشاور کے رہنے والے تھے ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی کے جلوس میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

گل رحمٰن۔

آپ کے والد کا نام شیر دل تھا، پشاور کے باشندہ تھے ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی کے جلوس میں شریک رہے اور پولیس کی گولی سے مارے گئے

خان صاحب۔

یہ خان صاحب کے نام سے مشہور تھے، پشاور ہی کے رہنے والے تھے ۱۹۳۰ء کی تحریک میں شامل رہے جلوس میں شرکت کی اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

کریم شاہ۔

کریم شاہ کے والد کا نام داؤد شاہ تھا، پشاور کے رہنے والے تھے ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی کے جلوس میں شریک ہوکر پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

حسینی۔

پشاور کے رہنے والے تھے آپ کے والد کا نام محمد قاسم تھا، ۱۹۳۰ء کی تحریک نان کوآپریشن کے جلوس میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

محمد افضل۔

ضلع پشاور کے کسی گاؤں کے رہنے والے تھے، شہر پشاور میں نان کوآپریشن

کے سلسلہ میں ۱۹۳۰ء میں نکلنے والے جلوس میں شریک ہوکر پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

محمد علی۔

پشاور کے باشندہ تھے، والد کا نام محمد افضل تھا، ۱۹۳۰ء کے عوامی مظاہرے میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

محمد اشرف۔

پشاور کے رہنے والے تھے، ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی کے جلوس میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے موقعہ ہی پر شہید ہوئے۔

محمد دین۔

پشاور کے باشندہ تھے، پشاور میں ۱۹۳۰ء کی تحریک نان کوآپریشن کے سلسلہ میں نکلنے والے جلوس میں شرکت کی اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

محمد اسمٰعیل۔

محمد اسمٰعیل کے والد کا نام محمد دین تھا ۱۹۰۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، گاندھی جی کی گرفتاری پر دہلی میں عوامی مظاہرہ ہوا اور جلوس نکالا گیا اس جلوس میں شریک ہوئے اور وہیں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

محمد سعید۔

محمد سعید داجگیری ضلع پشاور کے رہنے والے تھے آپکے والد کا نام فضل تھا خلافت تحریک کے مشہور والنٹیر تھے پشاور کی ستیہ گرہ میں حصہ لیا پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

محمد شاہ۔

۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے، چمنی ضلع پشاور کے رہنے والے تھے، آپکے والد کا نام ضرغام شاہ تھا، ۱۹۳۰ء کے مظاہرہ میں حصہ لیا پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

گل پہلوان۔

گل پہلوان پشاور کے رہنے والے تھے، ۱۹۳۰ء کی تحریک نان کوآپریشن میں

حصہ لیا جلوس میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے ۔

قمر گل ۔

قمر گل کے والد کا نام خان گل تھا ، پشاور کے رہنے والے تھے ، کوچ مین تھے ۱۹۳۰ء کے عوامی مظاہرے میں شریک رہے جلوس پر فائرنگ ہوئی اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے ۔

رمضان ۔

رمضان پشاور کے رہنے والے تھے ۱۹۳۰ء کی تحریک میں حصہ لیا اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے ۔

شاہ افضل ۔

نہاتی ضلع پشاور کے رہنے والے تھے ، ۱۹۳۰ء کے عوامی مظاہرہ میں حصہ لیا اور جلوس میں شریک ہوئے ، پولیس کی گولی سے مارے گئے ۔

شاہ میر غلام ۔

پشاور کے باشندہ تھے آپکے والد کا نام ، نواب شاہ تھا تحریک خلافت کے والنیٹر تھے ۱۹۳۰ء کے مظاہرہ میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے ۔

شیر دل ۔

والد کا نام محمد کاظم تھا پشاور کے باشندہ تھے ۱۹۳۰ء کے عوامی مظاہرہ میں شریک رہے اور انکو فوجی جیپ سے کچل دیا گیا اور موقعہ ہی پر جان جاں آفریں کو سپرد کر دی ۔

سید محمد ۔

پشاور کے رہنے والے تھے ۱۹۳۰ء کے عوامی مظاہرے میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے قصہ خوانی بازار میں شہید ہوئے ۔

عمر خان

عمر خان کے والد کا نام محمد گل خان تھا ، پشاور کے رہنے والے تھے ۱۹۳۰ء کی تحریک میں حصہ لیا اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے ۔

عمر خیل ۔
پشاور کے باشندہ تھے ، ۱۹۳۰ء کے مظاہرہ میں حصہ لیا جلوس میں شریک رہے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے ۔

ولی محمد
ہوتی مردان ضلع پشاور کے رہنے والے تھے ، ۱۹۳۰ء کی تحریک نان کوآپریشن میں حصہ لیا اور جلوس میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے ۔

والگ ۔
والگ ضلع پشاور کے کسی گاؤں کے رہنے والے تھے ، پشاور شہر میں ۱۹۳۰ء میں چلنے والی عدمِ تعاون وسول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیا اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے ۔

زید اللہ ۔
ضلع پشاور میں کسی جگہ کے رہنے والے تھے ، ۱۹۳۰ء کی تحریکِ عدمِ تعاون میں حصہ لیا جلوس میں شریک رہے اور پولیس کی گولی سے مارے گئے ۔

زیارت گل ۔
زیارت گل نام تھا آپ کے والد کا نام سعید گل تھا پشاور شہر کے رہنے والے تھے ، ۱۹۳۰ء میں پشاور میں تحریک سول نافرمانی میں حصہ لیا اور جلوس میں شریک ہوئے جلوس پر فائرنگ ہوئی اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے ۔

باب (۶)

کاروانِ آزادی کی راہ کے نشیبؔ و فراز

اب تک ہم نے آپ کے سامنے جنگِ آزادی کے سلسلہ میں ہونے والی جن کوششوں کا ذکر کیا ہے اور جس ماحول اور فضا کی منظر کشی کی ہے اس سے آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ اس وقت تک پورے ہندوستان میں یہ احساس عام ہوچکا تھا کہ ہمارے اوپر ایک غیرملکی، سفید فام قوم زبردستی حکمراں بن گئی ہے اور ہم محکومی اور غلامی کی ذلت میں گرفتار ہوکر مظلومانہ زندگی گذارنے پر مجبور کردیے گئے ہیں اسی مجبوری کے شدید احساس نے نہتے ہندوستان کو مسلح برطانوی حکومت کے مقابلے میں کھڑا کردیا تھا اور انجام سے بے پروا ہوکر ہندوستان میں بسنے والی ہر قوم آزادی حاصل کرنے کی ہر امکانی جدوجہد میں بیش از بیش حصہ لینے لگی، ہندوستان کے گوشے گوشے میں عوامی تحریکیں چلتی رہیں، حکومت اور اس کی انتظامیہ کے خلاف مظاہرے ہوتے رہے، انگریزی مشینری سے ٹکراؤ ہوتا رہا، ہندوستانیوں کے خون سے ہولیاں کھیلی جاتی رہیں لیکن کبھی بھی دل شکستگی اور پست ہمتی کا مظاہرہ نہیں ہوا بلکہ ہر بڑی مصیبت کے نرغے سے نکلنے کے بعد یہاں کے عوام میں مزید جوش و جذبہ پیدا ہوتا رہا اور پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ سیاسی راہوں میں ہندوستان چل پڑا۔

ہندو مسلم اتحاد جو خلافت تحریک کی سب سے بڑی دین تھی وہ ہندوستان کی تاریخ میں مثالی اتحاد تھا، کسی کو اس اتحاد کی دیوار میں شگاف ڈالنے کی ہمت نہیں تھی، ہندوستان کی یہ دونوں بڑی قومیں اس پورے دور میں شیر و شکر رہیں، قومی و مذہبی تفریق یا اس کا

لحاظ وخیال مجاہدینِ آزادی کے یہاں دور دور تک نہیں تھا، ہندوستان کے ہر گوشے میں آپ دیکھیں گے کہ ہر قوم و ملت کے لوگوں کی مشترکہ جد وجہد کے ساتھ مشترکہ جماعت و افراد نے حکومت سے ٹکر لی اور اس راہ میں دونوں کا خون ایک ساتھ ہر میدان میں بہتا رہا یہ اتحاد آزادی طلب کرنے والے انقلابیوں کا سب سے قیمتی سرمایہ، سب سے بڑی طاقت، سب سے کارگر حربہ تھا۔

انگریزی حکومت سب سے زیادہ اسی اتحاد سے خائف تھی وہ "ڈیوائڈ اینڈ رول" پر عقیدہ رکھتی تھی، ہندو مسلم اتحاد برطانوی حکومت کی نگاہ میں ایک ایسا زہریلا تیر تھا جو اس کے ذہن و فکر کی گہرائیوں میں پیوست ہو کر اسکے سارے جسم میں سرایت کر سکتا تھا اور یہ زہر بالآخر ہندوستان میں انگریزی اقتدار کی موت کا سبب بن سکتا تھا اس لئے حکومت نے اس کے علاج کی طرف توجہ کی اور ہر ممکن کوشش کی کہ یہ اتحاد پارہ پارہ ہو جائے اور شیرازہ منتشر ہو جائے تو ہندوستان پر ہماری حکومت کے ایام کچھ اور بڑھ سکتے ہیں اور ہندوستان کے جسم کے خون کا آخری قطرہ بھی انگلینڈ کی رگوں میں پہونچ سکتا ہے۔

نیا جال لایا پرانا شکاری

ستیہ گرہ، سول نافرمانی، ترکِ موالات جو بھی نام دیجئے بات ایک ہی تھی کہ ہم ہندوستان پر انگریزی اقتدار کو برداشت نہیں کرتے، ہم اس حکومت اور اس کے قوانین سے بیزار ہیں، اور اب ہم غلامی کی ذلت مزید برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں، ملک ہمارا ہے، اس ملک پر سات سمندر پار کے لوگوں کا غاصبانہ قبضہ اب ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہے، ہندوستان کے عوام نے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۲ء تک مسلسل اپنے عمل سے اپنے ان جذبات کا اظہار کیا، حکومت نے نعرہ لگانے والوں کی زبانوں کو بند کرنے کیلئے اپنے کرایہ کے سپاہیوں کو استعمال کیا، ہندوستانیوں کو ہندوستانیوں سے کٹوایا، ان کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کروایا، بھائی کو بھائی سے ذبح کرایا لیکن شہید ہونے والوں کے خون کے ایک ایک قطرے سے انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند ہوتا رہا، نعروں کی آواز خوفناک ہوتی چلی گئی ایوانِ حکومت کی خلوتوں میں خوف وہراس نے ڈیرہ جما لیا اور اس سے نجات حاصل کرنے پر

بڑی سرگرمی سے غور کیا جانے لگا اور حکومت ایک نسخۂ کیمیا دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئی اس نے بساطِ سیاست پر ایسا مہرہ بٹھایا کہ ہاری ہوئی بازی جیت گئی۔

سوامی شردھانند

۱۹۲۲ء کی ستیہ گرہ میں کانگریس کے پلیٹ فارم سے سوامی شردھانند نے حصہ لیا، انگریزی حکومت کے قوانین کے خلاف اظہارِ نفرت کے طور پر ستیہ گرہ میں شریک ہو کر جیل گئے، وہ ہندوستان کے جذبات کے وکیل بن کر اور نمائندہ کی حیثیت سے جیل گئے مگر دنیا نے حیرت سے دیکھا کہ سوامی جی جیل میں کچھ ہی دنوں رہنے کے بعد جیل کے پھاٹک سے اپنے شوخ گیردے لباس میں خراماں خراماں چلے آرہے ہیں، سیاسی مجلسوں میں تعجب کا اظہار کیا گیا کہ آج تک کسی لیڈر نے تو کیا کسی معمولی رضاکار نے بھی حکومت سے معافی نہیں مانگی اور نہ وقت سے پہلے کبھی کوئی رہا کیا گیا۔

سوامی جی کی رہائی کس جادو کے ذریعہ ہوئی، لیکن یہ رہائی علاؤالدین کے چراغ کے موکل نے کرائی تھی "کھل جا سم سم" کا منتر سوامی جی کو معلوم ہو گیا، انھوں نے اس منتر کو پڑھا اور جیل کا پھاٹک از خود کھل گیا۔

شدھی اور سنگھٹن

سوامی جی نے جیل سے باہر آتے ہی ہندوؤں کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا مشورہ دیا اور بتایا کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے، یہاں ملیچھ مسلمانوں نے آکر ہمارے بھارت کے لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا، ہر ہندو کو چاہیے کہ تمام مسلمانوں کو شدھی کر کے ان کو پھر سے ہندو دھرم میں واپس لائے اس پوتر کام کو پورا کرنے کیلئے ہندوؤں کو اپنا سنگھٹن بنا لینا چاہیے۔

پھر آپ نے اپنے چیلوں کو کچھ خاص خاص علاقوں میں بھیج کر شدھی کا پرچار شروع کر دیا، ہندوؤں کو ورغلایا اور ہندو مسلم اتحاد کے محل میں وہ آگ بھڑکائی کہ برسہا برس کا جمع کیا ہوا اثاثہ جل کر خاکستر ہو گیا، پورے ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک نفرت و عداوت کی آگ دہک اٹھی، انگارے بھڑکنے لگے اور دونوں فرقوں کے لوگ مشتعل ہو کر آمادۂ پیکار ہو گئے، جو مجاہدینِ آزادی براہِ راست انگریزی سامراج سے نبرد آزما تھے وہ اپنی ہی فوج میں اپنے ہی آدمیوں کا گلا کاٹنے لگے، حکومت دور کھڑی

اپنی کامیابی پر مسکراتی رہی ۔

کوئی معشوق ہے ...."

کانگریس کی ستیہ گرہ میں شریک ہو کر جیل جانیوالا سوامی یک بیک اتنا تنگ نظر، فرقہ پرست اور وطن دشمن ہو گیا ؟ لوگوں نے حیرت و استعجاب کے عالم میں کہنا شروع کر دیا ع

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

سوامی شردھانند جی نے جب اس فتنہ کو جگایا تو اس کے ردِعمل کے طور پر مسلمانوں کے بعض حلقوں کی طرف سے جوابی کارروائی ہوئی، مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچلوئے مجلس تنظیم بنائی، اور خواجہ حسن نظامی نے "تبلیغ" قائم کی، اس کا نتیجہ ٹکراؤ، تصادم، ایک دوسرے سے نفرت اور دوری، دونوں فرقوں میں اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی، جنگِ آزادی کے میدان میں سناٹا آنے لگا، کئی برسوں کی جد وجہد ناکامی کے کنارے پہونچنے لگی، جن لوگوں نے اتحاد کے اس پودے کو لگایا تھا، اپنے خونِ جگر سے اس کی آبیاری کی تھی وہ تحریک خلافت کے رہنما تھے انھوں نے اس کی اذیت کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور ہمت کر کے میدان میں آئے اور انتھک جد وجہد اور مسلسل کوششوں سے اس آگ پر قابو پایا تب کہیں جاکر یہ آگ ٹھنڈی ہوئی اگرچہ کچھ چنگاریاں راکھ میں دبی رہ گئیں اور کبھی کبھی سلگ بھی اٹھتی تھیں لیکن اب اس کی آنچ زیادہ دور تک نہیں پہونچتی تھی ۔

حکومت کی نظرِ عنایت

پہلے مختصر طور پر جو کچھ آپ کو بتایا گیا ہے اس کو ایکبار آپ ذہن میں پھر تازہ کرلیں تاکہ سلسلۂ کلام مربوط ہو جائے، میں نے آپ کو بتایا تھا کہ سنہ ۱۹۲۷ء میں انگلینڈ سے سائمن کمیشن آیا، جب اس کے آنے کا غلغلہ بلند ہوا تو ہندوستان کی سیاسی فضا میں تموج پیدا ہوا، ہندو مسلم اختلاف بڑی حد تک دبایا جا چکا تھا، اس لئے دونوں نے کمیشن کا بائیکاٹ کیا، مسٹر سائمن ناکام و نامراد انگلینڈ واپس چلے گئے، انھوں نے اپنے کمیشن کی رپورٹ بھی ابھی پارلیمنٹ میں پیش نہیں کی تھی کہ وزیرِ اعظم برطانیہ کا چیلنج ہندوستان کے سامنے

آ گیا اور اس کے جواب میں نہرو رپورٹ تیار کی گئی، مگر یہ رپورٹ کسی فرقہ کے لئے بھی قابلِ قبول نہ ہو سکی اسلئے حکومت کی نظرِ عنایت بے نتیجہ ہو کر رہ گئی۔

ہندوستان ناکام رہا

نہرو رپورٹ ۲۸ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو آل پارٹیز کانفرنس کلکتہ میں پیش کی گئی خلافت کانفرنس کے رہنماؤں نے کانفرنس کا بائیکاٹ کیا صرف مولانا محمد علی ذاتی حیثیت سے شریک ہوئے اور درجۂ نوآبادیات کی مخالفت میں تقریر کی لیکن اُن کو پوری تقریر نہیں کرنے دیا گیا وہ اپنی تقریر ناتمام چھوڑ کر بڑی بددلی کے ساتھ کانفرنس سے چلے گئے، بڑی ناخوشگوار اور تلخی کی فضا میں کانفرنس چلتی رہی مگر رپورٹ پر اتفاقِ رائے نہ ہو سکا ہندوستان کی کئی سیاسی جماعتوں اور بہت سے اہم مسلمان لیڈروں کے لئے بھی یہ رپورٹ ناقابلِ قبول ہی رہی، ۳۰ر مارچ ۱۹۲۹ء کو روشن تھیٹر دہلی میں ایک اجلاس مسلمانوں کا ہوا جس میں شریک ہونے والے خاص لیڈروں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مسٹر آصف علی بیرسٹر دہلی، مولانا مفتی کفایت اللہ صدر جمعیۃ علماء ہند، ڈاکٹر سیف الدین کچلو (امرتسر) مسٹر تصدق حسین شیروانی (علی گڈھ) کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اس اجلاس میں نہرو رپورٹ کے بارے میں فیصلہ کیا گیا رزرولیشن کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

> "ہندو مہاسبھا نے اعلان کیا ہے کہ نہرو رپورٹ کے فرقہ وارانہ فیصلہ سے اگر ذرا بھی روگردانی کی گئی تو وہ رپورٹ کی حمایت سے دست بردار ہو جائیگی سکھ لیگ نے بھی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، غیر برہمن اور اچھوت اس کے مخالف ہیں، چونکہ مسلمانوں کے بھی اہم مطالبات کو منظور نہیں کیا گیا ہے اسلئے یہ اجلاس بھی نہرو رپورٹ کو منظور کرنے سے قاصر ہے۔"

چونکہ رپورٹ پر ہندو فرقہ داریت نے زبردست اثر ڈالا تھا اسلئے سوائے کٹر فرقہ پرست پارٹی ہندو مہاسبھا جو موجودہ دور کی آر۔ایس،ایس کی مورثِ اعلیٰ ہے اور کانگریسی لیڈران کے اور کسی نے اس کو تسلیم نہیں کیا، اسلئے جب حکومت کو پیش کرنے کی باری آئی تو حکومت نے بھی اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، تب کانگریس کو بھی ملک کے عوام کی

راہ پر آنا پڑا اور دسمبر ۱۹۲۹ء میں پنڈت نہرو کی صدارت میں جو کانگریس کا اجلاس لاہور میں ہوا اس میں فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ نہرو رپورٹ منظور نہیں کی گئی اس لئے سول نافرمانی کے پروگرام پر عمل شروع کر دیا جائے اور اب ہم درجۂ نو آبادیات پر قناعت نہیں کریں گے آزادیِ کامل حاصل کریں گے، اور پھر کانگریس نے ستیہ گرہ شروع کر دی اور اس کے تمام بڑے لیڈران جیل چلے گئے، ۱۹۳۱ء کے آغاز میں حکومت نے ہندوستانی لیڈروں کو مشورہ کیلئے لندن بلانے کا فیصلہ کیا اور دعوتنامہ جاری کر دیا۔

مشورے ہی مشورے

چونکہ کانگریس کے لیڈران جیل میں تھے اسلئے حکومت نے کانگریس کو نظرانداز کرکے دوسری جماعتوں کے نام گول میز کانفرنس کے دعوتنامے جاری کر دیے، اختلافات کی خلیج چونکہ اب بہت وسیع ہو چکی تھی اسلئے اس کانفرنس میں کوئی متحدہ محاذ نہیں بن سکا اسلئے یہ پہلی گول میز کانفرنس ناکامی پر ختم ہو گئی، اس کے بعد ۶ رفروری ۱۹۳۱ء کو موتی لال نہرو کا انتقال ہو گیا، سول نافرمانی کی تحریک سرد پڑ چکی تھی، اکثر لیڈران جیل کے باہر آ چکے تھے ۴ رمارچ ۱۹۳۱ء کو کانگریس اور حکومت میں صلح ہو گئی اب دوسری گول میز کانفرنس کی تیاریاں شروع کر دی گئیں، اگست ۱۹۳۲ء کے آخر میں ہندوستانی لیڈران لندن روانہ ہو گئے۔

کانگریسی لیڈروں کی پالیسی یہ تھی کہ کانفرنس میں فرقہ وارانہ مسئلہ زیرِ بحث نہ لایا جائے مگر کچھ لوگوں کی وجہ سے جب گاندھی جی کو مجبور ہونا پڑا تو انھوں نے کہا کہ کانگریس میں اقلیتوں کے مسائل کے سلسلہ میں ڈاکٹر انصاری کی رائے ہمارے نزدیک سب سے اہم ہے اس لئے انکو لندن بلایا جائے لیکن جب یہ ممکن نہ ہوا تو کانگریس کے لیڈران نے کہا کہ مسلمانوں کے جملہ مطالبات تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن دوسری اقلیتوں کے مسائل میں مسلمان دخل اندازی نہ کریں، مسلم لیگ کے نمائندوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا، بعد میں فریقین نے مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیرِاعظم برطانیہ کو فرقہ وارانہ مسئلہ کیلئے ثالث مان لیا چونکہ ان کا فیصلہ کانگریس والوں کیلئے ناقابلِ قبول تھا اس لئے اس کو تسلیم کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، دوسری کانفرنس بھی ناکام ہو گئی۔

ایوانِ آزادی کا پہلا زینہ

حریت پسندوں کی تیز تر سرگرمیوں کے نتیجہ میں انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا نفاذ ہوا، جس میں بہت سے اختیارات مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کو دیئے گئے، مگر مکمل آزادی کا مطالبہ ابھی تشنۂ تکمیل تھا، ایکٹ کے نفاذ کی پہلی منزل ہندوستان میں الکشن کرانا تھا کیونکہ انتخابات کے بعد ہی کونسلیں اور مرکزی اسمبلی بن سکتی تھی اس ایکٹ میں کمیونل اوارڈ بھی تھا، یعنی الکشن فرقہ وارانہ بنیاد پر ہوگا، مسلمان ووٹرس مسلم نمائندوں کو منتخب کریں گے اور ہندو ووٹرس ہندو ممبران کو، اسی پالیسی نے بعد میں ہندوستان کو دو حصوں میں منقسم کرنے کی بنیاد رکھی کیوں کہ پہلے ہی دن سے کانگریس اور مسلم لیگ میں رسہ کشی شروع ہوگئی یہی وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں جمعیۃ علماء اور مسلم لیگ میں معاہدہ ہوا۔

مسلم لیگ

مسلم لیگ کا ذکر اب تک ہم نے کہیں نہیں کیا ہے کیونکہ جنگِ آزادی سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، اگرچہ اس کی پیدائش ۱۹۰۶ء میں ہوچکی تھی اور اب اس کی عمر ۲۹ سال ہوچکی تھی، لیکن اس پورے زمانے میں اس کے لیڈروں کی زبان پر کبھی آزادی کا لفظ غلطی سے بھی نہیں آیا، اس لئے اب تک اس کا ذکر کرنا بے محل تھا، مگر آگے چل کر ہندوستان کی سیاست میں صرف دو بڑے کیمپ رہ گئے اس میں سے ایک مسلم لیگ کا کیمپ تھا اور اس نے ہندوستان کی سیاست کا دھارا بدل دیا، اس نے جنگِ آزادی کی عام شاہراہ سے ہٹ کر ایک نئی راہ بنائی جس نے ہندوستان کی تاریخ پر زبردست اثر ڈالا اسلئے اب مسلم لیگ کا ذکر ناگزیر ہوگیا ہے اور اس کی مختصر تاریخ کا علم قاری کے لئے ضروری ہے۔

لیگ عوامی جماعت نہیں تھی

جب ۱۹۳۵ء کا انڈیا ایکٹ نافذ ہوا اور الکشن کا اعلان ہوا اس وقت تک لیگ عوامی جماعت نہیں تھی اور نہ عوامی مسائل سے اس کا کوئی تعلق تھا لیگ پر سرکاری خطاب یافتہ لوگوں اور جاگیرداروں، انگریزی حکومت کے ثنا خوانوں اور برطانوی حکومت کے وفاداروں کا قبضہ تھا، عوام پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا اور نہ عوام کو لیگ کی سرگرمیوں سے

کوئی دلچسپی تھی، اب الکشن فرقہ وارانہ بنیاد پر تھا اور مسلم عوام پر اب تک صرف علمار کا اثر تھا اور ان کی اپنی تنظیم جمعیۃ علمار موجود تھی دینی، مذہبی، قومی ملی اور سیاسی حیثیت سے بھی لوگ جمعیۃ علمار اور اس کے رہنماؤں سے زیادہ قریب تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مسلمانوں پر ابھی تک مذہب کی گرفت بہت مضبوط تھی اور علمار اس جذبے کو فروغ دینے کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے اور ۶۰، ۶۵ سال سے انگریزوں کے خلاف جوجدوجہد جاری تھی اس میں علمار ہی پیش پیش تھے اور بڑی سے بڑی قربانیاں دے رہے تھے، برطانوی حکومت کی جیلوں میں چکیاں پیسی تھیں، کالے پانی کو آباد کیا تھا، ان کے گھر بار نیلام ہوئے تھے، پولیس کی لاٹھیاں اور گولیاں بھی کھائی تھیں اسلئے مسلم عوام علمار کو اپنا پیشوا، رہنما اور قائد جانتے اور مانتے تھے ان کا اکرام و احترام بھی کرتے تھے اور اعزاز کے ساتھ سر اور آنکھوں پر بٹھاتے تھے، اس طرح عوام سے جمعیۃ علمار کا براہِ راست رابطہ اور تعلق تھا۔

جمعیۃ علمار اور لیگ میں سمجھوتہ

یہی وہ حقیقتیں تھیں جن کی بنیاد پر لیگ مجبور تھی کہ جمعیۃ علمار سے تعاون حاصل کرے۔

الکشن سر پر تھا، اتنی تھوڑی مدت میں لیگ منصوبہ بند طریقے سے عوام میں جانیکی کوششوں کا آغاز بھی کرتی تو الکشن تک اس میں کامیابی ممکن نہ تھی اسلئے لیگ کے قائد مسٹر جناح نے سوچا کہ اگر نیشنلسٹ مسلمانوں نے اپنا متحدہ محاذ بنالیا تو الکشن کے میدان میں لیگ تنہا رہ جائے گی اور اس کی کامیابی ناممکن ہو جائے گی اس لئے مسٹر جناح نے جمعیۃ علمار کے رہنماؤں پر زور دیا کہ لیگ اور جمعیۃ علمار میں سمجھوتہ ہو جائے کیونکہ لیگ کیلئے یہ پریشان کن حقیقت تھی کہ وہ مسلم عوام سے کس بنیاد پر ووٹ کی اپیل کرے گی اور مسلمانوں کے کن مسائل کو اپنے الیکشن کے مینی فیسٹو میں درج کریگی۔

یہ میرا اپنا تجزیہ نہیں ہے بلکہ مسٹر جناح کے ایک عقیدتمند سوانح نگار رئیس احمد جعفری نے اپنی کتاب "حیاتِ محمد علی جناح" میں اعتراف کیا ہے اور انھوں نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ:

"مسٹر جناح نے جب جمعیۃ علماء سے مفاہمت کی درخواست کی وہ صرف اسلئے کہ آنے والے الکشن میں مسلم لیگ کی کامیابی کے امکانات بہت ہی کم تھے کیونکہ ابتک مسلم لیگ خواص کی جماعت تھی اور اس پر ذاتی مناصب اور سیاسی سربلندیاں حاصل کرنے والوں کا قبضہ تھا عوام سے اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ (حیاتِ محمد علی جناح ص ۲۳۱)

وہ کون سا کارنامہ لے کر عوام کے سامنے جاتی، مسٹر جناح نے جمعیۃ علماء کے اثر ورسوخ اور اس کے عوامی رابطے سے فائدہ اٹھانا چاہا، جمعیۃ علماء والوں کے پیشِ نظر ملک و وطن کے مفاد کے ساتھ مسلمانوں کا خصوصی مفاد بھی مدِ نظر تھا اس لئے اس راہ میں جو بھی تعاون پیش کرتا جمعیۃ علماء اس کا ہاتھ کیسے جھٹک سکتی تھی ! اور اس کی پیشکش کو کیسے ٹھکرا سکتی تھی ! بس یہی وہ جذبہ تھا جس نے سمجھوتہ کی راہ آسان کردی

سمجھوتے کی شرائط

جمعیۃ علماء والوں نے مسٹر جناح اور مسلم لیگ کو مندرجہ ذیل امور کا پابند بنایا اگر مسلم لیگ ان شرائط کی پابند نہ ہوگی تو جمعیۃ علماء لیگ کا تعاون نہیں کرسکتی شرائط درج ذیل ہیں :

۱ - وہائٹ پیپر (قرطاسِ ابیض) کو ان دفعات کے علاوہ جن پر کمیونل ایوارڈ مشتمل ہے مسترد کرنا۔

۲ - متشددانہ قوانین کو منسوخ کرانا، حکومت کی سخت پالیسی کی مذمت کرنا اور مخالفت کرنا اور ہر ایسے بل یا تجویز کی مخالفت کرنا جو ہندوستان کی تحریکِ آزادی یا سیاسی واقتصادی ترقی کے منافی یا اس کو کچلنے والی ہو تمام ایسے مسودات کے بارے میں جن کا مذہبی امور سے تعلق ہو جمعیۃ علماء کی ہدایت کی پابندی، اسکے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی اور حمایت کرنا۔

۳ - جمعیۃ علماء ہند جن مسوداتِ قانون کو پیش کرنا ضروری سمجھے ان کو پیش کرکے کامیاب بنانے کی سعی کرنا اور اس امر کے متعلق کہ مسودۂ قانون مذہب سے متعلق ہے یا نہیں جمعیۃ علماء کے فیصلہ پر کاربند ہونا۔

مسٹر جناح اور مسلم لیگ نے ان تمام شرائط کو تسلیم کیا تو جمعیۃ علماء نے لیگ کے امیدواروں کی حمایت کا اعلان کر دیا، اس سمجھوتے کا اثر یہ ہوا کہ کانگریس کی طرف سے الکشن انچارج رفیع احمد قدوائی تھے تو قوم پرور مسلمانوں کی طرف سے چودھری خلیق الزماں لیگ کے الکشن انچارج تھے اور یہ بھی کانگریس سے سمجھوتہ ہو گیا کہ جہاں کانگریس مسلم امیدوار کھڑا کرے گی وہاں لیگ اپنا کوئی امیدوار نہیں کھڑا کرے گی۔

سو فیصدی کامیابی

جو مسلم لیگ ابتک ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھی جنہوں نے اس کو اپنی ذاتی اغراض کا کھلونا بنا رکھا تھا اور کچھ لوگوں نے اسے اپنے ذاتی مقاصد اور سیاسی سر بلندیاں حاصل کرنے کیلئے آلۂ کار بنا رکھا تھا، اسی لیگ کے امیدواروں کا مسلم عوام کے ووٹوں سے سو فیصدی کامیابی حاصل کرنا کیا کوئی کم حیرتناک بات ہے؟ کیا ارباب لیگ اپنے خس خانوں میں رہ کر جھونپڑوں میں رہنے والوں کو متاثر کر سکتے تھے؟ کیا لیگ اپنے بل بوتے پر یہ کامیابی حاصل کر سکتی تھی؟ جبکہ عوام سے ابتک اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا، اس کے باوجود اس کا کوئی امیدوار نہیں ہارا، اس کی وجہ یہی تھی کہ جمعیۃ علماء والوں نے اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر شب روز دورے کر کے عوام کی رہنمائی کی، ابھی تک ہندوستان کے مسلمانوں میں علماء کا وقار بحال تھا اور ان کے وقار کو دفن کرنے کی مہم نہیں چلائی گئی تھی، اس لئے صرف جمعیۃ علماء کی جد وجہد کا ثمرہ تھا جس نے بے مثل کامیابی مسلم لیگ کے نامۂ اعمال میں لکھ دی۔

کانگریس کے کیمپ میں

۲ر فروری ۱۹۳۵ء کو گول میز کانفرنس کی مجلسِ منتخبہ کی رپورٹ پیش ہوئی اور کانفرنس سے ہندوستان واپسی سے پہلے کئی کانگریسی لیڈران گرفتار ہو چکے تھے لارڈ اروِن کی جگہ ایک سخت گیر انگریز جو پہلے بمبئی میں گورنر تھا لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند بن کر دہلی آیا اس نے سخت گیری کی پالیسی اپنائی، گاندھی جی گرفتار ہو گئے دوسری طرف انڈیا ایکٹ کے تحت صوبوں کو محدود آزادی ملنے والی تھی، انڈیا ایکٹ کے نفاذ کی تاریخ قریب آگئی تھی، کانگریس میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور بیرسٹر آصف علی کی سرکردگی میں کانگریس کے حلقوں میں

تحریک چلائی گئی کہ مجلسِ قانون ساز کے انتخاب میں حصہ لیا جائے اور حکومت کا مقابلہ حکومت کے ایوان میں بیٹھکر کیا جائے، گاندھی جی الکشن میں حصہ لینے کے مخالف تھے اس لیے کانگریس ہائی کمان کے بہت سے لیڈران بھی الکشن کے بائیکاٹ کے حق میں تھے، ہائی کمان کے کچھ اہم لیڈران ڈاکٹر انصاری اور آصف علی کے موافق تھے، اس طرح کانگریس میں دو گروپ ہوگئے، اور اس اختلاف نے شدت اختیار کرلی، یہ اختلاف اور کشمکش شباب ہی پر تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس کے صدر منتخب کرلیے گئے، عہدۂ صدارت سنبھالنے کے بعد ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی حکمتِ عملی سے اس اختلاف کو ختم کرا کے دونوں گروپوں میں سمجھوتہ کی کوئی شکل پیدا کردیں، تمام ذمہ دار اور اہم لیڈران دو حصوں میں منقسم ہو چکے تھے اور کسی گروپ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، مولانا آزاد نے فیصلہ کیا کہ:

۱۔ الکشن میں حصہ لینے کے حق میں جو لوگ ہیں وہ الکشن میں حصہ لے سکتے ہیں لیکن وہ کانگریس کا نام اور فنڈ استعمال نہیں کریں گے، اپنے طور پر الکشن لڑیں گے۔

۲۔ جو لوگ الکشن کے حق میں نہیں ہیں وہ فیلڈ میں الکشن لڑنے والوں کی کسی طرح کی مخالفت نہیں کریں گے دونوں فریق اس فیصلہ پر راضی ہوگئے، مسٹر آصف علی اور ڈاکٹر انصاری بھی چاہتے تھے، الکشن میں حصہ لیا گیا، خوش قسمتی سے اس انتخاب کے وقت ہندو مسلم کی فضا میں کوئی تناؤ نہیں تھا، کانگریسی لیگ والوں کو تعاون دے رہے تھے اور لیگ والے کانگریس کے امیدواروں کی مدد کر رہے تھے اور ان کیلئے دورے کر رہے تھے۔

وزارتیں بن گئیں

۱۹۳۷ء کے شروع میں صوبائی مجالس قانون ساز کے انتخابات ختم ہوگئے، صوبوں میں کانگریسی وزارتیں بن گئیں کیونکہ بیشتر صوبوں میں کانگریس والوں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی اور مخالف امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہوگئی تھیں، کانگریسی صوبوں میں دوسری بڑی پارٹی مسلم لیگ تھی، ان صوبوں میں کانگریس نے وزارتوں کی تشکیل میں لیگ سے تعاون حاصل نہیں کیا بالخصوص اتر پردیش میں یہ مناقشہ بہت بڑھا، جس کا نتیجہ بعد میں بہت خراب نکلا، وزارت میں صرف ان لوگوں کو لیا گیا جو کانگریس کے ٹکٹ پر جیت کر آئے تھے لیگ کے ممبران سے

کہا گیا کہ وہ کانگریس کے منشور پر دستخط کر دیں تو ان کو وزارت میں لیا جا سکتا ہے جبکہ ایک اصول پرست کیلئے یہ ممکن نہ تھا، لیگ کا کوئی ممبر اس کیلئے تیار نہیں ہوا اس کا ردِعمل یہ ہوا کہ لیگ نے کانگریسی وزارتوں کو بدنام کرنے کی مہم چلائی، ایک کمیشن نے چھ سات مہینے پورے ملک میں گھوم پھر کر کانگریسی دورِ حکومت کے مظالم پر ایک ضخیم رپورٹ مرتب کر کے شائع کی جسکو ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں "پیر پور رپورٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم اور ہندوستان

کچھ کم و بیش دو ڈھائی سال کے قریب صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں برسرِ اقتدار رہیں ——— یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا پہلی ستمبر کو علی الصباح جرمنی کی فوجوں نے ہٹلر کی قیادت میں پولینڈ پر حملہ کر کے دوسری خوفناک جنگِ عظیم کا آغاز کر دیا جو کم و بیش پانچ سال تک دنیا کو آگ اور خون کی بارش میں نہلاتی رہی، انسانی جانوں کو حشرات الارض سے بھی زیادہ حقیر اور بے وقعت بنا دیا، تخلیقِ آدم سے لیکر ابتک اتنی بڑی اجتماعی تباہی و بربادی اور انسانی جانوں کی ہلاکت چاند سورج نے نہیں دیکھی تھی، خاتمۂ جنگ کے بعد ۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو واشنگٹن سے نقصاناتِ جنگ کی جو تفصیلات شائع ہوئی ہیں ان میں انسانوں کی ہلاکت، بے کار و اپاہج اور خطرناک حد تک زخمی ہونے والوں کی تعداد ساڑھے پانچ کروڑ بتائی گئی ہے۔

مجبور و محکوم ہندوستان جس کا اس جنگ سے کوئی سروکار نہیں تھا اس کے باشندوں نے اپنے انگریز آقاؤں کے نادر شاہی حکم پر ۱۷۹۹۳۵ ایک لاکھ اُناسی ہزار نوسو پینتیس افراد نے برطانوی امپیریلزم کے دیوتا پر اپنی جانوں کی قربانی چڑھائی۔

جرمنی کی فوجیں طوفان کی طرح اُبھریں اور تیز و تند سیلاب کی طرح یورپ پر چھا گئیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ برطانیہ، امریکہ اور روس جو آج دنیا کی سب سے بڑی طاقتیں تسلیم کی جاتی ہیں ان کے اسلحۂ جنگ، فوجی طیارے، بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک، فولاد کے نہیں کاغذ کے بنے ہوئے کھلونے ہیں اور جرمنی کا سرکش اور شریر بچہ غصہ میں ایک ایک کو چور کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور کسی میں بھی یہ ہمت نہیں کہ اس شریر بچے کو اس حرکت سے

روک دے، اس طوفان کے سامنے کسی کے قدم ٹھہرتے ہی نہیں تھے جو سامنے آیا وہ خس و خاشاک کی طرح بہ گیا۔

حکومت نے دستِ سوال پھیلایا

انگریزوں پر جب یہ بُرا وقت آیا تو انھوں نے ہندوستان کو اس کی مرضی کے خلاف اس جنگ میں جھونک دینا چاہا، ۹ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لن لتھگو نے ریڈیو سے ایک طویل تقریر براڈ کاسٹ کی جس میں آپ نے ہندوستان کے عوام کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"حکومتِ برطانیہ اور حکومتِ فرانس نے صاف صاف اعلان کیا تھا کہ اگر پولینڈ پر حملہ کیا گیا تو وہ پولینڈ کی مدد کریں گے، اس لئے اب جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ ہو چکا ہے، ملکِ معظم کی حکومت نے کسی ذاتی غرض کے لئے نہیں جنگ میں شرکت کی ہے، اگر کوئی غرض ہے تو یہی کہ جو اصول بنی نوعِ انسان کیلئے ضروری ہیں ان کی حفاظت کی جائے، تاکہ تہذیب و تمدن ترقی کر سکیں، ملکِ معظم کی حکومت ہر ممکن کوشش کریگی کہ موجودہ سانحۂ عظیم پیش نہ آئے۔"

وائسرائے نے اپنی اس تقریر میں ہندوستان سے ہر طرح کے تعاون کی اپیل کی تھی، مگر یہ بیان وائسریگل لاج میں بیٹھکر مرتب کیا گیا تھا اور براڈ کاسٹ کر دیا گیا تھا، ہندوستان سے استصواب کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی اسلئے کوئی ضروری نہیں تھا کہ پورا ملک اس کی تائید میں اٹھ کھڑا ہو، اب ہندوستان کے عوام کے دل و دماغ میں قومی غیرت و حمیت پھر سے زندہ ہو چکی تھی اور دست بستہ امپریلزم اور سامراج کی بارگاہ میں ان کا حاضر ہو جانا کچھ آسان نہیں تھا۔

اسلئے وائسرائے نے ملک کے ممتاز اور نمایاں لیڈروں سے الگ الگ تبادلۂ خیال کرنا چاہا سب سے پہلے گاندھی جی کو بلایا گیا، انھوں نے ذاتی حیثیت سے گفتگو کی اور کہا کہ کانگریس کی طرف سے اس کی ورکنگ کمیٹی گفتگو کی مجاز ہے اسلئے مجھے حق نہیں کہ میں

اس کی طرف سے کوئی گفتگو کروں اسلئے یہ معاملہ یہیں ختم ہوگیا بات کسی نتیجہ پر نہیں پہونچی کہ ہندوستان جنگ میں انگریزوں کی مدد کرے گا یا نہیں، اب مولانا ابوالکلام آزاد کو بحیثیتِ صدرِ کانگریس دعوت دی گئی، انھوں نے دعوت رد کر دی اور وائسرائے سے ملنے سے انکار کر دیا اور بارگاہِ ناز میں غلامانہ حاضری پر خوددارانہ انکار کو ترجیح دی۔

مسلمانوں کی کیا رائے ہے؟

کانگریس اس جنگ میں انگریزوں کو مدد دے گی یا نہیں؟ یہ بات بعد میں ہوگی پہلے ہم اپنے گھر کا جائزہ لیں کہ مسلمانوں کی اس سلسلہ میں کیا رائے ہے؟ غلام ہندوستان اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کرے یا نہ کرے؟ اب اس کا دوٹوک جواب دینا آسان نہیں رہا کیونکہ مسلمانوں میں دو مکتبۂ فکر پیدا ہو چکے تھے۔ ایک کی نمائندگی لیگ کر رہی تھی اور دوسرے کی جمعیۃ علماء اور دوسری مسلم نیشنلسٹ جماعتیں، مسلم لیگ سے کسی جرأتمندانہ پالیسی کی توقع فضول تھی کیونکہ آج بھی لیگ پر وفادارانِ برطانیہ کا قبضہ تھا اور حکومت نے ۱۹۳۸ء میں لیگ ہی کی حمایت سے مرکزی اسمبلی میں "آرمی بل" پاس کیا تھا اس بل میں کہا گیا تھا کہ فوجی بھرتی کیلئے گورنمنٹ جو صورتیں اختیار کرے اس کی مخالفت قانوناً جرم ہوگی، اور مخالفت کرنے والا مستحقِ سزا ہوگا، مسٹر جناح نے اسمبلی میں اس کی تائید کی تھی اور یہ بل پاس ہوگیا تھا، حکومت نے مسٹر جناح کی تائید کا شکریہ ادا کیا تھا جس جماعت کا یہ کردار رہا ہو اس سے یہ توقع کہ وہ حکومت کی منشا کے خلاف کوئی انقلابی قدم اٹھائے گی دیوانے کا خواب تھا، عملاً لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ایک اہم رکن سر سکندر حیات خاں نے اپنے ایک اخباری بیان میں اعلان کیا کہ:

> "اس وقت حکومت پر وقت آپڑا ہے، میں اپنے تمام پنجابی بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس جنگ میں کسی تعاون سے دریغ نہ کریں"

اسی طرح کے بیانات سر عبدالحلیم غزنوی اور سر محمد یعقوب کی طرف سے بھی شائع ہو چکے تھے البتہ لیگ کی مرکزی قیادت نے اپنی مشروط امداد کا ان الفاظ میں اظہار کیا۔

> "وائسرائے، کانگریسی وزارتوں میں جب تک مسلمانوں کو پورا پورا انصاف

نہیں دلائیں گے مسلم لیگ کی حقیقی اور ٹھوس مدد نہیں مل سکتی،،

یعنی لیگ بھی تعاون کا ارادہ رکھتی ہے اور اس کے لئے ہندوستان کی آزادی کی کوئی شرط نہیں تھی اس کے برعکس کانگریس نے اس جنگ میں حکومت کو تعاون دینے کیلئے اپنی شرائط کا اعلان کیا کہ ہندوستان اس جنگ میں اس وقت شریک ہو سکتا ہے جب :

۱۔ ہندوستان کی آزادی کا اعلان کیا جائے۔
۲۔ آزادیٔ ہند کیلئے بعد از جنگ ایک تاریخ مقرر کی جائے۔
۳۔ سرِدست مرکز میں ایک با اختیار قومی حکومت قائم کی جائے جو آزادی کا پیش خیمہ ہو اور ایفاء وعدہ کی ضمانت بھی۔
۴۔ حقِ رائے دہندگی بالغان کے اصول پر ایک دستور ساز مجلس منتخب کی جائے۔

جمعیۃ علماء کی رائے

مسلمانوں کے ایک مکتبۂ فکر کی رائے آپ کے سامنے آچکی اور اسی ضمن میں کانگریس کی رائے بھی جو سارے ملک کی نمائندگی کی دعویدار ہے، مسلمانوں کے دوسرے مکتبۂ فکر کی نمائندگی جمعیۃ علماء کر رہی تھی اس نے اس سلسلہ میں اپنا نقطہ نگاہ اور اپنی پالیسی کے اظہار کے لئے ۱۶ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ورکنگ کمیٹی میں فیصلہ کیا کہ :

> " جمعیۃ علماء ہند کا نصب العین ہمیشہ سے مکمل آزادی رہا ہے اور وہ اسکو پانا شرعی، سیاسی اور اخلاقی حق سمجھتی ہے اور کوئی چیز جو اس حق کے راستہ میں مزاحم ہو اس کے نزدیک قابلِ برداشت نہیں اس لئے ہم کسی نقطۂ نگاہ سے بہ حالتِ موجودہ جنگ میں برطانوی امپریلزم کی امداد کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں پاتے ہیں، ہم ساری جماعتوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ خود بھی یہی فیصلہ کریں کہ اسی فیصلہ پر ان کی نجات اور آزادی کا حقیقی مدار ہے۔

کانگریسی وزارتوں کا استعفاء

کانگریس اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے شہنشاہِ معظم اور وائسرائے ہند کی اپیلوں کا جواب یہ دیا کہ

اپنی کمیٹیوں میں اپنی پالیسی اور شرائط کا اظہار کر کے اعلان کر دیا کہ اگر ہماری شرائط تسلیم نہیں ہیں تو ہماری کوئی مدد حکومت کو حاصل نہیں ہوگی۔

حکومت جنگ کی مصیبتوں میں گھری ہوئی تھی، اس نے ان بیانات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اسلئے کانگریس نے فیصلہ کر دیا کہ تمام صوبوں کی کانگریسی وزارتیں ۳۱ راکتوبر ۱۹۳۹ء تک مستعفی ہو جائیں اور وزارتیں چھوڑ کر علیحدہ ہو جائیں سب سے پہلے اترپردیش کی وزارت نے استعفا دیا اس کے بعد تمام صوبوں میں وزارتوں نے استعفے دیدیئے۔

مسلم لیگ کی بعض صوبوں میں وزارتیں تھیں، انھوں نے خاموشی اختیار کر لی اور ان صوبوں میں فوجی بھرتی کا بھی سلسلہ جاری رہا اور اربابِ لیگ اس کے لئے اپیلیں بھی کرتے رہے۔

دار و رسن کی آزمائش

فوجی بھرتی کی مخالفت کرنا قانوناً جرم تھا، ۱۹۳۸ء میں آرمی بل پاس ہو چکا تھا، آزادی کا مطالبہ کرنے والوں اور فوجی بھرتی کی مخالفت کرنے والوں کے سروں پر قانون ننگی تلوار کی طرح لٹک رہا تھا کانگریس کے ممتاز لیڈران میں سے کئی ایک گرفتار کر لئے گئے نیشنلسٹ مسلمانوں میں سے بہت سے نمایاں لیڈروں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بھیجدیا گیا، مولانا احمد علی صاحب شیخ التفسیر وصدرِ جمعیۃ علماء پنجاب، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا محمد قاسم شاہجہانپوری مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوری، مولانا شاہد میاں فاخری، مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی ایم ایل اے، مولانا اختر الاسلام مراد آباد) اور دوسرے بہت سے نیشنلسٹ لیڈران جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیئے گئے، مولانا سید محمد میاں کی کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" ضبط کر لی گئی اور مصنف کو جیل میں چکی پیسنے کیلئے بھیج دیا گیا۔

یومِ نجات منایا گیا

کانگریس نے بطورِ احتجاج استعفا دیا تھا، برطانوی حکومت نے نہ ان سے استعفاء طلب کیا تھا نہ اس کی خواہش تھی بلکہ ان کے استعفاء پر حکومت کو ایک گونہ تشویش لاحق ہو گئی تھی اور جس مسئلہ پر استعفاء دیا تھا اس کا تعلق نہ ہندوؤں سے تھا نہ صرف کانگریس پارٹی سے بلکہ پورے ملک کی

حمیت وغیرت اور پورے ملک کے مفاد سے تھا اور حکومت کی اس غلط پالیسی سے تھا جو اس نے ہندوستان کے ساتھ روا رکھی تھی، اور آزادی کی سمت ایک مضبوط قدم تھا، کیونکہ وزارتیں تو انگریزی اقتدار کے تحت تھیں جو غلامی ہی کی ایک شکل تھی، کانگریس اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی منزل اس سے بہت آگے تھی اور اس منزل تک پہونچنے کیلئے انھوں نے وزارتوں سے استعفا دیکر خود کو مصائب کی بھٹی میں ڈالا تھا۔ مگر مسلم لیگ نے کانگریسی وزارتوں کے استعفار پر مسلمانوں سے یومِ نجات منانے کی اپیل کرکے اس نفرت کی آگ کو اور بھڑکا دیا جو ہندو اور مسلمان کے درمیان ایک عرصہ سے سلگنے لگی تھی، لیگ نے یومِ نجات کا پروگرام بناکر فرقہ وارانہ اتحاد کے سارے امکانات کو ختم کردیا کیونکہ ان کو اسی نفرت کی بنیاد پر ایک نئی تعمیر کرنی تھی اور یہ تعمیر اسی وقت ممکن تھی جب ہندو مسلم منافرت پورے عروج پر پہونچ جائے لیگ نے یہ پروگرام بناکر پیر پور رپورٹ سے جن جذبات کو ابھارنا چاہا تھا اس کی تکمیل کردی نیشنلسٹ مسلمانوں کے علاوہ لوگوں نے جو مسٹر جناح کو اپنا قائد تسلیم کرچکے تھے یومِ نجات مناکر مطمئن کردیا کہ اب ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد کی کوئی امکانی شکل باقی نہیں رہی اب دونوں قوموں کے درمیان یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جائے گی۔

مسلم لیگ کا نیا نعرہ

وقت کھسکتا رہا، کلنڈر کے اوراق پلٹتے رہے، یورپ میں جنگ کی آگ بھڑکتی رہی اور تیزی سے تیز تر ہوتی گئی، ہندوستان میں ہنگامہ آرائیوں کا سلسلہ جاری رہا حکومت کے ساتھ تعاون اور عدمِ تعاون کے مسئلہ پر غور کرنے میں ماہ و سال گذرتے رہے حکومت اور ہندوستانی عوام میں رسہ کشی کا سلسلہ جاری رہا کہ سنہ ۱۹۴۰ء آگیا، یہ سال متحدہ ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائیگا کیونکہ اس میں ایک نئے عنوان کا اضافہ ہوا، اسی سال صدیوں کے متحدہ ہندوستان کو جو قدرتی سرحدوں سے گھرا ہوا تھا غیر قدرتی اور مصنوعی سرحدوں میں گھیر کر دو حصوں بلکہ تین حصوں میں منقسم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۲۲ / ۲۳ / ۲۴ / مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ

اجلاس محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا، یہ اجلاس مجمع کے لحاظ سے بہت کامیاب رہا اخبارات کا بیان ہے کہ پچاس ہزار سے زیادہ کی بھیڑ تھی اس اجلاس میں مندرجہ ذیل تجویز منظور ہوئی جس کو تجویزِ پاکستان کہا جاتا ہے جو بعد میں مسلم لیگ کا نصب العین بن گئی:

"مسلم لیگ کی یہ پختہ رائے ہے کہ کوئی دستورِ حکومت بغیر اس کے کہ وہ ذیل کے اصولوں پر مبنی نہ ہو قابلِ عمل ہو سکتا ہے اور نہ مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول

۱۔ یہ کہ جغرافیائی حیثیتوں سے متصل وحدتوں کی ایسے علاقوں میں حد بندی کر دی جائے اور ان میں ضرورت کے مطابق ایسی سرحدی تبدیلیاں کی جائیں کہ وہ رقبے جہاں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہے مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی منطقے ایک مستقل ریاست بن جائیں، اور اس ریاست کے اجزاءِ ترکیبی اندرونی طور پر خود مختار اور مطلق العنان ہوں۔

۲۔ یہ کہ ان علاقوں اور منطقوں کے اجزاءِ ترکیبی میں اقلیتوں کے مذہبی ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، اسلامی اور دوسرے حقوق و مفاد کے تحفظ کیلئے اس میں معقول و موثر اور واجب التعمیل تحفظات درج کئے جائیں، نیز ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی تعداد کم ہے مسلمانوں کے لئے نیز دوسری اقلیتوں کے لئے ایسے معقول، موثر اور واجب التعمیل تحفظات معین طور پر دستور میں شامل کر دیئے جائیں جن سے ان کی مذہبی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی اور دوسرے حقوق و مفاد کی حفاظت ہو جائے۔

۳۔ یہ کہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو اختیار دیتا ہے کہ وہ دستور کی ایک اسکیم مرتب کرے جو ان بنیادی اصولوں پر مبنی ہو اور وہ اس قسم کا ہو کہ اسمیں ایسی گنجائش ہو کہ ان علاقوں کو اس قسم کے اختیارات مل جائیں۔ دفاع، امورِ خارجہ، رسل و رسائل، کروڑگیری، اور نیز ایسے ہی دوسرے امور جو ضروری ہوں"

انقلابات ہیں زمانے کے | تقسیم ملک کا شاخسانہ پیدا کرنے والی تجویزِ پاکستان کے بارے میں بات کرتے ہوئے اندازِ گفتگو ہی بدل گیا، کہنے والوں نے جو کہا وہ تو ہواؤں میں اڑ گیا لکھنے والوں نے جو لکھا وہ آپ کے سامنے پیش ہے:

"ہندوستان کوئی بت نہیں کہ اس کو پوجا جائے، کعبہ نہیں کہ اس کی سمت منہ کرکے مسلمان نماز پڑھتے ہوں، صحیفۂ آسمانی نہیں ہے کہ جسے بغیر وضو ہاتھ نہ لگایا جاسکے، وہ ایک ملک ہے اور اس لئے ہے کہ اس کے بسنے والے چین و آرام سے رہیں یہ چین یہ آرام اگر وحدت سے حاصل ہوتا تو یقیناً مسلمان اس وحدت کو شکستہ نہ کرتے اگر یہ سکھ صرف تقسیم ہی سے حاصل ہو سکتا ہے تو ان کا مطالبہ کانگریس اور حکومت سے صرف ایک ہے اور وہ پاکستان ہے، یعنی تقسیمِ ہند (حیاتِ محمد علی جناح مولفہ رئیس احمد جعفری)

پاکستان کا نعرہ لاہور کی سرزمین سے اٹھا اور چند دنوں میں پورے ہندوستان میں گونج گیا اس کے خلاف جس نے آواز بلند کی اس کا گلا گھونٹ دیا گیا، اس تحریک کے خطرناک عواقب و نتائج کی طرف جس ہاتھ نے اشارہ کیا اُسے کاٹ دیا گیا، جس قلم نے اس کے خلاف لکھنے کی جسارت کی تو وہ قلم ہی نہیں انگلیوں کو بھی تراش لیا گیا جن کی گرفت میں یہ قلم تھا، مدبر علماء و مشائخ نے اس تجویز پر اسلامی ہند کی تباہی کا شکوہ کیا تو ان کی پگڑیوں کو سروں سے اتار کر جوتوں سے روند دیا گیا، نیشنلسٹ رہنماؤں کے گلے میں پرانے جوتوں کے ہار پہنائے گئے، بر ملا گالیاں دی گئیں، ان کی ڈاڑھیوں میں شراب کی بوتلیں انڈیلی گئیں، انکی عبائیں نوچ کر تار تار کر دی گئیں، ان کا چلنا پھرنا دوبھر کر دیا گیا، ان کو ہندوؤں کا زر خرید غلام کہا گیا، ان کو ضمیر فروش کا خطاب دیا گیا، مسلم لیگ کا دفتر دارالافتاء بن گیا، اسلام اور مسلمان کی سند تقسیم کرنے لگا، جو پاکستان کا حامی وہ مسلمان صاحبِ ایمان جو مخالف وہ سب کچھ ہے مگر مسلمان نہیں، مسلم لیگ کے سارے چھوٹے بڑے لیڈر اسلام کے ٹھیکیدار بن گئے اور ہندوستان کے محترم و معزز علماء و مشائخ کو جو پاکستان کو مسلمانوں کے لئے خطرناک

کہتے اور سمجھتے تھے ان کو دین سے خارج کیا گیا، شیخ الہند کو شیخ الہنود، شیخ الاسلام کو شیخ الاصنام کی گالی دی گئی اور ان کے بڑے سے بڑے لیڈر کو شو بوائے کہا گیا اور وہ ساری بدتمیزیاں اور ذلیل حرکتیں کی اور کرائی گئیں جو ایک اخلاق باختہ شخص اپنے ذاتی دشمن کے ساتھ کرسکتا ہے، اس طرح ہندوستان کا مسلمان دو حصوں میں بٹ گیا ایک بڑا حصہ پاکستان کا حامی، لیگ کے سبز ہلالی پرچم کے نیچے، اور دوسرا پاکستان کا مخالف جو اس تجویز پاکستان کو اسلامی ہند کے مسلمانوں کی اجتماعی خودکشی سے تعبیر کرتا رہا۔

ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ۱۹۲۵ء تک جنگِ آزادی کے میدان میں مسلمانوں کی جگہ اگلی صفوں میں تھی، ان کے رہنما قائدانہ رول ادا کر رہے تھے، مسلم لیگ اگرچہ عوام پر ۱۹۳۷ء کے بعد سے اپنا اثر ڈالنے لگی تھی اس کے پہلے تحریکِ خلافت کے دور میں علی برادران کی قدآور شخصیتوں کے نیچے دب کر رہ گئی تھی اور لیگ کا عوام سے براہِ راست واسطہ بھی کم تھا لیکن اب بُرے دن آنے لگے تھے۔ آل پارٹیز لکھنؤ میں متحدہ محاذ بنانے اور متحدہ دستور مرتب کرنے کے موقعہ پر اختلافات پیدا ہوئے اور پھر بتدریج اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی یہاں تک کہ ۱۹۲۹ء میں جب کلکتہ میں آل پارٹیز کی دوسری کانفرنس ہوئی یہ اختلافات بہت بڑھ چکے تھے، لیگ تو روزِ اول سے فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکا کر اپنی قیادت کی دکان چلا رہی تھی اب تحریکِ خلافت کے مجاہدین بھی لیگ کی پھیلائی ہوئی نفرت کے اس دھارے میں بہ گئے جن کے نزدیک فرقہ وارانہ اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے بڑے سے بڑے مسلمان لیڈروں اور عظیم سے عظیم شخصیتوں کو بھی ٹھکرا دینے میں کبھی کوئی تامل نہیں ہوا، انقلابات ہیں زمانے کے،

آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ سے مولانا شوکت علی ناراض ہو کر چلے گئے اور یورپ سے واپسی کے بعد مولانا محمد علی جوہر نے بھی نہرو رپورٹ سے اختلاف کیا اور اختلاف خلوص پر مبنی تھا اور درست بھی تھا مگر بدقسمتی سے وہ مسٹر جناح کی صف میں کھڑے ہو گئے اور انکی حمایت میں بیان دے کر زمامِ قیادت ان کے ہاتھوں میں سونپ دی۔

انڈیا ایکٹ کے تحت صوبوں کو اختیارات دیے جانے کے وقت علی برادران راہیِ

ملک بقا ہو چکے تھے مگر اختلاف کی جو خلیج پڑ چکی تھی لیگ کے لیڈروں نے اُسے روز بروز وسیع کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ تین سالہ کانگریسی دورِ وزارت میں اپنی پوری طاقت اس بات پر صرف کر دی کہ کانگریسی وزارتوں کو مسلمانوں میں بدنام کر دیا جائے اور وزارتوں کے استعفار کے بعد لیگ والوں نے یومِ نجات مناکر اس فرقہ وارانہ اختلاف اور نفرت کو دائمی بنا دیا اور ۱۹۴۰ء میں لاہور کے اجلاس میں تجویزِ پاکستان منظور کر کے مسلمانوں کو دوہرے عذاب میں مبتلا کر دیا۔

ہم کہاں سے کہاں پہونچ گئے

اب ہمیں پوری صفائی کے ساتھ اعتراف کر لینا چاہئے کہ مسلمانوں نے دو صفوں میں منقسم ہو کر اپنی آواز کو غیر موثر بنا لیا اور جنگِ آزادی کا دور ایسے نتائج کا حامل ہو گیا جس کا تصور بھی اس سے پہلے نہیں کیا جا سکتا تھا، مسلمان جنگِ آزادی کے میدان میں جتنا آگے تھا مسلم لیگ نے اس کو اتنا ہی پیچھے ڈھکیل دیا، ۱۹۴۰ء کی تجویزِ پاکستان نے اسلامی ہند کو دو ایسے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا کہ ایک طرف ستر فی صدی عوام تھے اور دوسری طرف صرف تیس فی صدی، اول الذکر کی قیادت مسلم لیگ کر رہی تھی جو سراسر کانگریس بیزاری، ہندو دشمنی، فرقہ وارانہ منافرت اور اشتعال انگیزی کی خوراک پر زندہ تھی، اس نے ہندوستان کی پچاسی فی صد غیر مسلم آبادی کے خلاف محاذِ جنگ کھول دیا، جو لڑائی یہاں کے عوام بلا تفریقِ مذہب و قوم، انگریزی سامراج کے خلاف لڑتے تھے اور مسلمان اس میں قائدانہ رول ادا کر رہا تھا لیگ نے مجاہدینِ آزادی کی اس فوج کو سبز ہلالی پرچم کے نیچے لیکر ان کی لڑائی کا رخ ہندوؤں کی طرف پھیر دیا، جذباتی سیاست اور ہوش سے زیادہ جوش میں مغلوب ہو کر مستقبل کے ہندوستان کی زمین کی ایک ایک انچ زمین کو مسلمانوں کیلئے شعلوں اور انگاروں سے دہکتی اور بھڑکتی ہوئی بھٹی بنا دیا اور پتہ نہیں اس بھٹی میں مسلمانوں کی کتنی نسلوں کو رہنا پڑے گا، ستر فی صدی عوام کی اس بھیڑ کو وہ غیر اخلاقی تربیت دی جانے لگی کہ ۳۰ فی صدی مسلمانوں کا طبقہ جو مستقبل کے ہندوستان کو پیشِ نظر رکھ کر فرقہ وارانہ اتحاد کا داعی تھا اور مشترکہ جہادِ آزادی کا منادی تھا اس کی زندگی کو اپنی

غیر اخلاقی حرکتوں سے اجیرن کر دیا، اس تیس فیصدی میں وہ لوگ تھے جو یا تو براہِ راست کانگریس سے وابستہ تھے جیسے ابوالکلام آزاد، مسٹر آصف علی، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر ذاکر حسین، مسٹر تصدق حسین شیروانی یا جمیعۃ علمار کے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری، مولانا محمد قاسم شاہجہانپوری، مولانا عبدالحلیم صدیقی لکھنوی، مولانا سید محمد میاں وغیرہ یا مجلسِ احرارِ اسلام کے مجاہدین مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، شاہ عطار اللہ بخاری، علامہ انور صابری، مفتی محمد نعیم لدھیانوی، شورش کشمیری یا خدائی خدمتگار کے خان عبدالغفار خان، خان بادشاہ خان یا مسلم مجلس کے خواجہ عبدالمجید یا مومن کانفرنس کے نظام الدین انصاری (الٰہ آباد) یا نیشنل کانفرنس کے شیخ عبداللہ شیرِ کشمیر یا شیعہ پولٹیکل کانفرنس یا پرجا کرشک پارٹی بنگال یا انجمنِ وطن بلوچستان یا مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی بہار کے ذریعہ کانگریس کے قائم کردہ محاذِ جنگ سے انگریزی حکومت سے نبرد آزما تھے۔

مذہبی رہنماؤں کے خلاف محاذ آرائی

نہیں کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی اسکیم کس دماغ کی پیداوار تھی، اس سلسلہ میں کئی نام لیے جاتے ہیں لیکن برطانوی حکومت کی شاطرانہ چالوں کے پیشِ نظر جس نے ہمیشہ ہندو مسلم اختلاف کو بہانہ بنا کر آزادی کے مسئلہ کو ٹالا یہی کہا گیا:

ع ۔ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

نیشنلسٹ مسلمانوں اور ان کے رہنماؤں کی عوام میں بے حد مقبولیت نے حکومتِ برطانیہ کو ہمیشہ لرزہ براندام رکھا ان میں زیادہ تر علمار و مشائخ تھے اور ان کو مذہبی رہنما ہونے کا فخر حاصل تھا وہ اسلام کے محافظ، دین و مذہب کی حفاظت میں اپنے جسم کے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کیلئے ہمیشہ تیار، مخلصانہ جذبات کے حامل، عزم و ارادہ کے پہاڑ، حق و صداقت کے پیکر، جوشِ عمل اور عظمتِ کردار کے امین تھے، ان کی باتوں میں سچائی کی قوت، ان کے قلم میں اخلاص کی طاقت تھی، اس لئے انھوں نے جو فیصلہ کر دیا وہ ہندوستان

کے مسلمانوں کا فیصلہ بن گیا انھوں نے جو فتویٰ صادر کر دیا عوام اس کی تعمیل میں دوڑ پڑے، حکومت کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ مسلم عوام پر ان کے مذہبی رہنماؤں، ان کے علماء و مشائخ کی گرفت بہت مضبوط ہے یہی وجہ ہے کہ جب تک مسلم قیادت ان کے ہاتھوں میں رہی انگریز ہمیشہ سراسیمہ اور ہراساں رہا، انھوں نے تشدد اور عدمِ تشدد کی تفریق نہیں کی ان کے نزدیک جہادِ آزادی کے دونوں راستے تسلیم شدہ تھے اور جانے پہچانے تھے، حضور کی مکی زندگی بھی ان کی نگاہوں کے سامنے تھی اور مدنی زندگی بھی، ظلم کو برداشت کرنے کی بھی قدرت نے ان کو طاقت دی تھی اور اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے، ٹکرا جانے اور لڑ جانے کی طاقتوں سے بھی ان کے سینے معمور تھے، خوف و ہراس نے کبھی ان کا دامن نہیں کھینچا، مصلحت اندیشی کو انھوں نے ہمیشہ بزدلی سے تعبیر کیا، واشگاف لفظوں میں صداقتوں کا اظہار ان کی فطرت تھی، اعلانِ حق، وقت کے فراعنہ و نمارده کے سامنے سچائی کا اعلان کرنے سے وہ کبھی باز نہیں رہے انھوں نے جنگِ آزادی کو حضور کے ارشاد کے مطابق الحربُ خدعۃ کی عینک سے دیکھا اور جب جیسا طریقہ باطل کو شکست دینے اور ظالم کو تباہ و برباد کرنے کا موزوں نظر آیا اس پر عمل کرنے میں تامل نہیں کیا، اسٹیجوں پر آتش نوائی اور شعلہ بیانی کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے اپنے زورِ خطابت سے جہادِ آزادی کے جذبات کی آگ لگا دی اور جب دست بدست جنگ کی نوبت آئی تو انھوں نے بیدریغ تلواریں ہاتھوں میں اٹھالیں، اور آدھی صدی تک ان کی تلواروں کی جھنکار پورے ہندوستان میں سنائی دیتی رہی، آخر آخر میں تحریکِ خلافت جو طوفانِ برق و رعد بن کر آئی تو وہ بھی مذہبی رہنمائی کے لباس میں آئی اس تحریک کو پروان چڑھانے والے سو فیصدی علماء و مشائخ ہی تھے ۔ محمد علی اور شوکت علی عالم نہ ہوتے ہوئے بھی ان کی قدر و قیمت اور ان کی طاقت و قوت میں اضافہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بننے کے بعد ہوا اور پھر اس جوش و خروش کا مظاہرہ ہوا کہ حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ پڑ گیا، اس کے اقتدار کے کنگرے لرزہ براندام ہوگئے، دہلی کے وائسریگل لاج سے لندن کے قصرِ بکنگھم تک خوف و دہشت سے کانپنے اور تھرتھرانے لگے تھے، ہندوستان کی سیاسی

فضا میں آگ کی لپٹ اور شعلوں کی لپک پیدا کرنے کے ذمہ دار مسلمانوں کے صرف مذہبی رہنما ہیں، ان کے علمار و مشائخ کا حلقہ ہے اگر ان کے عوام کو ان کے علمار و مشائخ سے کاٹ دیا جائے تو جوش و خروش کا سرچشمہ ہی خشک ہو جائیگا انگریزوں نے مسلمانوں کی اس قیادت کو کمزور کرنا انتہائی ضروری سمجھا، اپنی طاقت و قوت اور ظلم و تشدد کا مظاہرہ کرکے، کڑی سے کڑی سزائیں دیکر بھی اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس طبقہ کی طاقت کمزور ہونے کے بجائے اور بڑھتی جارہی ہے اور ان کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوتا جارہا ہے علمار و مشائخ کی ہر قربانی ان کو قومی ہیرو بنانے اور انکی عظمت و احترام کو بامِ ثریا تک پہونچانے میں معاون بن جاتی ہے، اسلئے انھوں نے علمار کی اس طاقت کو کچلنے اور ہمیشہ کیلئے مٹادینے میں ناکام ہونے کے بعد بہت غور و فکر کے بعد ایک پالیسی بنائی، انگریز میدان سے ہٹ گئے اور مسلم لیگ کو اس محاذ پر لگادیا اور علمار و مشائخ کی طاقت کو زیرِ زمین دفن کرنے کی ذمہ داری مسلم لیگ کو سپرد کردی گئی اور لیگ نے چند برسوں میں معجزہ دکھا دیا جو کام حکومت پچاس ساٹھ سال کی طویل مدت میں انجام نہ دے سکی مسلم لیگ نے چند برسوں میں اسکو پایۂ تکمیل تک پہونچا دیا۔

مسلم لیگ کا اہم ترین کارنامہ

مجھے اس اعتراف میں کوئی شرم اور جھجک نہیں کہ لیگ نے علمار و مشائخ اور مذہبی رہنماؤں کے اقتدار کو تہس نہس کرنے میں چند سالوں کے اندر جو کامیابی حاصل کی انگریزوں کی حکومت اپنے تمام ساز و سامان کے باوجود پون صدی میں کامیاب نہ ہو سکی تھی مسلم عوام کا علمار و مشائخ سے جو رابطہ تھا انگریزوں نے اس رشتہ کو ہر ممکن طاقت کے ذریعہ توڑنا چاہا مگر کبھی کامیاب نہ ہوئے مگر مسلم لیگ نے چند سالوں میں یہ کارنامہ کرکے دکھا دیا، علمار کا رخ اگر پچھم کیطرف ہے تو مسلم عوام نے اپنا رخ پورب کی طرف کرلیا، وہی عوام جو اپنے مذہبی رہنماؤں کی راہوں میں آنکھیں بچھاتے تھے اپنے پاؤں سے انکی پگڑیاں روندنے لگے کل ان کے جلوس میں پھولوں کی بارش کرنے والے اب بے محابا اور بے تحاشا ان پر پتھر برسانے لگے، یہ وہ حقائق ہیں جن کے تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، مسلم لیگ کی مذہب کے نام پر مذہب

دشمنی کا نتیجہ ہے کہ آج تک مذہبی رہنماؤں کو ذلت و حقارت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہوں میں ان کی حیثیت ایک عجیب الخلقت مخلوق کی ہے جس پر تیرِ ستم کی مشق تو ہو سکتی ہے اُسے اپنا رہنما نہیں بنایا جا سکتا۔

اور جب تک پورے ہندوستان کا مسلمان چالیس سالوں تک خون کے دریا میں نہلایا نہیں گیا اور دہکتے ہوئے شعلوں اور انگاروں پر رکھ کر بھونا نہیں گیا تب تک اسکو ہوش نہیں آیا اور آج دین و مذہب کی طرف جو عوامی رجحان کی ایک جھلک نظر آتی ہے وہ قانونِ فطرت کی پوری پوری سزا بھگت لینے کے بعد قدرت کی طرف سے بطور الطافِ کریمانہ بخشا گیا ہے، خدا کرے یہ دیرپا ہو۔

سنہ ۱۹۴۰ء سے ۱۴ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کی شام تک جو طوفان بدوش اور ہنگامہ خیز لڑائی علماء و مشائخ کے خلاف مسلم لیگ نے چھیڑی تھی آخر تک اس محاذ سے علماء و مشائخ کے اقتدار کے محل پر بمباری کرتے رہے اور ہندوستان کے سرتی صدی عوام کو اس محاذ پر پورے جوش و خروش کی فضا میں لگا دیا اور اس طرح مسلم لیگ نے ان کے اقتدار اور عظمت و احترام کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی اور مذہب و ملت کی گرفت کو خود عوام سے ڈھیلا کرکے ایک بدترین جرم کا ارتکاب کیا اس ذہنی روگ کا خمیازہ مسلم عوام کو بعد میں بھگتنا پڑا اور قدرت کی طرف سے دینی و مذہبی رہنماؤں کے خلاف محاذ آرائی کی وہ عبرتناک سزا ملی جس سے ہر مسلمان کو خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔

آفتاب گہن میں آگیا

سنہ ۱۹۴۰ء کے بعد مسلمانوں کی جدوجہدِ آزادی کی تاریخ میں فرقہ وارانہ منافرت اور محاذ آرائی کے اضافے نے ان کی خدمات کے روشن باب کو دھندلا کر دیا، ان کے کارناموں کی تابناکی ماند پڑگئی، ان کی قیادت و سیادت کا آفتاب گہن میں آگیا اب مسلمانوں ہی کے دو طبقوں میں محاذ آرائی شروع ہو گئی، مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد "پاکستان زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگا رہی تھی، دوسری طرف نیشنلسٹ مسلمانوں کا طبقہ تھا جو پوری دلسوزی اور دردمندی سے اس تحریک کے جلو میں آنے والی تباہیوں اور بربادیوں پر انگلی رکھ رکھ کر اس

طلسمِ سامری میں گرفتار ہونے سے روک رہا تھا اور ان کا دامن پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا تھا مگر ان کی آواز پر کوئی کان دھرنے والا نہیں تھا ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بنکر رہ گئی تھی۔

دلفریب وعدے اور خوشنما نقشے

پاکستان کا نعرہ مقبولِ عوام بن چکا تھا، پاکستان کے بارے میں ایسے ایسے خوشنما وعدے اور دیدہ زیب نقشے پیش کئے جارہے تھے کہ اس میں مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لئے کشش پیدا ہوگئی تھی، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو سمجھایا گیا کہ پاکستان بن جانے کے بعد عہدوں اور ملازمتوں کے سلسلہ میں ہندوؤں سے مقابلہ کا سوال نہیں اسلئے انکو ترقی اور بڑے بڑے عہدوں پر پہونچنے کیلئے میدان کھلا ہوا ملے گا اسلئے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اس طرف جھک گیا جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو لالچ دیا گیا کہ پاکستان کی زمامِ قیادت ان کے ہاتھوں میں ہوگی اور وہ ایک اسلامی حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز ہوں گے، مہاجنوں اور کاروباریوں سے کہا گیا کہ پاکستان میں ٹاٹا، برلا، ڈالمیا، سنگھانیا سے کمپٹیشن اور مقابلہ بازی نہ ہوگی سارے کاروبار پر ان کا بلاشرکتِ غیرے قبضہ ہوگا اسلئے سرمایہ داروں اور پونجی پتیوں کی بھی رال ٹپک پڑی اور وہ پاکستان کو سونے کی چڑیا سمجھ بیٹھا، علماء و مشائخ کا ایک طبقہ جو مسٹر جناح کو اپنا قائد تسلیم کرچکا تھا ان کی سادہ دلی کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ خطاءِ بزرگاں گرفتن خطا است، مگر واقعات وحقائق اور ذاتی تجربات ومشاہدات کو جھٹلانا میرے بس کی بات نہیں، بحث ومباحثہ اور تقریر وتحریر کی انمٹ یادگاریں جو اخباروں، رسالوں اور تاریخوں میں محفوظ ہیں اُن سے آنکھوں کو کیسے بند کیا جاسکتا ہے، میری آنکھوں نے جو دیکھا، میرے کانوں نے جو سنا اور اخباروں میں جو پڑھا ان سے صرفِ نظر کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے میں ان حقائق کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کرنے پر مجبور ہوں، میں نام بنام بتا سکتا ہوں کہ وہ علماء ومشائخ جنھوں نے مسٹر جناح کے دین ودیانت پر آنکھیں بند کرکے اعتماد کیا تھا اور انھوں نے پاکستان کی حمایت میں نیشنلسٹ مسلمانوں اور ان کے رہنماؤں کے خلاف محاذ بنایا تو پورے سات سال تک ہندوستان کے

نیشنلسٹ قائدین اور معزز ترین علماء و مشائخ کے خلاف اپنا رویہ انتہائی جارحانہ رکھا، جن کا متحدہ ہندوستان میں بہت بلند مقام تھا اور پھر جب وہ لوگ پاکستان کو خلافتِ راشدہ سمجھ کر بڑی بیتابی کے ساتھ پاکستان ہجرت کر گئے، انھوں نے سوچا تھا کہ اب اسلام کے نظامِ حکومت کا اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ منصۂ شہود پر آنے کا وقت آگیا ہے، اب علماء کا دورِ اقتدار لوٹ آیا ہے ملا عبدالنبی، ملا عبداللہ سلطانپوری، ملا عبدالقادر بدایونی کی طرح صدر الصدور، مدارالمہام، قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلام کے معزز عہدے ہمارے قدومِ میمنت لزوم کے منتظر ہیں یہ قابلِ قدر جذبہ ضرور تھا لیکن ان کا یہ سمجھنا صرف ان کی سادہ لوحی اور سادہ دلی کے نتیجے میں تھا، جب پاکستان کی سرزمین پر انھوں نے قدم رکھا تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا، کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے افراد، پوری حکومت کو اپنے چنگل میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں اسلام اور مسلمان کا نام وقت کے ساتھ آیا اور وقت کے ساتھ چلا گیا اور یہ حقیقت کھلی کہ

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا"

اسلامی دستور اور قرآنی حکومت قائم کرنے کی بات تو ایک فریب تھی اس اسلامی حکومت کا دستور ایک ہریجن مسٹر منڈل بنائیں گے اب علماء اور مشائخ کی ضرورت نہیں رہ گئی۔

نیشنلسٹ لیڈر شپ

جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا جو اہم رول رہا ہے اب اس کی وہ نوعیت نہیں رہی جو پہلے تھی، متضاد نظریات، مختلف قیادت وسیادت نے کچھ ایسی تقسیم کر دی ہے کہ ایک متحدہ قیادت کی طرح اسکے کارناموں کا تذکرہ کرنا ممکن نہیں رہ گیا، مسلم قائدین دو حصوں میں بٹ کر رہ گئے ہیں ایک بڑا حصہ تقسیم کا راگ الاپنے لگا تھا اور ان کی کوششیں ایک ایسے ملک کے لئے وقف ہو کر رہ گئیں تھیں جو ابھی پردۂ عدم میں ہے، متحدہ آزادی کا کوئی تخیل ان کے ذہن میں نہیں تھا وہ آزادی کا نعرہ نہیں لگاتے تھے وہ حقوق کے بٹوارے کی بات کرتے تھے، ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کی طویل مدت میں کبھی لیگ کے پلیٹ فارم سے آزادی کا مطالبہ نہیں کیا گیا اور نہ انگریزی حکومت سے اظہارِ نفرت وبیزاری کیا گیا بلکہ

سیاسی قیادت کو توڑنے کے لئے حکومت جو کوششیں کرتی تھی اس میں لیگ مدد کرتی رہتی تھی اسلئے آزادئی کامل کی بات تو بہت دور کی بات رہی اسلئے مجاہدینِ آزادی کے تذکرہ یا جنگِ آزادی کی تاریخ میں ان کے قائدین کا ذکر اگر نہ آئے تو کچھ زیادہ ناموزوں نہ ہوگا۔

اب صرف ایک طبقہ رہ جاتا ہے جو اپنی انفرادیت بھی رکھتا ہے جن کا اپنے اسلاف سے ایک مضبوط رشتہ ہے اور ان کی خدمات کا ایک تسلسل ہے اور یہ سلسلہ ماضی میں ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی تک جاتا ہے وہ آج بھی کانگریس کے دوش بہ دوش جنگِ آزادی کے مورچے پر پوری جوانمردی اور بہادری کے ساتھ ڈٹا ہوا تھا، اس کے پائے ثبات میں کبھی جنبش نہیں آئی، یہ ہندوستان کے قوم پرور مسلمان تھے، ان کا اپنا الگ پلیٹ فارم تھا اور اپنا الگ ایک نظام، اپنا طریقۂ فکر تھا لیکن برطانوی سامراج سے ٹکرانے اور آزادی کی جد وجہد میں شانہ بہ شانہ کام کرتے تھے اس نے مکمل آزادی کا نعرہ اس وقت لگایا جب کانگریس کے پلیٹ فارم سے درجۂ نوآبادیات کی بات کیجارہی تھی، اور اس منزل تک کانگریس کو پہونچنے کے لئے دس برسوں کی مدت درکار تھی، انھوں نے ۱۹۲۰ء میں آزادئ کامل کو اپنا نصب العین قرار دیا اور کانگریس نے دسمبر ۱۹۲۹ء میں اس کا اعلان کیا اور مکمل سوراج کو اپنی منزل ٹھہرایا پھر یہ نعرہ ہندوستان کا مشترک نعرہ بن گیا۔

ایک قد آور شخصیت

نیشنلسٹ مسلمانوں کے حلقہ میں ایک ایسی قد آور شخصیت تھی جس کے سامنے سارے سیاستداں بونے معلوم ہوتے تھے سیاست دانی، معاملہ فہمی، نبض شناسی، تدبر وفراست، نکتہ رسی، دوراندیشی اور مصلحت شناسی وہ کون سا جوہر تھا جو مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت میں نہ رہا ہو، علم وفضل خدا داد تھا، مطالعہ اتنا وسیع تھا جیسے ان کا دماغ ایک لائبریری ہو جس میں ہر موضوع پر تحقیقی مواد موجود ہو، تقریر وتحریر دونوں مثالی، ان کا قلم خارا شگاف، دلوں کی دنیا زیر وزبر کرنے والا، جس موضوع پر چل پڑا ملک میں تہلکہ مچادیا، الہلال والبلاغ کے

صفحات جوشِ تحریر اور زورِ بیان کے دہکتے ہوئے انگارے اپنے دامن میں لے کر عوام وخواص کی محفلوں میں آتے تھے تو یہ آگ ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کے سینوں میں دہکنے لگتی تھی اس قلم کی حق گوئی و بیباکی اور جرأتِ نگارش نے انھیں بنگال سے جلاوطن کرایا اور مولانا آزاد کو رانچی کے ایک چھوٹے سے گاؤں کو اپنا مسکن بنانا پڑا ، منبرِ خطابت پر آئے تو سننے والوں کا تاثر تھا کہ جیسے کوئی تیز رو سیلاب گرجتا اُمڈتا مایوسی و شکست خوردگی کے سارے خس وخاشاک کو سمیٹتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے نپے تلے الفاظ ، تیر ونشتر کی طرح تیز و تند جملے ، دلوں میں تہلکہ مچا دینے والا اندازِ بیان ، تسلسل و روانی ، سلاستِ بیان ، جوشِ خطابت کی سحر آفرینی کی وجہ سے کچھ ایسا سماں بندھ جاتا تھا کہ سننے والوں کو اپنے گرد و پیش کا ہوش نہیں رہتا تھا ، پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ اس طرح حل کرتے جیسے اس سے سادہ اور کوئی مسئلہ ہی نہ ہو ، سیاست کے عقدہ لاینحل کو ان کا ناخنِ گرہ کشا اس طرح کھول دیتا تھا جیسے یہ گرہ کوئی گرہ تھی ، یہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد اور اس وقت کانگریس کے مسندِ صدارت پر فائز ، جنھیں نیشنلسٹ مسلمانوں نے مسلمہ طور پر اپنا لیڈر تسلیم کر لیا تھا ، سیاست کے اس بحرانی دور میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے وہی صدر تھے ، انتقالِ اختیارات کی ساری گفتگو میں ان کا کلیدی رول تھا -

جب جنگ کے بادل یورپ پر چھا گئے

جون ۱۹۴۰ء تک جرمنی ، اور اٹلی کی برق رفتار فوجیں دنیا کی کئی سلطنتوں کو تہ و بالا کر چکی تھیں ، طوفان کی طرح ان کی پیش قدمی اور برق آسا حملوں نے بڑے بڑے فوجی کمانڈروں کو حواس باختہ کر رکھا تھا ، ہٹلر اور مسولینی کا نام سن کر یورپین دنیا لرزنے لگی تھی ، دنیا کی طاقتور سے طاقتور حکومت بھی ان کے حملوں سے پناہ مانگ رہی تھی جرمنی کا حملہ شدت اختیار کرتا جا رہا تھا اور پوری دنیا کی چار درجن حکومتیں مل کر اپنی پوری طاقت لگا کر اس کا مقابلہ کر رہی تھیں ، بظاہر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہٹلر اور مسولینی کے سیلاب کے روکنے کی کسی میں طاقت نہیں ہے -

اس صورتِ حال میں اب ہندوستان کے سامنے انگریزوں کی حکومت کے خاتمہ ہی کا مسئلہ نہیں تھا، اب ہندوستان کو یہ بھی سوچنا تھا کہ اگر ہم خاموش تماشائی بن کر بیٹھ رہے تو یہ بھی ممکن ہیکہ انگریز ہندوستان سے بوریہ بستر باندھ کر چلا جائے لیکن ہندوستان کا انجام کیا ہوگا؟ کہیں ایک غلامی سے نکل کر دوسرے آقاؤں کی غلامی کا طوق ہماری گردنوں میں نہ پڑ جائے۔

آقاؤں کی تبدیلی ہمارے مسئلہ کا حل نہیں، ہمیں آزادی چاہیئے ہندوستان اگر مدافعت کیلئے میدان میں نہیں آتا ہے تو یہ خطرہ اور بھی بڑھ سکتا ہے۔ یہی وہ کشمکش کا طوفانی دور ہے جب کانگریس کی صدارت سے مولانا ابوالکلام آزاد پورے ملک کی رہنمائی کر رہے تھے، مولانا آزاد نے ایک سے زائد بار کوشش کی کہ مسلم لیگ کو تیار کرکے مرکز میں ایک مشترکہ گورنمنٹ بنائی جائے لیکن مسٹر جناح نے اس کا جواب اتنا تلخ اور اتنا توہین آمیز دیا کہ مولانا آزاد جیسا عالی ظرف ہی اس کو برداشت کر سکا۔

جب ملک میں بغاوت پھوٹ پڑی

سیاستِ ہند کے یہی لیل و نہار تھے کہ ۱۹۴۲ء آگیا لندن کو ہندوستان کے تعاون کی ضرورت شدید سے شدید تر محسوس ہونے لگی تھی اسلئے ۱۱ر مارچ ۱۹۴۲ء کو وزیرِ اعظم برطانیہ نے اعلان کیا کہ سر اسٹیفورڈ کرپس ہندوستان سے گفتگو کرنے کے لئے ۲۲ر مارچ ۱۹۴۲ء کو ہندوستان جارہے ہیں، پروگرام کے مطابق مسٹر کرپس آئے اور اپنے ساتھ سمجھوتہ کا ایک فارمولہ لیکر آئے جس میں ایک حد تک ہندوستان کے مطالبات کو تسلیم کر لیا گیا تھا، دو ہفتوں تک سر اسٹیفورڈ کرپس وائسرائے ہند، مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس، پنڈت جواہرلال نہرو اور گاندھی جی کے درمیان گفتگو چلتی رہی، کانگریس کا مطالبہ تھا کہ فی الحال با اختیار حکومت بنادی جائے اس کے بغیر ملک رضاکارانہ تعاون کیلئے تیار نہیں ہوسکتا، کرپس کے وعدوں کی تکمیل بعد از جنگ ہونی تھی کانگریس نے کرپس کے فارمولے کو اسی بنیاد پر رد کر دیا۔

کرپس کی ناکامی نے ہندوستان کو اور مشتعل کر دیا، اور ہندوستان کے جوابِ صاف سے حکومت کا رد یہ بھی سخت ہوگیا، اس کا نزلہ سب سے پہلے ۲۵ر جون ۱۹۴۲ء کو قوم پرور

مسلمانوں کے سب سے معزز و محترم رہنما مولانا حسین احمد مدنی پر گرا اور ان کو بچھرایوں ضلع مرادآباد کی ایک تقریر کو بہانہ بنا کر گرفتار کر لیا گیا اور مرادآباد جیل میں بھیج دیا گیا اور اسکے بعد بہت بڑے پیمانے پر گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اور پورے ملک میں کانگریسیوں اور نیشنلسٹ رہنماؤں کی فہرست گرفتاری کیلئے مرتب کر کے پولیس کے حوالے کر دی گئی۔

ہندوستان چھوڑدو

۸ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی اور اس میں فیصلہ کیا گیا کہ انگریزوں کو الٹی میٹم دیدیا جائے کہ بہت جلد ہندوستان چھوڑ دیں، اس فیصلہ کو ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں "کوئٹ انڈیا" کی تحریک کہا جاتا ہے ورکنگ کمیٹی کا یہ فیصلہ درحقیقت اعلانِ بغاوت تھا، حکومت نے ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران کو ۲ بجے شب میں گرفتار کر کے نامعلوم مقام پر بھیج دیا اور ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو پورے ملک میں صوبائی کانگریس کے ارکان، شہر کانگریس کے صدر و سکریٹری اور مسلمانوں میں تمام نیشنلسٹ رہنماؤں اور کارکنوں کو جن کی فہرست پہلے سے تیار تھی اور وارنٹ بنے ہوئے رکھے تھے گرفتار کر لیا گیا اور غیر معین مدت تک کے لئے جیلوں میں بھیج دیا گیا، حکومت کے اس نادر شاہی طرزِ عمل اور مغرورانہ اقدام کی وجہ سے پورا ہندوستان غم و غصہ سے بے قابو ہو گیا اور عوام سروں سے کفن باندھ کر آگ اور خون کی ہولی کھیلنے کیلئے گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آگئے۔

بیک وقت سارے لیڈروں کی گرفتاری کر کے حکومت نے سمجھ لیا کہ حکومت کے خلاف بغاوت کی آگ لگانے والوں کی گرفتاری سے پورے ملک میں مایوسی پھیل جائے گی اور جنگ کے دوران کوئی نیا فتنہ کھڑا نہیں ہوگا، لیکن انگریزوں کی توقعات کے خلاف نتیجہ نکلا پورے ملک میں تشدد و بغاوت کی لہر دوڑ گئی، بغیر کسی پروگرام اور مشورے کے عوام گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آگئے اور انھوں نے اپنے لیڈروں اور رہنماؤں کی گرفتاری کا انتقام اپنی صوابدید کے مطابق لینا شروع کر دیا۔

۹ اگست ۱۹۴۲ء کی صبح شورِ محشر اپنے ساتھ لائی مدراس سے لیکر اُتر پردیش، بہار، بنگال، آسام تک جوشِ انتقام سے بھرے ہوئے عوام کا مجمع جلوس کی شکل میں

شاہراہِ عام پر نکلا بجلی کے پولوں کو توڑ کر پھینک دیا، بجلی کے تاروں کو نوچ نوچ کر ایک طرف ڈال دیا، تھانوں، پولیس چوکیوں اور کوتوالیوں پر حملے کر دیئے، پولیس اور تھانیداروں کی اپنی اپنی صوابدید کے مطابق گوشمالی کی، حکومت کی عمارتوں، تھانوں، کوتوالیوں میں جگہ جگہ آگ لگا دی، بعض مقامات پر پولیس کو بھی اس آگ میں جھونک دیا، حکومت کے دفتروں، آفسوں، عدالتوں، کچہریوں کے کٹہرے، کرسیاں، میز اور دوسرے فرنیچر چکنا چور کر ڈالے سارے ریکارڈ اور فائلوں کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا، ریلوے اسٹیشنوں کو لوٹا توڑا پھوڑا کہیں کہیں عمارت میں آگ لگا دی، مال گاڑیوں کی سیلیں توڑ کر مال و اسباب کو لٹوا دیا کوئی بھی انگریز افسر سامنے آنے کی ہمت نہ کر سکا اور جو سامنے آگیا وہ بخیریت واپس نہیں گیا، ریلوے لائن کی پٹریوں کو میلوں میل اکھیڑ کر پھینک دیا گیا اور ٹرینوں کی آمد و رفت ہفتوں اور مہینوں بند رہی۔

ہم بھی باغی ہیں

اس طرح ہندوستان کے عوام نے اپنے جذبات کا اظہار کرکے اپنے لیڈران سے بے پناہ تعلق و محبت کا اظہار کیا، بغاوت و انقلاب کے اس طوفان میں ہندوستان کے ہر مذہب و ملت اور ہر قوم و نسل کے لوگ برابر کے شریک رہے، مسلم لیگ نے مسلمانوں کو اس تحریک سے علیحدگی کی مسلسل ہدایتیں دیں لیکن اس وقت ان باتوں پر کوئی کان دھرنے والا نہیں تھا اسلئے کانگریس کے لیڈروں کے ساتھ نیشنلسٹ مسلمان رہنماؤں صوبائی اور ضلع کی سطح پر کام کرنے والے بلکہ قصبوں اور گاؤں سے نیشنلسٹ ورکروں کو بڑی تعداد میں گرفتار کرکے جیل بھیجا جا چکا تھا اس طرزِ عمل پر مسلمانوں کو بھی اتنا ہی غصہ تھا جتنا دوسرے برادرانِ وطن کو تھا اسلئے کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس سے علیحدہ رہتا، اور پھر مسلمان قوم تو جذبات و اشتعال کی سیاست کی عادی رہی اور یہ پروگرام اسکے طبعی تقاضوں کے مطابق تھا اسلئے مسلمانوں نے بھی بڑھ کر ان تخریبی کارروائیوں میں بھرپور حصہ لیا۔

انگریزوں پر بم پھینکے گئے

اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کوئٹ انڈیا کے موقعہ پر لوگوں کے کیا جذبات تھے! اور آزادی کی

راہ میں کتنا آگے تک جانے کیلئے تیار تھے؟ اس کا اندازہ جبلپور کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک "کرو یا مرو" کے سلسلہ میں جبلپور نے ایک مثال قائم کی، وہاں کے نوجوانوں نے جس جرأت کا اظہار کیا وہ جبلپور کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ ڈاکٹر رمیش چند مشرا جو خود اس پارٹی میں شریک تھے جس نے بم بنانے اور اس کو استعمال کرنے کا خفیہ منصوبہ بنایا تھا ان کا ایک تفصیلی مضمون بلٹز بمبئی کے یکم نومبر ۱۹۸۱ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے میں انھیں کے الفاظ میں یہ داستان آپ کو سنا رہا ہوں وہ کہتے ہیں کہ:

"ہم چھ ہندو اور دو مسلمان دوستوں نے تہیہ کر لیا کہ خفیہ طور پر بم بنائیں گے اور اس کو انگریزوں کے خلاف استعمال کریں گے، اس کام کے لئے ہم نے محمد علی، طیب علی فرم کے مالک جناب فخرالدین بھائی کے کمرے کو بم بنانے کا کارخانہ بنایا، وہ کمرہ ان کی لائبریری میں تھا۔ شری تیمی چند لکھیم چند کوٹھاری کا مکان بم رکھنے کا گودام بنا ہم لوگوں نے پہلا بم بنا کر ایک خفیہ مقام پر اسکو آزمایا، تجربہ کامیاب رہا۔

اب مسئلہ زیرِ غور آیا کہ انگریزوں کے ٹھکانوں پر بم کیسے پھینکے جائیں؟ اور اُنھیں کس طرح ٹھکانے لگایا جائے؟ ہماری جماعت نے جبل پور کے ایک سینما گھر "ڈیلائٹ ٹاکیز" کا انتخاب کیا جہاں انگریز فوجی جایا کرتے تھے اور ہندوستانیوں کو اس میں جانیکی اجازت نہیں تھی، شام کا وقت تھا، کوئی اچھی انگریزی فلم چل رہی تھی پورا سینما ہال انگریز ٹامیوں سے بھرا ہوا تھا، لیکن سوال یہ تھا کہ ہال میں بم کیسے رکھا جائے؟ ہمارے دوست سلیمان جناح نے کہا یہ کام میں کروں گا، سلیمان جناح خوب گورے چٹے اور انگریزی لباس میں تو وہ پورے انگریز معلوم ہوتے تھے، سینما کا انٹرویل ہوا، جناح ہال سے باہر آئے اور بڑی پھرتی سے وہ شنکرلال وشوکرما سے ٹائمنگ بم

لے کر انٹر ویل ختم ہوتے ہی سینما ہال میں گھس گئے اور اندھیرے میں مدغم ہو گئے، بڑی تیزی اور چالاکی سے بم رکھ کر باہر نکل آئے، اس خفیہ کارروائی سے سب بے خبر تھے لیکن آناً فاناً بازار میں بھاگ دوڑ، پکڑ دھکڑ کا ہنگامہ برپا ہو گیا سینما ہال میں بم پھٹا، زخمی ٹامیوں کو فوجی ہسپتال میں اسٹریچروں پر لے جایا جانے لگا، بڑے بڑے فوجی افسران اس حادثے میں بیکار ہو گئے۔

خفیہ پولیس نے بہت سر مارا مگر یہ جیالے جوان گرفتار نہ کئے جا سکے، شبہہ میں بہت سے بے گناہ لوگ پکڑے گئے کاشی رام مول چند کھنڈیلوال فرم کے سٹری مول چند جی کو اس سازش کا علم تھا، انگریزوں نے انکو گرفتار کیا لیکن انھوں نے ان بہادر نوجوانوں کا نام بھی نہیں لیا جنہوں نے بم رکھا تھا اور چپ چاپ سزا بھگت لی۔

اس طرح جبل پور میں اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک میں سب سے پہلا بم کا دھما کہ جس شخص نے کیا وہ سلیمان جناح تھے، ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں لکھا ہے کہ:

"اس دلیر شخص نے آزادی کے بعد سیاست سے سنیاس ضرور لے لیا ہے لیکن آج بھی بیتے دنوں کی اس یادگار شخصیت سے آپ مل سکتے ہیں، گورکھپور کے پٹرول پمپ میں آج بھی سلیمان جناح صاحب سے مل کر اس واقعہ کی تصدیق کر سکتے ہیں اور ہمارے دوسرے ہمراز ساتھیوں میں بھی ابھی کئی ایک ساتھی ٹھاکر نرنجن سنگھ، جتندر پرشاد مشرا، شمبھو ناتھ کپور، لکھیم چند کوٹھاری، شنکر لال وشوکرما اور بھائی فخرالدین بھی تا دمِ تحریر حیات ہیں جو اس واقعہ کے گواہ ہیں۔"

خونِ شہادت کی سرخی

تقریباً دو ہفتے تک سارا نظامِ حکومت معطل اور درہم برہم تھا، نہ آمد و رفت کے وسائل تھے اور نہ پولیس

اور فوج کے بس کی بات تھی کہ بکھرے ہوئے ہندوستان کو بیک وقت کنٹرول کرتی لیکن دو ہفتوں کے بعد حکومت کے ہوش جب ٹھکانے ہوئے اور اس نے بغاوت کی اس آگ کو فرو کرنے کے اقدامات شروع کئے، فوج کے چھوٹے چھوٹے دستوں کو ٹرکوں سے جیپوں سے اور کہیں کہیں ٹرین کے دو ایک ڈبوں میں بھر کر جہاں تک سوائیاں جا سکتی تھیں حکومت نے بھیجنا شروع کیا۔

فوج نے جہاں مجمع دیکھا، عوام کی بھیڑ نظر آئی رائفل سیدھی کی اور عوام کو بھون کر رکھدیا، اس طرح عوام کے اجتماعی حملے کم ہونا شروع ہوئے اور عوام اپنے حوصلے مٹا کر اپنی آبادیوں میں سمٹ گئے تو ملٹری کے دستے گاؤں گاؤں بھیجے گئے جس آبادی کے بارے میں مقامی پولیس نے بتایا کہ یہ لوگ لوٹ مار، آتش زنی یا ہنگاموں میں شریک تھے اس گاؤں کے معزز آدمیوں کو گرفتار کیا، مارا پیٹا، اور بعض بعض گاؤں کو آگ لگا کر پھونک دیا اور اس وقت تک وہاں ٹھہرے رہے جب تک گاؤں جل کر راکھ نہ ہوگیا اس طرح پولیس کی گولیوں سے مختلف علاقوں میں بہت سے لوگ شہید ہوئے، گورنمنٹ ریکارڈ سے جتنی تفصیل مل سکی ہے وہ آپ کے سامنے پیش ہے۔

شمعِ آزادی کے پروانے

۱۹۴۲ء

عبدالمجید۔

۱۹۲۴ء میں الٰہ آباد میں پیدا ہوا، ۱۸ سال کا نوجوان کالج میں پڑھتا تھا، کوئٹ انڈیا کی تحریک میں حصہ لیا۔ ۱۰ اگست ۱۹۴۲ء میں الٰہ آباد میں ایک فوجی کی گولی سے شہید ہوا۔

عبدالرحیم۔

قصبہ ڈمراؤں ضلع شاہ آباد (بہار) کے رہنے والے تھے، والد کا نام عبدالکریم تھا اگست ۱۹۴۲ء کی کوئٹ انڈیا تحریک میں سرگرم حصہ لیا، پولیس نے گرفتار کیا اور انتہائی بے رحمی سے مارا پیٹا اور پھر جیل بھیج دیا، صورتِ حال زیادہ خراب ہوگئی تو جیل کے ہسپتال میں داخل کر دیا لیکن چوٹوں کی تاب نہ لاکر ابتداءِ ۱۹۴۳ء جیل ہی میں انتقال کیا۔

عبدالشکور۔

گیارہ سال کا نوعمر بچہ تھا، ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوا، والد کا نام پنجو شکور تھا، کاشی پور بنگرا ضلع دربھنگہ (بہار) کا رہنے والا تھا ایک اسکول میں پڑھتا تھا کوئٹ انڈیا اگست ۱۹۴۲ء میں نکلنے والے ایک جلوس میں شریک رہا ایک فوجی دستے نے اس جلوس پر اندھا دھند فائرنگ کی جس سے سمستی پور میں ۱۵ اگست ۱۹۴۲ء کو یہ معصوم بچہ اپنے وطن پر قربان ہوگیا۔

شیخ علاءالدین۔

باریسال ضلع مدناپور مشرقی بنگال کے رہنے والے تھے اگست ۱۹۴۲ء کی کوئٹ انڈیا

تحریک میں سرگرم حصہ لیا، پولیس نے گرفتار کیا اور ان کے ساتھ بہت بے رحمانہ سلوک کیا جس کے نتیجہ میں بمشکل دس مہینے جیل میں زندہ رہ سکے ہسپتال میں داخل ہوئے لیکن زخموں اور چوٹوں کیوجہ سے مدنا پور جیل میں آغازِ ۱۹۴۳ء میں انتقال ہوا۔

شیخ علاء الدین۔

۱۹۱۲ء میں محمد پور ضلع مدنا پور (بنگال) میں پیدا ہوئے اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کوئٹ انڈیا میں سرگرم حصہ لیا اور تندی گرام تھانے پر مظاہرہ کرنے والے جلوس کی قیادت کی، پولیس نے جلوس پر فائرنگ کی، اسی فائرنگ میں آپ کو بھی گولی لگی اور موقعہ ہی پر شہید ہو گئے۔

محمد حنیف۔

موضع گرہا ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام شیر علی تھا جو خیاطی کا کام کرتے تھے، اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک "ہندوستان چھوڑو" میں سرگرم حصہ لیا اور مدھون تھانے پر جس ہجوم نے حملہ کیا تھا اور تھانے کو پھونکا اور جلایا تھا اس میں شریک تھے، پولیس نے حملہ کرنے والوں پر گولیاں چلائیں اور پولیس کی گولی سے موقعہ ہی پر انتقال کیا۔

محمد ہاشم۔

۱۹۲۲ء میں ناگپور (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے، اگست ۱۹۴۲ء کی کوئٹ انڈیا تحریک میں شریک ہوئے اور جلوس میں حصہ لیا ناگپور میں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

حاتم علی۔

کوئیلوار ضلع شاہ آباد (بہار) کے رہنے والے تھے، والد کا نام قاسم علی تھا، کھادی بھنڈار میں ملازمت کرتے تھے جو موضع سکری ضلع دربھنگہ (بہار) میں تھا، اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کوئٹ انڈیا میں سرگرم حصہ لیا اور ۲۰ راگست ۱۹۴۲ء کو دکان ہی میں ایک فوجی نے گولی مار دی اور وہیں شہید ہو گئے۔

محمد ادریس۔

موضع آدا پور ضلع مظفر پور (بہار) کے رہنے والے تھے، والد کا نام نور محمد تھا۔

اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کوئٹ انڈیا میں حصہ لیا اور باج پٹی ریلوے اسٹیشن پر پولیس نے گولی ماری اور ریلوے پلیٹ فارم پر جان جاں آفریں کو سپرد کر دی۔

محمد اسحاق۔

دھمیشوری ضلع پورنیہ (بہار) کے رہنے والے تھے، والد کا نام زینل تھا، دھمدہا پولیس اسٹیشن پر مظاہرے کے دوران ۲۵ ر اگست ۱۹۴۲ء کو پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

محمد اسمٰعیل۔

قصبہ ضلع پٹنہ (بہار) کے رہنے والے تھے، والد کا نام امام بخش تھا، اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کوئٹ انڈیا میں سرگرمی سے حصہ لیا اور منتر تالاب پر ہونے والی پولیس فائرنگ میں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

جناب میاں۔

بارہ ماسی گاؤں ضلع بھاگل پور (بہار) کے رہنے والے تھے، شیر ماری ہاٹ میں اگست ۱۹۴۲ء میں پولیس نے مظاہرین پر گولی چلائی، وہیں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

کبیر اشرفی۔

کبیر اشرفی کوکا شاہ کے لڑکے تھے، تجارت کرتے تھے، دیوگھر ضلع سنتھال (اڑیسہ) کے رہنے والے تھے اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کوئٹ انڈیا میں حصہ لیا پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

میر عبداللہ۔

پوکھریا ضلع دربھنگہ (بہار) کے رہنے والے تھے، سمستی پور (بہار) میں ۱۵ اگست ۱۹۴۲ء کو ہونے والے مظاہرہ اور جلوس میں حصہ لیا، ملٹری کے ایک دستہ نے جلوس پر فائرنگ کی اسی فائرنگ میں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

محمد مسلم۔

آدا پور ضلع مظفر پور (بہار) کے رہنے والے تھے، والد کا نام شیخ فخر الدین تھا، اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کوئٹ انڈیا میں حصہ لیا، باج پٹی ریلوے اسٹیشن پر حملہ

کرنیوالے جلوس میں شامل تھے، وہیں پولیس کی گولی سے ریلوے پلیٹ فارم پر شہید ہوئے۔

رفیق میاں ظفر میاں۔

۱۹۱۲ء میں ناگپور (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے، والد کا نام محمد تھا، اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کوئٹ انڈیا میں حصہ لیا اور ۱۵/ اگست ۱۹۴۲ء کو ناگپور میں مظاہرہ اور جلوس میں شرکت کی، پولیس فائرنگ میں شدید زخمی ہوئے گھر اٹھا کر لائے گئے اور اسی دن انتقال کیا۔

نواب رشید خان۔

احمد پور ضلع وار دھا (مہاراشٹر) کے رہنے والے تھے، ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے والد کا نام شہادت خان تھا اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کوئٹ انڈیا میں حصہ لیا اور ۱۶/ اگست ۱۹۴۲ء کو آشٹی پولیس اسٹیشن پر حملہ کرنے والے جلوس کی قیادت کی، پولیس نے جلوس پر فائرنگ کی، وہیں تھانے پر پولیس کی گولی لگی اور شہید ہو گئے۔

سید عرف چھوٹو۔

ناگپور (مہاراشٹر) میں ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے، اگست ۱۹۴۲ء کی کوئٹ انڈیا تحریک میں ۱۲/ اگست کو ناگپور میں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

شیخ محمد حنیف۔

ڈاکا چین پور ضلع چمپارن (بہار) کے رہنے والے تھے، اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کوئٹ انڈیا میں سرگرمی سے حصہ لیا مگر بروقت گرفتار نہ ہو سکے، ۱۹۴۳ء میں پولیس نے گرفتار کر کے جیل بھیجدیا، پولیس نے بڑی بے رحمی سے پیٹا، زخموں اور چوٹوں کی تاب نہ لا کر بھاگل پور جیل میں ۱۹۴۶ء میں انتقال کیا۔

شیخ محمد عثمان۔

کمگاؤں ضلع ناگپور (مہاراشٹر) کے رہنے والے تھے، ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے انکے والد کا نام شیخ محمد یعقوب تھا، اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کوئٹ انڈیا میں سرگرمی سے حصہ لیا اور ۱۴/ اگست ۱۹۴۲ء کو ناگپور میں ہونے والے مظاہرہ اور جلوس میں شرکت کی اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

شیخ دھنک۔

موضع سہرسا ضلع مونگیر (بہار) کے رہنے والے تھے اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک "ہندوستان چھوڑو" میں عملی حصہ لیا ایک دن جب وہ اپنے فارم پر تھے گشت کرنیوالے ایک فوجی دستہ کے سپاہی نے گولی ماردی اور شہید ہوگئے۔

محمد صدیق۔

شولاپور ضلع مظفرپور (بہار) میں پیدا ہوئے، اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کوئٹ انڈیا میں حصہ لیا اور باج پٹی ریلوے اسٹیشن پر ملٹری کی گولی سے مارے گئے۔

سلطان خان۔

بھیکم پور ضلع اٹاوہ (یوپی) کے رہنے والے تھے ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے والد کانام تاج خان تھا اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کوئٹ انڈیا میں حصہ لیا اور ۱۲راگست ۱۹۴۲ء کو اوریا کے مظاہرہ میں شریک ہوئے، اور وہیں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

مولوی تجمل حسین۔

خواجہ سرائے ضلع سارن (بہار) میں پیدا ہوئے اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا اور سون پور ریلوے اسٹیشن پر حملہ کرنے والے جلوس میں شرکت کی اور وہیں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

ابوبکر۔

مالابار کسان تحریک کے ہیرو اور ممتاز لیڈر تھے، اپنی انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا، عدالت نے پھانسی کا فیصلہ سنایا، ۱۹رمارچ ۱۹۴۳ء کو تحریکِ آزادی میں رہنمائی وقیادت کے جرم میں پھانسی کے تختہ پر چڑھائے گئے۔

محمد امین۔

پنجاب کے رہنے والے تھے کھڑکپور ٹریڈ یونین ورکرس کے ساتھ آپنے جدوجہدِ آزادی میں سرگرم حصہ لیا، پولیس ان کی تلاش میں سرگرداں تھی، اتفاق سے ۱۹۴۰ء میں گرفتار ہوگئے اور جیل بھیج دیئے گئے، اور جیل سے پھر نکلنا نصیب نہیں ہوا جیل ہی میں

جان جان آفریں کو سپرد کر دی۔

محمد یوسف۔

بندرگاہ کے مزدوروں کے ہر دلعزیز لیڈر تھے، انتھک جد و جہد کرنے والے اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا شب و روز کی دوڑ دھوپ، ذہنی و جسمانی مسلسل محنت کی وجہ سے دق ہو گئی اور ان کی سیاسی مصروفیتوں نے ان کی جان ہی لے لی اور شمعِ آزادی پر پروانہ وار فدا ہو گئے۔

غلام شریف۔

چٹا گانگ میں گودی مزدور تھے، ڈاک مزدور یونین (گودی) کی تنظیم میں بھرپور حصہ لیا بلکہ یہ تنظیم انھیں کی کوششوں سے وجود میں آئی ۸ رمئی ۱۹۴۲ء کو جاپان کی بمباری میں ہلاک ہو گئے۔

امتیاز خان۔

پنجاب کے رہنے والے تھے، بمبئی گودی مزدوروں کے ساتھ کام کرتے تھے، ۱۹۴۲ء میں گودی مزدوروں کی اسٹرائک کی رہنمائی کی اسی قیادت کے موقعہ پر برطانوی افسران کی ایما پر ان کو غنڈوں نے قتل کر دیا۔

ضمیر الدین۔

کمیونسٹ پارٹی کی ملیشیا ٹریڈ یونین سے وابستہ تھے، کشتیا ٹیکسٹائل ورکرس یونین میں کام کرتے تھے، مل میں ہونے والی اسٹرائک کی جب انھوں نے رہنمائی کی تو مل کی انتظامیہ کی طرف سے ان پر حملہ کرا دیا گیا، جس سے بری طرح زخمی ہوئے، مرنے کے وقت ان کی زبان پر تھا دوستو میں کسی پچھتاوے کے ساتھ نہیں مر رہا ہوں، مجھے یقین ہے کہ مزدوروں کی جد وجہد کامیاب ہوگی اور ہم کو لوٹنے والوں کا ایک دن قلع قمع ہوگا، چوٹیں بہت شدید تھیں اسلئے چند ہی دنوں کے بعد انتقال کر گئے۔

قدم رسول۔

قدم رسول گیس ورکر تھے، بڑے جری اور جنگجو سیاسی کارکن تھے ۱۱ فروری ۱۹۴۶ء

انڈین نیشنل آرمی سے وابستہ ہو گئے، ہندوستان کی برطانوی فوج کے خلاف جد وجہد کرتے ہوئے کلکتہ میں پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

محمد حارث۔

کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے۔ بیڑی مزدور یونین کے لیڈر تھے، جمشید پور (بہار) کے مشہور قومی کارکن تھے پولیس ہمیشہ ان کی تاک میں رہتی تھی وہ انڈر گراؤنڈ کام کرتے تھے اپنی روپوشی کی زندگی ہی میں ۲ر ستمبر ۱۹۴۲ء کو انتقال کر گئے۔

پاپا میاں۔

موتی مِل میں بنائی کا کام کرتے تھے، اسی مِل کے انگریز بنائی ماسٹر کے قتل کا ان پر الزام تھا عدالت میں ان پر قتل کا مقدمہ چلایا گیا اور ۱۸ر مارچ ۱۹۲۷ء کو پھانسی دی گئی۔

شمس الدین۔

آپ ضلع میمن سنگھ (بنگال) کے رہنے والے تھے، آپ کا شمار سی۔ بی۔ آئی کی خفیہ تنظیم کرنے والوں میں تھا، انتھک محنت، ناقص غذائیت کی وجہ سے ٹی۔ بی ہو گئی اسی بیماری میں قومی کام کرتے ہوئے راہیِ ملکِ بقا ہو گئے۔

یعقوب علی۔

آپ ٹیپرا کے رہنے والے تھے۔ کسانوں کی تنظیم میں آپ کا بہت بڑا ہاتھ تھا بے انتہا قومی مصروفیتوں اور سرگرمیوں کی وجہ سے دق ہو گئی اور بڑی بیکسی کی زندگی گذار کر وطن کی آزادی پر قربان ہو گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد۔

ہندوستان اور کانگریس کے مایہ ناز لیڈر، آل انڈیا کانگریس کے ایک سے زائد بار صدر رہ چکے ہیں، کانگریس میں آپ کے مشوروں کی بڑی اہمیت تھی، تدبر و فراست میں لاثانی تھے ذہانت و فطانت خداداد، تقریر و تحریر دونوں مملکتوں کے بے تاج کے بادشاہ، علم عطیۂ خداوندی، محیر العقول صلاحیتوں کے مالک، مفسر، محدث، مؤرخ، محقق، بالغ نظر سیاستداں وہ کیا کچھ نہیں تھے، الہلال والبلاغ کے مدیرِ محترم، قلم سے انگریزی اقتدار

کے محل پر شعلہ باری کرنے والے، زبان سے برطانوی سامراج کے قلعہ پر انگارے برسانے والے وہ کیا کچھ نہیں تھے، پوری زندگی انگریزی حکومت واقتدار کے خلاف جہادِ عظیم میں گذری ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک مسلسل آپ آل انڈیا کانگریس کے صدر رہے آپ ہی کے زمانۂ صدارت میں انگریزوں سے انتقالِ اختیارات کے مسائل طے کئے گئے، شملہ کانفرنس کے ہیرو رہے، آزادی کے بعد نو برس مرکز میں وزیرِ تعلیم رہے، بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، ترجمان القرآن ان کی بے مثال تفسیر ہے ۱۹۵۷ء میں دہلی میں انتقال ہوا اور دہلی جامع مسجد کے سامنے پارک میں دفن کئے گئے قبر پر سفید چھتری بنی ہوئی ہے، ان کی وفات سے ہندوستان کی تاریخ کا روشن وتابناک باب ختم ہوگیا، آخری دور میں ہندوستان اور جنگِ آزادی کی معرکۃ الآرا تاریخ انگریزی زبان میں "انڈیا وینس فریڈم" (ہندوستان نے آزادی جیت لی) کے نام سے لکھی جس کے انگریزی اور اردو ایڈیشن دونوں شائع ہو چکے ہیں اس کتاب کے ۳۰ صفحات آپ نے کلکتہ کے ایک بینک کے لاکر میں اس شرط کے ساتھ رکھے کہ ۳۰ سال بعد اس کی اشاعت کیجائیگی تادمِ تحریر وہ ۳۰ صفحات شائع نہیں ہو سکے ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر۔

خلافت کمیٹی کے بانی مسلمہ مسلم لیڈر، جرأتِ حق اور بے باکی کے مثالی کردار، انگریزی ادب وانشاء کے ماہرِ کامل، انگریزی میں کامریڈ، نکالا جو اپنی ٹکسالی زبان کی وجہ سے انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے والے حلقہ میں عزت واحترام اور ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا، خلافت کے دور میں وہ ہندوستان کی سیاست پر چھائے ہوئے تھے، ۱۹۲۹ء میں نہرو رپورٹ پر اختلاف کرکے لیگ کے موید ہوگئے۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس لندن میں شرکت کے لئے گئے اور وہیں انتقال کیا حکومت نے اپنے خرچ پر انکی لاش کو بیت المقدس بھیجا، اسی مقدس سرزمین میں آسودۂ خواب ہیں۔

مولانا شوکت علی۔

مولانا محمد علی جوہر کے بڑے بھائی تھے، پیدائش رام پور میں ہوئی، پوری خلافت

تحریک میں ساتھ ساتھ رہے انھیں دونوں بھائیوں کو ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں علی برادران کہا جاتا ہے۔ بہترین مقرر، وجیہ و شکیل، قد آور بھاری بھرکم شخصیت کے مالک، خدامِ کعبہ کے نام سے ایک تنظیم بنائی تھی، دونوں بھائی بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

مولانا حسرت موہانی۔

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے تعلیم یافتہ، اردو کے مشہور شاعر، کانپور میں رہتے تھے، انتہائی مخلص، ساری زندگی عسرت و افلاس میں بسر کی، حق بات کہنے میں بہت جری تھے نہرو رپورٹ سے انھوں نے صرف اسلئے اختلاف کیا کہ اس میں اپنا نصب العین مکمل آزادی نہیں رکھا گیا تھا۔ "اردوئے معلیٰ" کے نام سے اردو کا ایک معیاری رسالہ نکالا جو بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا، اور پڑھا جاتا تھا، اردو شاعری کے مسلمہ استاد تھے ان کی شاعری پر ریسرچ اسکالروں نے تھیسس لکھکر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے ان کا یہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے اور ہر شخص کی زبان پر رہتا ہے یہ شعر اس وقت کہا تھا جب وہ انگریزی حکومت کی جیل میں تھے۔

اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مصیبت بھی

تصدق حسین شروانی۔

قوم پرور لیڈروں میں ایک ممتاز مقام کے مالک تھے علی گڈھ کے رہنے والے تھے مولانا آزاد سے قریب تھے نہرو رپورٹ رد کرنے والوں میں مولانا آزاد مفتی کفایت اللہ صاحب اور دوسرے نیشنلسٹ لیڈروں کے ساتھ تھے، فرقہ وارانہ سیاست سے دور تھے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی۔

مولانا عبد القادر لدھیانوی کے خلفِ ارشد تھے یہ وہی مولانا عبد القادر ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ایک فتویٰ شرکتِ کانگریس کے سلسلہ میں مرتب کر کے کئی سو علماء کے دستخط کے ساتھ شائع کیا تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے

مجلسِ احرارِ اسلام کے بلند پایہ لیڈر، بہت پرجوش اور گرم تقریریں کرتے تھے انگریزوں کے خلاف جب مسلمانوں کو للکارتے تھے تو بزدل سے بزدل مسلمان کو بھی ایک بار جھرجھری آجاتی تھی اور اس کے سینے میں جرأت وہمت کروٹیں لینے لگتی تھی، لدھیانہ آپ کا آبائی وطن تھا امرتسر میں سکونت پذیر تھے ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے بعد جب فسادات پھوٹ پڑے تو آپ دہلی آگئے اور یہیں ساری زندگی بسر کرکے ربِ حقیقی سے جاملے ان کے صاحبزادے عزیزالرحمٰن جامعی سیاسی کارکن ہیں انھوں نے اپنے والدِ محترم کے حالاتِ زندگی پر ایک تفصیلی کتاب بھی لکھی ہے۔

مولانا سید محمد میاں۔

دیوبند کے رہنے والے، مرادآباد کو وطنِ ثانی بنالیا تھا جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد میں حدیث کے استاذ تھے، "علماء ہند کا شاندار ماضی"، پانچ جلدوں میں، علماءِ حق دو جلدوں میں، سیر وسوانح پر عہدزریں "اسیرِ مالٹا" "تحریکِ شیخ الہند"، بچوں کے نصاب کی کتابیں "تاریخِ اسلام" کے نام سے اور دوسری کتابوں کے مصنف ہیں آپ اردو کے طرزِ خاص کے مالک ہیں، شاندار ماضی کا چوتھا حصہ حکومت نے ضبط کرلیا اور آپ پر مقدمہ چلایا گیا، سزا بھی ہوئی صوبائی جمعیۃ کے ناظمِ اعلیٰ رہے بعد میں مرکزی جمعیۃ علماء کے ناظمِ عمومی ہوگئے تھے انگریزوں سے ازلی بیر رکھتے تھے نان کوآپریشن کی تحریک میں ایک ڈکٹیٹر آپ بھی تھے، دہلی جاکر گرفتاری دی تھی، کئی بار برطانوی جیلوں کی سیر کی، آخرِ عمر میں مرادآباد سے دہلی منتقل ہوگئے اور مدرسہ امینیہ دہلی میں شیخ الحدیث رہے، دہلی ہی میں ۱۹۷۵ء میں انتقال فرمایا۔

مولانا مفتی کفایت اللہ۔

خلافت تحریک سے آپ کی سیاسی زندگی شروع ہوئی جمعیۃ علماء ہند کے قیام سے ۱۹۴۰ء تک مسلسل بیس سال تک آپ اس کے صدر رہے، فقہ وفتاویٰ میں ہندوپاک میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا اپنے وقت کے امام تھے تدبر وفراست بے مثال تھی تعلیم الاسلام بچوں کے لئے بہترین کتاب مرتب فرمائی اور بیشتر مدارس میں بچوں کے نصاب میں شامل ہے، مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث صدر المدرسین بلکہ اس کے روحِ رواں تھے،

دہلی میں انتقال کیا مہرولی میں ظفر محل میں دروازے کے پاس دفن ہوئے مزار پر کتبہ لگا ہوا ہے

مولانا احمد سعید دہلوی ۔

جمعیۃ علمار ہند کے ہمیشہ ناظم رہے، سیرتِ نبوی کے موضوع پر دہلی کی ٹکسالی زبان میں انتہائی موثر تقریر فرماتے تھے، انگریزوں کے خلاف ساری زندگی جدوجہد کرتے رہے اعظم گڈھ میں حکومت کے خلاف ایک تقریر کرنے پر آپ پر مقدمہ چلایا گیا اور آپ جیل بھیج دیے گئے، اعظم گڈھ کی جیل میں آپ نے دو کتابیں لکھیں جنت کی کنجی اور دوزخ کا کھٹکا آپنے قرآنِ پاک کی اردو میں ایک تفسیر بھی لکھی ہے جو دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے پوری زندگی سرگرم سیاست میں حصہ لیتے رہے، کئی بار جیل گئے، آزادی کے فوراً بعد دہلی میں جو قتل دغارتگری مچی تھی اس میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا احمد سعید اور دوسرے بعض بزرگوں نے مثالی کارنامہ انجام دیا، ہندوستان میں مسلمانوں کے استقلال میں ان بزرگوں کا زبردست ہاتھ ہے مسلمان ان کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتے آزادی کے بعد دہلی میں انتقال ہوا اور اسی سرزمین میں آسودۂ خواب ہیں۔

مولانا عبد الحلیم صدیقی ۔

مولانا عبد الحلیم صدیقی لکھنوی ملیح آباد ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے عربی کے بہترین ادیب تھے جمعیۃ علمار ہند کی ہائی کمان میں شامل رہے، بہترین مقرر تھے درس و تدریس مشغلہ تھا، نان کوآپریشن کے علاوہ بھی کئی بار جیل گئے، اور مشقتیں اٹھائیں، سیاسی مصروفیتوں کی وجہ سے کوئی مستقل ذریعۂ معاش اختیار نہ کرسکے، ساری زندگی عسرت و تنگ دستی میں بسر ہوئی، مگر وضعداری ہر حال میں برقرار رکھی اسی حال میں اس خاکدانِ ارضی سے سفرِ آخرت پر چلے گئے۔

عطاء اللہ شاہ بخاری ۔

مجلسِ احرارِ اسلام کے قابلِ فخر اور مایۂ ناز لیڈر، امیرِ شریعت پنجاب، سحر البیان مقرر، خطابت کے جادوگر، مخالف سے مخالف مجمع میں اپنی بات منوالینے میں انکو

کمال حاصل تھا، کئی کئی گھنٹے مسلسل تقریر کرتے اور مجمع یہ محسوس کرتا کہ ابھی کچھ دیر نہیں ہوئی، کھدر کی شلوار اور لمبی قمیص زیبِ بدن رہتی، ہاتھ میں تلوار کا سہارا لیکر اور اسٹیج پر چل پھر کر اس طرح تقریر کرتے جیسے کوئی سپہ سالار اپنی فوج کے سامنے جوش و جذبہ دلانے کے لئے گرم تقریر کر رہا ہو، قرآنِ پاک بہت ہی مسحور کن آواز میں پڑھتے، اور جب قرآت کرتے تو ایسا سناٹا چھا جاتا جیسے سانسوں کی بھی آواز نہیں سنائی دے رہی ہے اُردو کے اشعار برمحل اپنے مخصوص ترنم سے پڑھتے تھے، برطانوی سامراج کی طرف جب روئے سخن ہوجاتا تھا تو زورِ بیان اور جوشِ خطابت دیکھنے اور سننے کی چیز ہوجاتی تھی کئی بار ان کی تقریروں کے سننے کی راقم الحروف کو سعادت حاصل ہوئی اور کبھی تسلی نہیں ہوئی ہر بار یہی جی چاہتا رہا کہ شاہ صاحب کچھ دیر اور بولتے، لوگ بیتابانہ ان کی تقریروں کیلئے دوڑے آتے تھے، جیل جانا ان کی زندگی کا گویا ایک مشن بن گیا تھا نہ جانے کتنی جیلوں کے در و دیوار ان کی پُرسوز تلاوتِ قرآن سے معمور ہوں گے اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء تک تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے مگر آزادی کے بعد اپنے وطن کو چھوڑ نہ سکے ساری زندگی اپنے وطن ہی میں گذاری وہیں انتقال ہوا۔

علامہ انور صابری۔

مجلسِ احرارِ اسلام نے پُرجوش اور شعلہ بیان مقرروں کی جو ٹیم بنائی تھی اسی میں علامہ انور صابری بھی شامل تھے، اس زمانے میں آپکا لباس شاہ عطار اللہ بخاری کی طرح کھدر کی شلوار اور قمیص تھا آپ کی شہرت آپ کی انقلابی شاعری کی وجہ سے مزید بڑھ گئی انھوں نے جہادِ آزادی میں اپنی شاعری سے تلوار کا کام لیا ہے، متعدد نظموں کی بنا پر انگریزی حکومت کی طرف سے انکو قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں کئی بار جیل گئے، ملکۂ شاعری خداداد تھا بدیہہ گوئی آپکا وصفِ خاص تھا، جب بھی کسی موقعہ پر کسی نظم کی فرمائش کی گئی تو کاتب قلم کاغذ لیکر بیٹھ گیا اور علامہ نے ایک سگریٹ ختم کرتے کرتے پوری نظم لکھوادی۔ نظم میں مرصع زبان و بیان کی چاشنی موجود، لب و لہجہ کا تیکھا پن سلاست و برجستگی، ایک نظم کے جتنے ضروری اجزا ہیں وہ سب کے سب اپنی پوری رعنائی و شادابی

کے ساتھ موجود ہیں، آزادی کے بعد سیاست سے سنیاس لے لیا تھا، فقیرانہ وضع قطع کے ساتھ مسجد کے ایک حجرے میں دہلی میں قیام پذیر تھے، چوبیس گھنٹے سگریٹ پھونکتے رہتے تھے، بدن بھاری تھا اسلئے آخر میں اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے میں بڑی دشواری محسوس کرتے تھے دو تین سال ہوئے کہ وہ اسی فقیرانہ لباس میں اس دنیا سے سفر کر گئے، خدا مغفرت کرے، میرے خیال میں ان کا کوئی مجموعۂ کلام شاید شائع نہیں ہوا، یا شائع ہوا مگر میری نگاہ سے نہیں گذرا ہے حالات کے انقلاب سے اب ان نظموں نے اپنی دلکشی بھی کھودی ہے۔

مسٹر آصف علی بیرسٹر۔

دہلی کے مشہور قانون داں، آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ہمیشہ رکن ہی نہیں رہے بلکہ ہائی کمان میں انکا شمار تھا، مولانا آزاد سے زیادہ قریب تھے، جمعیۃ علماء کے اکابر سے بھی عقیدت رکھتے تھے اور ان کے مقدمات کی پیروی میں دلچسپی لیتے تھے ۱۹۴۲ء میں مولانا مدنی پر جو حکومت نے مقدمہ چلایا تھا مولانا مدنی کی طرف سے آپ ہی نے پیروی کی تھی، جیل کی اذیتیں بھی جھیلی ہیں ان کی بیوی مسز ارونا آصف علی کہی جاتی ہیں کمیونسٹ ہیں اور بلند پایہ لیڈر — وہ اکثر انڈر گراونڈ سرگرمیوں میں مصروف رہتی تھیں اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک میں ان کا رول بہت شاندار رہا، مسٹر آصف علی کا آزادی کے بعد جلد ہی انتقال ہوگیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔

نیشنلسٹ مسلمانوں کا مجاہدِ اعظم، اخلاصِ عمل اور جوشِ کردار کا پیکر، وطن اور قوم کی خدمت کے سلسلہ میں فداکاری وجاں سپاری کا مرقع، شعلہ بیان مقرر، آتشِ نوا خطیب، قوم پرور مسلمانوں کا انتہائی طاقتور لیڈر، گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو کا معتمد، کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ممبر، مسلمانوں نے اپنے اس لیڈر کو ادب واحترام کے جذبات کے ساتھ مجاہدِ ملت کا خطاب دیا تھا اور اپنی بے مثال خدمات کے لحاظ سے وہ صحیح معنی میں اس خطاب کے مستحق تھے آزادی کے بعد آگ اور خون کی بارش میں انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی حفاظت کی جو عظیم الشان خدمت اور بے مثال

کارنامہ انجام دیا ہے اور اپنی پر جوش اور حوصلہ افزا تقریروں سے مسلمانوں کے دلوں سے خوف وہراس اور یاس وقنوطیت کو دور کیا ہے اسی کا صدقہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اور اسلام زندہ بچ گئے ورنہ تقسیم ملک کے عذاب میں اسلامی ہند آج اسلامی تہذیب وتمدن کا بڑا ہی عبرتناک کھنڈر بن کر رہ گیا ہوتا اور خدا جانے کیا کیا ہوتا؟ ملک میں ہونے والے فسادات بلکہ یکطرفہ نسل کشی اور مسلمانوں کے وجود کو اس سرزمین سے مٹا دینے کے سلسلہ میں جو منظم پلاننگ تھی اس کو ناکام بنا کر مسلمانوں میں استقلال کی طاقت پیدا کرنے میں مسیحا کا کردار انجام دیا ہے، آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ میں فسادات کے موضوع پر جیسی جیسی تقریریں کی ہیں یہ انھیں کا دل گردہ تھا، مولانا حفظ الرحمٰن ایک بڑے قومی لیڈر ہی نہیں تھے، بہت بڑے عالم، بہت بڑے مصنف اور بہت بڑے محقق تھے قصص القرآن چار جلدوں میں، اسلام کا اقتصادی نظام، بلاغِ مبین، اخلاق وفلسفہ اخلاق جیسی عظیم الشان کتابیں ان کے علمی مقام ومرتبہ کو متعین کرنے میں مرعوب کن شہادت ہے، آزادی کے بعد کی شب وروز کی جدوجہد نے انکو تھکا ڈالا تھا، کینسر ہوگیا امریکہ علاج کے لئے تشریف لے گئے، آئے تو زندگی ساتھ تھی لیکن جب اپنے وطن پہونچے تو زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا یہ غمناک سال ۱۹۶۲ء ہے۔

رفیع احمد قدوائی۔

مسولی ضلع بارہ بنکی آپ کا وطن تھا، بہت ہی مخلص سیاستداں، ذہین وفطین، ایڈمنسٹریشن کی بہترین صلاحیتوں کے مالک، کانگریس کی اونچی سطح کے لیڈروں میں شامل تھے پنڈت جواہر لال نہرو سے قربت زیادہ تھی تمام کانگریسیوں میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے وہ سیاست وحکومت میں بھی اخلاص اور ایمانداری کے قائل تھے، قید وبند کی ان تمام منزلوں سے گذر چکے تھے جو ہندوستان کے مجاہدینِ زندگی کا مقدر ہیں، آزادی کے بعد اترپردیش میں وزیر پولیس وجیل بھی رہے اور دوسرے قلمدانِ وزارت بھی آپ کے ذمہ رہے، جس شعبہ میں رہے اس میں آپ نے انقلابی کارنامہ انجام دیا، وہ بھیس بدل کر اپنے ماتحت دفاتر کا جائزہ لیتے رہے، رشوت

و بددیانتی کا جہاں بھی کوئی مجرم ملتا اس کو سزا دیئے بغیر نہیں رہتے تھے اس لئے حکومت کا کوئی شعبہ جب بدنظمی کا شکار ہوتا وہ محکمہ قدوائی صاحب کو سونپ دیا جاتا، ایک بار ذخیرہ اندوزوں اور بلیک مارکیٹ کرنے والوں نے غلہ روک کر گرانی حد سے زیادہ بڑھا دی تو آپ کو وزیرِ خوراک بنا دیا گیا، آپ نے ملک میں بہت سے گودام حاصل کر کے ان میں تالے لگوا کر سیل مہر کرا دی اور ہر بڑے مارکیٹ میں وافر مقدار میں سرکاری گودام سے غلہ بھجوا دیا اور اعلان کر دیا کہ ملک میں غلہ کی کوئی کمی نہیں ہے اب اسی نرخ پر عوام کو غلہ ملتا رہے گا ذخیرہ اندوزوں کو یقین ہو گیا کہ حکومت کے پاس غلہ کا بہت بڑا اسٹاک ہے۔ اگر اسی طرح مارکیٹ میں غلہ آتا رہا تو ہمارے ذخیرے گوداموں میں سڑ گل جائیں گے اسلئے انھوں نے اس ڈر سے اپنے سارے ذخیرے مارکیٹ میں جلدی جلدی بھیجنے شروع کئے اور مارکیٹ میں اتنا غلہ مسلسل آنے لگا کہ ہر طرف ارزانی ہو گئی اور عوام نے اطمینان کی سانس لی۔ حالانکہ حکومت کے پاس کوئی بڑا ذخیرہ نہیں تھا، گودام خالی تھے صرف ان گوداموں پر سرکاری تالے اور مہر سیل لگی ہوئی تھی، بعد میں مرکزی وزارت میں ایک قابل ایڈمنسٹریٹر کی ضرورت محسوس ہوئی تو آپ کو اترپردیش سے دہلی بلالیا گیا ایک جلسہ میں مائک پر تقریر کر رہے تھے کہ یک بیک اسٹیج پر گر پڑے اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

باب (۷)

فرقہ وارانہ سیاست کا زہر

اگست ۱۹۴۲ء میں عالمی جنگ نازک ترین دور میں داخل ہوگئی تھی، جاپان کے جنگی جہاز کلکتہ تک پرواز کرنے لگے تھے، ادھر کانگریس کی تحریک "کوئٹ انڈیا" شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی ۸؍اگست ۱۹۴۲ء کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا ایک اہم اجلاس بمبئی میں زیرِ صدارت مولانا ابوالکلام آزاد ایک خطرناک فیصلہ کے لئے منعقد ہونے والا تھا ایک طرف کانگریس، اجلاس کو کامیاب بنانے پر تلی ہوئی تھی دوسری طرف حکومت اس کو ناکام بنانے کا تہیہ کئے ہوئے تھی کمزور دل والے تو حکومت کی تیاریوں کی خبریں سنکر ہی دہل جانے والے تھے، مسلح پولیس اور فوج کو تیار رہنے کا حکم دیدیا گیا تھا، مشین گنیں اور ٹینک شاہراہوں اور چوراہوں پر کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ مسلح فوج کا بمبئی کی سڑکوں پر مارچ کرایا گیا تاکہ ہندوستان سمجھ لے کہ بمبئی میں ایک جلیانوالہ باغ یا پشاور کا قصہ خوانی بازار اور بننے والا ہے، اخبارات حکومت کی تیاریوں کی دہشتناک خبروں کو پورے ملک میں خوب پھیلا رہے تھے، ان خوفناک خبروں کو سن کر اس اجلاس میں شرکت کی وہی ہمت کر سکتا تھا جو سر بہ کف اور کفن بردوش ہو، چپہ چپہ پر سی، آئی، ڈی مسلط تھی اور عام حکم تھا کہ جہاں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ممبر ملے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔

نیشنلسٹ رہنما مولانا حفظ الرحمٰن آئی، سی، سی کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے اور آپ کو سیوہارہ سے بمبئی تک کا سفر انہیں حالات میں کرنا تھا اور آپ نے یہ سفر کیا حکومت کی بے بسی یہ تھی کہ ورکنگ کمیٹی کے ممبران کی گرفتاری صوبائی حکومتوں کے ذمہ تھی کہ جو ممبر

جس صوبے کا ہو اسی صوبے کی حکومت اس کو گرفتار کرے، مگر یہ پابندی دورانِ سفر کیلئے تھی لیکن ۸ راگست کو جب کوئٹ انڈیا کی تجویز منظور ہوگئی تو پوری ورکنگ کمیٹی ہی نہیں بلکہ کانگریس خلافِ قانون جماعت قرار دے دی گئی اور ورکنگ کمیٹی کے فیصلہ کرتے ہی اسی شب بمبئی میں مولانا ابوالکلام آزاد صدرِ کانگریس، گاندھی جی، پنڈت جواہرلال نہرو، سردار پٹیل، سید محمود وغیرہ گرفتار کرلئے گئے اور احمد نگر قلعہ میں انتہائی رازداری کے ساتھ پہونچا دیے گئے، مولانا حفظ الرحمٰن کا قیام بمبئی میں ایسی جگہ تھا جس کا علم پولیس کو نہیں تھا، آپ اجلاس ختم ہوتے ہی ریلوے اسٹیشن آگئے اور دہلی کے لئے چل پڑے، دہلی میں آپ کی گرفتاری نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ وارنٹ یوپی گورنمنٹ نے جاری کیا تھا، جب تک وارنٹ یوپی گورنمنٹ سے دہلی پہونچے تب تک آپ محفوظ تھے، آپ نے اس مختصر فرصت میں جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کا ہنگامی اجلاس طلب کیا اور ۲۷ راگست ۱۹۴۲ء کو جمعیۃ علماء کی ورکنگ کمیٹی نے کانگریس کی تجویز انگریزو! ہندوستان چھوڑو " یعنی کوئٹ انڈیا والی تجویز کی تائید وحمایت میں رزولیشن پاس کر دیا اور طے کیا گیا کہ اس تجویز کو چھپوا کر سارے ملک میں پھیلا دیا جائے۔

خلافِ قانون تجویز کا طبع کرانا خود ایک خطرناک مرحلہ تھا اور پھر اس کو پورے ملک میں تقسیم کرنا اس سے بھی زیادہ خطرناک کام تھا، کمیٹی نے اس کام کے لئے مولانا سید محمد میاں مصنف " شاندار ماضی " اور مولانا عبدالماجد دہلوی اور بعض دوسرے رہنماؤں کو یہ ذمہ داری دی، مولانا سید محمد میاں کو دہلی سے مشرقی ہندوستان میں یہ تجویز پہونچانی تھی، پنجاب اور فرنٹیر میں مولانا عبدالماجد کو یہ ہینڈبل تقسیم کرنا تھا، جنوبی ہند، مدراس اور کیرالہ وغیرہ میں تقسیم کرنے کیلئے ایک تیسرے صاحب کو یہ ذمہ داری دی گئی، ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن قرولباغ دہلی سے گرفتار کرکے جیل بھیج دیے گئے، اور ایک مہینہ کے اندر مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا سید محمد میاں، مفتی کفایت اللہ اور جمعیۃ کے نمایاں افراد گرفتار ہو کر جیل پہونچ گئے، مولانا حسین احمد مدنی چار پانچ ماہ قبل ہی گرفتار کرکے نینی جیل الہ آباد بھیجے جا چکے تھے، مجلسِ احرارِ اسلام

کے تمام ممتاز رہنما عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مفتی محمد نعیم لدھیانوی، شورش کاشمیری اور دوسرے صوبائی سطح پر کام کرنے والے رہنما سلاخوں کے پیچھے بند کر دیئے گئے۔

ہوا کا رخ بدلنے لگا

ڈھائی برس کے بعد سب سے پہلے گاندھی جی مئی ۱۹۴۴ء میں رہا کیئے گئے ۱۴ر جون ۱۹۴۵ء کو احمد نگر قلعہ کی جیل سے مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور دوسرے تمام ارکانِ ورکنگ کمیٹی بھی رہا کر دیئے گئے۔

نیشنلسٹ رہنماؤں میں اپریل ۱۹۴۴ء کو مولانا سید محمد میاں ناظمِ جمعیۃ علماء ہند اور مئی ۱۹۴۴ء میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ناظمِ اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند اور ۲۶ر اگست ۱۹۴۴ء کو مولانا سید حسین احمد مدنی جیلوں سے باہر آگئے۔

عالمی جنگ اپنے آخری اسٹیج پر آگئی تھی، مسولینی، ہٹلر اور جنرل ٹوجو کی فوجیں شکست کھا چکی تھیں، انگریز جنگ میں بازی جیت چکا تھا، لیکن پانچ سال کی کڑی محنت نے اسکو تھکا دیا تھا اسلیئے ہندوستان کے سلسلہ میں اس کا رویہ بدلا بدلا سا تھا اگست ۱۹۴۲ء کی باغیانہ تحریک نے حکومت کو مرعوب اور دہشت زدہ کر دیا تھا، اسکو یہ تصور بھی نہیں تھا کہ ہندوستان اتنا آگے بھی جا سکتا ہے، اسلیئے اس کے رویہ میں لچک آتی چلی گئی اور ہندوستان کا نادر شاہ لارڈ لن لتھگو، وائسرائے ہند اپنی مدت پوری کر کے لندن جا چکا تھا اور اس کی جگہ ایک فوجی جنرل لارڈ ویول ہندوستان کا وائسرائے بن کر دہلی آچکا تھا، ملک میں ہر طرف تیز و تند سیاسی سرگرمیاں جاری تھیں، آزاد ہندوستان کا نقشہ مختلف سیاسی جماعتیں بنا رہی تھیں، خاکوں میں رنگ بھرا جا رہا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اب تحریک کا آخری عمل ختم ہو چکا ہے اور ہر شخص ملک کی تعمیر کی فکر میں ہے اور اسی کا خواب دیکھ رہا ہے، ہندوستان کی پیشانی پر کامیابی کی آب و تاب اور چمک دمک نظر آتی تھی اور دوسری طرف حکومت یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ ہندوستان میں اس کا نیرِ اقبال مائل بہ غروب ہے، ہندوستان اب بغاوت پر آمادہ ہو چکا ہے اگر

سنجیدگی اور متانت کے ساتھ آزادی کے مسئلہ کو حل نہیں کیا گیا اور اس گھتی کو سلجھایا نہیں گیا تو وہ بُرا دن بھی آسکتا ہے کہ باغی ہندوستان انگریزوں کا گریبان پکڑ کر سمندر میں پھینک دے اور زبردستی نظامِ حکومت پر قابض ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی بھی انگریز ہندوستان سے صحیح وسالم انگلینڈ واپس نہ ہوسکے گا، پولیس میں بھی اب وہ پہلی جیسی وفاداری نہیں رہی، بحریہ میں بھی بغاوت کے آثار نظر آنے لگے تھے، حکومت نے سمجھ لیا کہ انگاروں کو مخملی چادروں سے ڈھانک دینے سے یہ آگ بجھنے والی نہیں، اسلئے لارڈ ویول ذمہ داری سنبھالتے ہی لندن میں صلاح ومشورہ کے بعد جب دوبارہ ہندوستان آئے تو فوراً اگست ۱۹۴۲ء کے سارے قیدیوں کی رہائی کا حکم دے دیا اور ۱۴ جون ۱۹۴۵ء کی شب میں انھوں نے اگلے پروگرام کا اعلان کیا اور ہندوستان کے سامنے اپنی اسکیم رکھی آپنے کہا کہ:

"ملکِ معظم کی رائے ہے کہ ہندوستان کے لئے ایک نیا دستور بنایا جائے جدید آئین بننے تک جو وقفہ ہوگا اس کے لئے ایک انتظامی کونسل (ایگزیکیٹو کونسل) بنائی جائے جو زیادہ نمائندہ ہو، اس کونسل کے تمام ممبر ہندوستانی ہوں گے، کمانڈرانچیف اور وائسرائے بدستور رہیں گے، سوائے فوج کے تمام محکمے اس کونسل کو سپرد ہوں گے وائسرائے اس کونسل کے فیصلوں کو منظور کریگا، بشرطِ مجبوری اس کو ویٹو (حقِ استرداد) حاصل ہوگا، یہ کونسل ۱۹۳۵ء ایکٹ کے مطابق کام کریگی، کونسل میں سورن ہندوا اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہوگی۔

اس اعلان کے بعد وائسرائے نے صلاح ومشورہ کے لئے جن لوگوں کو بلا نا طے کیا تھا اس فہرست میں ہر صوبے کے موجودہ وزیر اعظم یا سابق وزیر اعظم، ان کے علاوہ بھولا بھائی ڈیسائی، نواب زادہ لیاقت علی خان، کونسل آف اسٹیٹ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈر، اسمبلی میں نیشنلسٹ پارٹی اور یوروپین گروپ کے لیڈر، مسٹر گاندھی اور مسٹر محمد علی جناح کے نام تھے۔

لارڈ ویول نے ریڈیو سے اپنی اسکیم کا اعلان کر دیا، اور مدعوین کی فہرست

سنادی، گاندھی جی نے اسکیم شائع ہوتے ہی وائسرائے کو مطلع کیا کہ میں کانگریس کا نمائندہ نہیں ہوں، یہ پوزیشن صدرِ کانگریس مولانا آزاد کی ہے وہی کانگریس کی طرف سے گفتگو کے مجاز ہیں۔

گاندھی جی کی سیاست دانی

لارڈ ویول نے اپنی اسکیم میں کہا تھا کہ انتظامی کونسل میں ہندو اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہو گی جب کہ مسلمانوں کی تعداد لوکروڑ اور ہندوؤں کی تعداد ۳۵ کروڑ تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وائسرائے نے ایک مخصوص اصطلاح سورن ہندو کی استعمال کی تھی، اس کا مفہوم یہ تھا کہ جو صحیح معنی میں ایک دھرم کے ماننے والے لوگ ہیں وہی ہندو کہلانے کے مستحق ہیں۔ یعنی خالص ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں مسلمانوں کے برابر ہے اور ان کی تعداد جو زیادہ بتائی جاتی ہے اس کے اندر تمام ہریجن، سکھ، پارسی، جینی، بودھ سب آجاتے ہیں جبکہ ان میں سے کوئی بھی صحیح معنی میں ہندو کہلانے کا مستحق نہیں ہے، اس طرح خالص ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں مسلمانوں سے زیادہ تسلیم نہیں کی، اگر گاندھی جی اس اصطلاح کو تسلیم کر لیتے ہیں تو مستقبل میں وہ صورتِ حال برقرار نہیں رہے گی جو آزادی کے بعد سے آج چالیس سال تک آپ برابر دیکھ رہے ہیں، ہندوستان کا نظامِ حکومت کن کے ہاتھوں میں رہتا یہ وقت بتاتا، ۱۸ کروڑ افراد کی طاقت ہندو اور مسلمان کے درمیان بیلنس بن جاتی وہ جدھر جھک جاتی حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھوں میں آجاتی، اسلئے گاندھی جی نے وائسرائے سے کہا کہ "سورن ہندو" کی اصطلاح غلط ہے، میں اسکو تسلیم کرنے کیلئے قطعاً تیار نہیں ہوں۔

وائسرائے اور حکومتِ ہند چونکہ سمجھوتہ کیلئے خلوص دل سے تیار تھے اس لئے گاندھی جی کے اس مطالبہ کو تسلیم کر کے سورن ہندو کا لفظ نکال کر انکو مطمئن کر دیا گیا، اور شملہ کانفرنس کا سلسلہ شروع ہو گیا، کانگریس کے نمائندہ کی حیثیت سے مولانا آزاد کو مدعو کیا گیا، کیونکہ اب بھی کانگریس کے وہی صدر تھے اور ۱۹۳۹ء سے مسلسل صدر چلے آرہے تھے اس پورے دور میں انتخابِ جدید کی مہلت ہی نہیں ملی۔

مسٹر جناح نے وائسرائے کو مطلع کیا کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے وہ صرف ہندوؤں کی نمائندگی کر سکتی ہے اور مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے اسلئے مسلمانوں کی طرف سے صرف مسلم لیگ کو بولنے کا حق ہے۔

قانونی مہارت کا ستم ظریفانہ استعمال

مسلم لیگ نے اپنی واحد نمائندگی کا دعویٰ کرکے ہندوستان کے مسلمانوں کے دوسرے مخلص رہنماؤں کے لئے اپنی رائے کے اظہار کا راستہ بند کر دیا، مسٹر جناح نے اپنی قانونی مہارت کا بڑا ستم ظریفانہ استعمال کیا ایک طرف نیشنلسٹ مسلمانوں کی لیڈرشپ پر کاری ضرب لگائی اور دوسری طرف کانگریس کے پچاسوں برس کے اس دعویٰ کی روح نکال دی کہ وہ ہندوستان کے تمام فرقوں کی نمائندہ جماعت ہے، ڈیول پلان میں چونکہ اس طرف خود اشارے موجود تھے اسلئے مسٹر جناح نے اس سے فائدہ اٹھایا اور قوم پرور لیڈروں کو اسٹیج سے نیچے اتار دیا، اور ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کی قسمت کے فیصلہ کرنے کا سارا اختیار اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

پانسہ پلٹ رہا ہے

مسلم لیگ کے دعویٰ واحد نمائندگی کو تسلیم کرتے ہی ہندوستان کے ان تین کروڑ مسلمانوں کا ستارہ گردش میں آگیا جو مسلم لیگ کے مجوزہ نقشۂ تقسیمِ ملک کے باہر اقلیتی صوبوں میں رہتے تھے، مسٹر جناح نے گاندھی جی سے مفاہمت کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے صاف طور پر کہا تھا کہ آپ لوگ پاکستان کو تسلیم کرلیں میں تین کروڑ مسلمانوں کو ہندوؤں کے سپرد کرنے کیلئے تیار ہوں۔ اس واضح اظہار کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کی آنکھیں نہیں کھلیں اور اُلٹے ہزاروں ہزار ٹیلیگرام مسٹر جناح کے نام روانہ کئے کہ تنہا مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور صرف اسی کو مسلمانوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق اور اختیار ہے جبکہ ہندوستان کی نیشنلسٹ لیڈرشپ انھیں تین کروڑ مسلمانوں کے لئے زیادہ فکرمند تھی جو اقلیتی صوبوں میں رہتے تھے اور مجوزہ نقشۂ پاکستان سے باہر تھے۔

ویول کانفرنس ناکام

۲۵ ر جون ۱۹۴۵ء کو لارڈ ویول وائسرائے ہند کی صدارت میں شملہ میں یہ کانفرنس شروع ہوئی، بحث و تمحیص کے بعد لارڈ ویول کی تحریک پر یہ طے کیا گیا کہ مرکز میں حکومت بنانے کے لئے ۱۵ نشستوں کے لئے ہر پارٹی فہرست بناکر پیش کرے، مگر وائسرائے کو اس میں رد و بدل اور ترمیم کا اختیار ہوگا، کانگریس نے مسلم کوٹہ میں دو نشستوں کا اختیار چاہا تھا مگر لارڈ ویول کی اس تجویز کو منظور کر لینے کے بعد کہ صدر کو رد و بدل کا اختیار رہوگا، کانگریس اپنے مطالبہ سے دستبردار ہو گئی، مسلم کوٹہ میں پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کی طرف سے ملک خضر حیات ٹوانہ کے ایک آدمی کو وائسرائے کے لئے لیناضروری تھا مگر مسٹر جناح اس کیلئے تیار نہیں ہوئے اور اس مطالبے پر اڑ گئے، ۲۹ ر جون ۱۹۴۵ء کو وائسرائے نے پندرہ دنوں کے لئے اجلاس ملتوی کر دیا کہ اس عرصہ میں فہرستیں مرتب کر کے پیش کر دی جائیں، ۶ ر جولائی ۱۹۴۵ء کو کانگریس نے پندرہ ناموں کی فہرست مرتب کر کے وائسرائے کو بھیجدی جس میں پانچ سورن ہندو پانچ مسلمان، تین اقلیتوں کے نمائندے اور وائسرائے اور کمانڈرانچیف کے نام تھے، مسٹر جناح نے وائسرائے سے یہ گارنٹی لینی چاہی کہ جو مسلم نمائندے لئے جائیں وہ صرف لیگ کے نامزد کردہ ہوں، لارڈ ویول اس کے لئے تیار نہیں ہوئے، اس گفتگو سے لارڈ ویول نے سمجھ لیا کہ مسٹر جناح کی ضد کام نہیں کرنے دیگی اور انھوں نے ۱۴ ر جولائی ۱۹۴۵ء کو کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کر دیا۔

ستارہ گردش میں آرہا ہے

ویول کانفرنس ناکامی کے باوجود ایک زبردست ذہنی تبدیلی پیدا کر گئی، اور اس نے مستقبل میں مسلم لیگ کی کامیابی کی راہیں ہموار کر دیں، مسلم لیگ اپنی ضد پر قائم رہ کر کانفرنس کے ناکام ہونے کے باوجود خود کامیاب ہو گئی، آنے والے الکشن میں اس کی نمایاں کامیابی کی بنیاد اسی کانفرنس کی ناکامی پر پڑی تھی، عملاً وائسرائے اور کانگریس دونوں نے مسلم لیگ کے دعویٰ واحد نمائندگی کو تسلیم کر لیا اس لئے لیگ کو یہ کہنے کا حق مل گیا کہ مسلمان صرف مسلم لیگ کو ووٹ دیں کیونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت

مسلم لیگ ہے اور صرف مسلم لیگ، اسی نعرے کی بنیاد پر ستر فی صدی مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہوگئی، یہی ملک کی تقسیم کیلئے سب سے مضبوط بنیاد بنی، اور اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے اپنے انجام کو پسِ پشت ڈال کر اپنی رائے لیگ کے امیدواروں کو دی اور اپنی دائمی بدقسمتی پر اپنے ہاتھوں خود مہر لگادی، الفاظ کی جادوگری اسلام اور مذہب کی نمائشی نعرہ بازی، کے طلسم نے وہ شعبدہ دکھایا کہ ہوش کی آنکھیں بند ہوگئیں اور جوش کی سیاست نے دائمی عذاب کی بھٹی میں انکو جھونک دیا، آزادی کے بعد کے چالیس سال اس کی ناقابلِ تردید شہادت ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم ختم ہوگئی

ہم ۱۹۴۵ء کے ہندوستان کی سیاسی سرگرمیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ یورپ میں ہونے والی جنگ کا سلسلہ چھ سال سے جاری ہے یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی کے اعلانِ جنگ کے بعد اگست ۱۹۴۵ء میں اپنی تمام ہولناکیوں اور تباہیوں کے بعد ختم ہوگئی، روس کی فوجیں جو پیچھے ہٹ رہی تھیں اسٹالن گراڈ پر جم کر لڑیں، جرمنی کی کئی لاکھ فوجوں کو تباہ و برباد ہونا پڑا، یہیں سے جرمنی کی طاقت کمزور پڑنی شروع ہوگئی، امریکہ نے نولاکھ فوج افریقہ میں اُتار دی، اسلئے جرمنی اور اٹلی کی فوجوں کو مصر سے پسپا ہوکر افریقہ چھوڑ دینا پڑا، اب اتحادیوں نے خود بڑھکر اٹلی پر حملہ کر دیا، ۲۷ر اپریل ۱۹۴۵ء کو مسولینی گرفتار ہوگیا، یکم مئی ۱۹۴۵ء کو ہٹلر نے خودکشی کرلی، برلن پر روسی فوجوں کا قبضہ ہوگیا، ۷ر مئی ۱۹۴۵ء کو یورپ کے ہر محاذ پر جرمن فوجوں نے بلاشرط ہتھیار ڈال دیئے، ۹ر مئی ۱۹۴۵ء کو امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے جنگ بندی کا اعلان ہوگیا، جاپان اس کے بعد تین ماہ تک لڑتا رہا، لیکن ایٹم بم نے ہیروشیما کے پرخچے اڑادیئے اور ۱۰ر اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان نے بھی شکست تسلیم کرلی اور ۱۵ر اگست ۱۹۴۵ء کو ہر محاذ پر جنگ بند کر دینے کا حکم بھیجدیا گیا۔

آزاد ہند فوج کے بہادر سپاہی

دوسری جنگِ عظیم کو جاری ہوئے دوسرا سال تھا کہ ۱۹۴۰ء میں یک بیک یہ خبر ملی کہ سوبھاش چندر بوس جو بعد میں ہندوستان کی تاریخ میں "نیتاجی" کے نام سے

مشہور ہوئے، غائب ہو گئے۔ کسی نے کہا کہ کلکتہ کے ساحل پر ایک آبدوز کشتی برآمد ہوئی اور نیتا جی اس میں سوار ہو کر ہندوستان سے باہر چلے گئے، کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ سوبھاش چندر بوس نے جاپان میں "انڈین نیشنل آرمی" آزاد ہند فوج کے نام سے ایک فوجی تنظیم بنالی ہے اور یہ فوج جاپانی حملہ آوروں کے ساتھ مل کر برطانوی فوجوں سے باقاعدہ جنگ کر رہی ہے، قطعی طور پر بہت بعد میں معلوم ہوا کہ امفال کے محاذ پر آزاد ہند فوج نے کئی کامیاب حملے کیے۔

کہا جاتا ہے کہ آزاد ہند فوج تین لاکھ فوجیوں پر مشتمل تھی، یہ سب فوجی وہ تھے جو انگریزوں کے سنگاپور، چاٹگام میں شکست کھانے کے بعد مورچہ چھوڑنے پر جاپانیوں کے قیدی ہو گئے تھے، ان فوجوں میں سب کے سب تربیت یافتہ تھے، فوجی افسروں میں بہت بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی جسے جاپانیوں نے گرفتار کیا تھا، سوبھاش چندر بوس کے مشورے سے وہ سب کے سب آزاد ہند فوج میں شامل ہو گئے، عام فوجیوں میں بھی مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی، کیونکہ سنگاپور اور چاٹگام وغیرہ کے مورچوں پر بلوچ رجمنٹ لائٹ انفنٹری متعین تھی اور یہ سب کی سب مسلمان فوجیوں پر مشتمل تھیں۔ یہی رجمنٹیں گرفتار ہوئی تھیں اس لئے آزاد ہند فوج میں مسلمانوں کی تعداد خاصی تھی سوبھاش چندر بوس چونکہ مسلمانوں کی جنگی اسپرٹ سے واقف تھے اسلئے جنگی صلاح ومشورہ کے سلسلہ میں مسلمان افسروں پر زیادہ اعتماد کرتے تھے۔

مسلمان سپاہی آزاد ہند فوج کی کومیلہ کی پیش قدمی میں شرف الدین احمد پیش پیش تھے، صوبہ سرحد کے اکبر شاہ سوبھاش چندر بوس کے باڈی گارڈ میں شامل تھے ان کے دو بازو میجر جنرل شاہ نواز اور کرنل حبیب الرحمٰن تھے۔

کرنل حبیب الرحمٰن نیتا جی کے ساتھ اس جہاز میں تھے جس سے وہ ٹوکیو جا رہے تھے راستہ میں اس جہاز کو حادثہ پیش آیا اور جہاز گر کر تباہ ہو گیا، سوبھاش چندر بوس اور کرنل حبیب الرحمٰن دونوں نے آزادیِ وطن کے لئے غیر ملک میں

اپنی جانیں دیدیں لے لفٹنٹ کرنل عزیز احمد، لفٹنٹ کرنل ذاکیان، لفٹنٹ کرنل احسان قادر، لفٹنٹ کرنل شاہنواز، کریم غنی، ڈی ایم خان، کو آزاد ہند فوج میں اہم پورٹ فولیو حاصل تھا۔ ان لوگوں کو انتہائی اہم اور نازک ذمہ داریاں سپرد کی گئی تھیں، سوبھاش چندر بوس نے آبدوز کشتی میں تین مہینے کا جو طویل سفر برلن کا کیا تھا اس سفر میں انکے ہمراہ ایک ہندوستانی مسلمان عابد حسن بحیثیت سکریٹری سفر کر رہے تھے، ان کی ہمراہی میں کرنل راشد علی اور کرنل ایس ایم اسحاق بھی تھے۔

ہزاروں مسلمان فوجی اور افسران آزاد ہند فوج کے محاذ سے لڑتے ہوئے آزادیِ وطن کے جذبے سے سرشار ہو کر شہید ہو گئے، لفٹنٹ اشرف منڈل، ابو حسین، محمد حسین، محمد یوسف، لفٹنٹ ایس ایم علی، عبد العزیز، امیر حیات، عبد الرزاق علی، اکبر علی، علی شاہ، الطاف حسین، عطاء محمد، احمد خاں، اے، کے مرزا، ایوب خاں، ایس اختر علی، عماد العالم، عبد الرحمن خان کے نام شہید ہونے والوں میں مختصراً گنائے جا سکتے ہیں۔

کرنل برہان الدین، کپتان عبد الرشید اور جنرل شاہ نواز آزاد ہند فوج کے

لے قومی آواز لکھنؤ کی اشاعت ۲۸ر جنوری ۱۹۷۹ء میں یہ خبر آئی کہ آزاد ہند فوج کے کرنل حبیب الرحمٰن کا راولپنڈی میں دل کا دورہ پڑنے سے حال ہی میں انتقال ہو گیا، یہ اطلاع پاکستان سے آزاد ہند فوج کے کرنل ارشد نے جو پاکستان میں رہتے ہیں، آزاد ہند کے کرنل پی۔ کے سہگل کو کانپور میں دی ہے جو یہاں سوبھاش چندر بوس سے متعلق سیمینار میں شرکت کیلئے آئے ہیں اس سلسلہ میں دو احتمالات ہیں، ایک تو یہ کہ جن کے انتقال کی خبر دی گئی ہے وہ کرنل حبیب الرحمن دوسرے ہیں۔ وہ نہیں جو سوبھاش چندر بوس کے ساتھ جہاز کے حادثہ میں انتقال کر گئے تھے، یا دہی ہیں تو کتاب میں جو میں نے لکھا ہے یہ اس وقت کی اطلاع کے مطابق ہے جس میں کہا گیا تھا کہ نیتا جی کے جہاز کو حادثہ پیش آیا ہے اور اس جہاز میں نیتا جی کے ساتھ کرنل حبیب الرحمٰن بھی سفر کر رہے تھے اور دونوں حادثہ کا شکار ہو گئے۔ اسیر ادروی

ان افسروں میں سے تھے جنھیں برطانوی فوج نے گرفتار کر کے ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا، بغاوت کا جرم واضح تھا، لیکن انقلابی ہندوستان اتنا طاقتور ہو چکا تھا کہ ان بہادروں کو پھانسی دینے کی ہمت انگریز نہیں کر سکتے تھے، ان مقدمات کی پیروی کانگریس اور بعض لوگوں کی پیروی مسلم لیگ کر رہی تھی، جنرل شاہ نواز بری کر دیئے گئے، کپتان رشید کو سزا ہوئی اور بعض دوسرے فوجی افسران کو بھی سزا دی گئی حالات اتنے نازک ہو چکے تھے کہ کمانڈر انچیف نے ۳؍ جون ۱۹۴۶ء کو مداخلت کر کے سب کی سزاؤں کو ختم کرا دیا۔

شمعِ آزادی کے پروانے

سنہ ۱۹۴۶ء

جنرل شاہنواز۔

آزاد ہند فوج میں ان کے پاس بہت اہم پورٹ فولیو تھا، سوبھاش چندر بوس کے چند خاص مشیر کاروں میں ان کا شمار تھا، آزاد ہند فوج میں جنرل تھے سنہ ۱۹۴۶ء میں جاپان کی شکست کے بعد گرفتار ہوئے اور ہندوستان لائے گئے، جب عدالت میں ان پر بغاوت، قتل اور ایذا رسانی کا مقدمہ چلایا گیا تو کانگریس نے ان کے مقدمہ کی پیروی کا اعلان کیا اور پوری تیاری کے ساتھ مہینوں یہ مقدمہ چلا، جنرل شاہنواز نے جرأتمندانہ بیان دیا وہ آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے، انھوں نے برطانوی فوج کے خلاف اپنی سرگرمیوں اور کوششوں سے انکار نہیں کیا بلکہ اپنی تمام جدوجہد کا کھلے بندا عتراف کر کے مادرِ وطن سے اپنی لازوال محبت کا اظہار کیا جو ایک مسلمان کے دل میں اپنے وطن سے ہوتی ہے، ان کے ساتھ اور بھی کئی ملزمان آزاد ہند فوج کے شامل تھے سزا کا فیصلہ ہوا مگر اس وقت ملک کے حالات اتنے نازک تھے کہ کمانڈر انچیف نے مداخلت کر کے ساری سزاؤں کو ختم کرا دیا اور باعزت طور پر بری کر دیے گئے، آزادی کے بعد مرکزی حکومت میں ریلوے کے وزیر رہے چند برس ہوئے کہ ان کا انتقال ہو گیا راقم الحروف کو ان سے کئی بار ملنے کی سعادت حاصل ہوئی، بڑے غیرت مند اور خوددار آدمی تھے، خدا مغفرت کرے۔

کیپٹن عبدالرشید۔

جنرل شاہنواز خاں کے ساتھ آزاد ہند فوج میں تھے یہ بھی گرفتار ہوئے اور ہندوستان لائے گئے عدالت میں ان پر بغاوت کا مقدمہ چلا۔ عدالت نے لمبی سزا کا فیصلہ کیا ان کے کیس کی پیروی مسلم لیگ کر رہی تھی، ان کی سزا کے اعلان سے پورے ملک کی فضا میں کہرام مچ گیا اور جگہ جگہ توڑ پھوڑ کے واقعات شروع ہو گئے بعد میں کمانڈر انچیف کی مداخلت سے ان کی سزا معاف کر دی گئی۔

کرنل برہان الدین۔

آزاد ہند فوج میں کرنل تھے، یہ بھی جاپان کی شکست کے بعد گرفتار کر کے ہندوستان لائے گئے عدالت میں بغاوت اور قتل کا ان پر مقدمہ چلایا گیا سزا ہوئی مگر کمانڈر انچیف کی مداخلت سے سزا ختم کر دی گئی

عبدالعزیز۔

ڈھوک ڈھوریا ضلع گجرات پنجاب کے رہنے والے تھے، انگریزی کی فوج میں سینگلر تھے، آزاد ہند فوج کی تشکیل کے بعد فرسٹ گوریلا رجمنٹ میں شامل ہو گئے امفال کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

عبدالرحمٰن۔

میر ضلع جہلم پنجاب کے رہنے والے تھے، انگریزی فوج میں لانس نائک تھے کپورتھلہ انفنٹری میں آزاد ہند فوج میں بحیثیت حوالدار سیکنڈ گوریلا رجمنٹ میں شامل ہوئے امفال کے مورچہ پر شہید ہوئے۔

احمد خاں۔

موضع کنجا ضلع گجرات پنجاب کے رہنے والے تھے، انگریزی فوج لینس نائک تھے آزاد ہند فوج میں بحیثیت حوالدار تھرڈ انفنٹری رجمنٹ میں شامل ہوئے، امفال میں انگریزی فوجوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

اختر علی ۔

کپورتھلہ پنجاب کے رہنے والے تھے، انگریزی فوج کی کپورتھلہ انفنٹری میں صوبیدار تھے انکو انڈین نیشنل آرمی میں سکنڈ گوریلا رجمنٹ میں کپتان بنایا گیا انگریز فوج پر حملہ کرتے ہوئے کام آئے ۔

اللہ دین ۔

قصبہ تلاؤ ضلع رہتک ہریانہ کے رہنے والے تھے، والد کا نام موتی بخش تھا انگریزی فوج کی جاٹ رجمنٹ کے سپاہی تھے آزاد ہند فوج میں تیسری گوریلا رجمنٹ میں سپاہی کی حیثیت سے شامل ہوئے اور انگریزی فوج پر پیش قدمی کرتے ہوئے شہید ہوئے ۔

الطاف حسین ۔

رائے پور خورد ضلع امرتسر پنجاب کے رہنے والے تھے انگریزی فوج میں سپاہی تھے آزاد ہند فوج میں فرسٹ بہادر گروپ میں شامل ہوئے، برما میں پیشقدمی کرتے ہوئے شہید ہوئے ۔

بشیر احمد ۔

بہالی گاؤں ضلع رہتک ہریانہ کے رہنے والے تھے، انگریزی فوج کی جاٹ رجمنٹ میں جمعدار تھے آزاد ہند فوج میں تھرڈ گوریلا رجمنٹ میں بحیثیت لفٹنٹ شامل ہوئے کلیوا کے نزدیک پیش قدمی کرتے ہوئے انگریزی فوج کی گولی سے شہید ہوئے۔

چراغ الدین ۔

بر دیگھی ضلع لدھیانہ پنجاب کے رہنے والے تھے، آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے اور برما کے محاذ پر پیش قدمی کرتے ہوئے شہید ہوئے ۔

چراغ خاں ۔

کاہنا ضلع کپورتھلہ کے رہنے والے تھے انگریزی فوج سے آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے اور ملایا کے محاذ پر لڑتے ہوئے انگریزی فوج کی گولی سے شہید ہوئے۔

دلاور خان۔

موضع جالی ضلع جہلم پنجاب کے رہنے والے تھے انگریزی فوج میں نائک تھے سنگاپور میں وہ آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے اور لڑتے ہوئے ایک محاذ پر شہید ہوئے۔

فتح خاں۔

دھرو کنا ضلع جہلم پنجاب کے رہنے والے تھے انگریزوں کی فوج میں سپاہی تھے سنگاپور میں وہ آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے اور حوالدار بنائے گئے ایک پیش قدمی میں شہید ہوئے۔

فتح محمد۔

رُہتک ہریانہ کے رہنے والے تھے، انگریزی فوج کی جاٹ رجمنٹ میں سپاہی تھے، آزاد ہند فوج کی تھرڈ گوریلا رجمنٹ میں شامل ہوئے اور برطانوی فوج کے خلاف بہادری سے لڑے اور جگر کا چھا میں پیش قدمی کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

تفضل خاں۔

ساکھر بریاں ضلع راولپنڈی کے رہنے والے تھے، آزاد ہند فوج میں بحیثیت حوالدار سکنڈ رجمنٹ میں شامل ہوئے اور ۵ را پریل ۱۹۴۵ء کو پیشقدمی کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

فیروز خاں۔

ہزیال ضلع جہلم کے رہنے والے تھے، انگریزی فوج میں سکھ رجمنٹ کے سپاہی تھے آزاد ہند فوج کی فرسٹ گوریلا رجمنٹ میں شامل ہوئے اور پیش قدمی کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

غلام نبی۔

ہرم آباد ضلع گورداسپور پنجاب کے رہنے والے تھے، برما میں وہ آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے بعد میں انکو برطانوی فوج نے گرفتار کرلیا، بیہادہاری کیمپ میں نظر بند رکھا، فروری ۱۹۴۴ء میں کیمپ ہی میں انتقال ہوگیا۔

عنایت اللہ۔

تاموزئی ضلع پشاور کے رہنے والے تھے، انگریزوں کی ہندوستانی فوج میں نائک تھے۔ بحیثیت لفٹنٹ فرسٹ بہادر گروپ میں آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے جولائی ۱۹۴۴ء میں تاموپر پیش قدمی کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

ارشاد علی۔

نگینہ ضلع رُہتک (ہریانہ) کے رہنے والے تھے انگریزوں کی ہندوستانی فوج میں سپاہی تھے آزاد ہند فوج میں بحیثیت سپاہی فرسٹ گوریلا رجمنٹ میں شامل ہوئے اور ایک حملہ میں شہید ہوئے۔

جمال الدین۔

میوال ضلع کپورتھلہ کے رہنے والے تھے، آزاد ہند فوج میں بحیثیت نائک سکنڈ گوریلا رجمنٹ میں شامل ہوئے اور امفال کے نزدیک انگریزی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

قاسم علی۔

بٹن گاؤں ضلع حصار (ہریانہ) کے رہنے والے تھے ان کے والد کا نام فریدخاں تھا، برما میں آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے پیش قدمی کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

محمد خان۔

والد کا نام نور محمد خان تھا ضلع جہلم پنجاب کے رہنے والے تھے لینس نائک کی حیثیت سے آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے اور رنگون میں پیشقدمی کرتے ہوئے ۱۱ جون ۱۹۴۵ء کو شہید ہوئے۔

خدا بخش۔

تاجیک ضلع کیمبل پور پنجاب کے رہنے والے تھے انگریزوں کی ہندوستانی فوج میں سکھ رجمنٹ میں حوالدار کلرک تھے آزاد ہند فوج میں ملایا میں شامل ہوئے اور کاموکی پیش قدمی میں شہید ہوئے۔

خوشی محمد۔

بھوندری ضلع لدھیانہ (پنجاب)، کے رہنے والے تھے سنگھائی پولیس (جاپانا) میں کانسٹبل تھے آزاد ہند فوج میں شامل ہوگئے برما فرنٹ کی پیشقدمی میں شہید ہوئے۔

لال خان۔

مگھل ضلع جہلم پنجاب کے رہنے والے تھے، ملایامیں آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے اور انگریز فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

محمد عباس۔

کرور ضلع راولپنڈی کے رہنے والے تھے، ملایامیں آزاد ہند فوج میں شامل ہوگئے اور برطانوی فوج سے لڑتے ہوئے محاذ پر شہید ہوئے

محمد افضال۔

رمن ضلع راولپنڈی کے رہنے والے تھے انگریزوں کی ہندوستانی فوج میں سکھ رجمنٹ میں حوالدار کلرک تھے، سنگاپور میں آزاد ہند فوج میں لفٹنٹ کی حیثیت سے شامل ہوئے اور برما میں پیشقدمی کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

محمد انور۔

نورپور ضلع جہلم پنجاب کے رہنے والے تھے برطانوی فوج کی سکھ رجمنٹ میں حوالدار تھے سنگاپور میں آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے، سکنڈ بہادر گروپ میں لفٹنٹ بنائے گئے اور اراکان کی پہاڑیوں میں پیش قدمی کرتے ہوئے جنوری ۱۹۴۵ء میں شہید ہوئے۔

محمد بنارس۔

بسانی ضلع راولپنڈی کے رہنے والے تھے، برطانیہ کی ہندوستانی فوج میں حوالدار تھے ملایامیں آزاد ہند فوج میں بحیثیت لفٹنٹ سکنڈ گوریلا رجمنٹ میں شامل ہوئے، پیش قدمی کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

محمد دین۔

موضع کالا کلان ضلع سیالکوٹ پنجاب کے رہنے والے تھے، ملایا میں وہ آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے اور ملایا میں پیش قدمی کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔

محمد شفیع۔

بہی ضلع لاہور (پنجاب) کے رہنے والے تھے، آزاد ہند فوج میں ملایا میں شامل ہوئے۔ برطانوی فوج کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

محمد شفیع۔

ہادلی ضلع جالندھر پنجاب کے رہنے والے تھے، ملایا میں وہ آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے اور انگریزی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

محمد عمر خاں۔

نگینہ ضلع رہتک (ہریانہ) کے رہنے والے تھے، برطانیہ کی ہندوستانی فوج کی جاٹ رجمنٹ میں سولجر تھے، آزاد ہند فوج میں حوالدار بنائے گئے اور تھرڈ گوریلا رجمنٹ میں شامل ہوئے اور پیش قدمی کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

محمد یعقوب۔

موضع کاسر ضلع ہزارہ کے رہنے والے تھے، ملایا میں وہ آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے اور برطانوی فوج کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

محمد یوسف۔

ابراہیم ڈیرہ ضلع کوہاٹ فرنٹیر کے رہنے والے تھے انگریزوں کی ہندوستانی فوج میں سپاہی تھے، ۱۹۴۲ء میں آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے اور امفال کی پیش قدمی میں شہید ہوگئے

نبی بخش۔

مینواں ضلع کپورتھلہ کے رہنے والے تھے، انگریزی فوج میں نائک تھے ملایا میں آزاد ہند فوج میں شریک ہوئے اور امفال کے قریب برطانوی فوج

سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔

نور حسین۔

موضع کانی ضلع کیمبل پور، پنجاب کے رہنے والے تھے ۱۹۴۲ء میں آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے اور سنگاپور کے محاذ پر نومبر ۱۹۴۴ء میں شہید ہوگئے۔

تاج محمد۔

گوجر گڈھ ترخیل ضلع مردان (فرنٹیر) کے رہنے والے تھے انگریزوں کی ہندوستانی فوج میں حوالدار تھے سنگاپور میں آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے برطانوی فوج انکو گرفتار کرکے ہندوستان لائی اور انکو لکھنؤ جیل میں رکھا اور یہیں جیل کے اندر ۱۹۴۶ء میں انتقال کیا اور یہیں دفن ہوئے۔

ظہور احمد۔

موضع ظہور للکھیاں ضلع شیخوپورہ پنجاب کے رہنے والے تھے ملایا میں آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے ۱۹۴۳ء میں برما کی سرحد پر لڑتے ہوئے گرفتار ہوگئے۔ ہندوستان لاکران کا کورٹ مارشل ہوا اور پھانسی کی سزا تجویز ہوئی ۲۳ اگست ۱۹۴۳ء کو پھانسی دی گئی۔

کرنل حبیب الرحمٰن۔

آزاد ہند فوج میں کرنل تھے اور سوبھاش چندر بوس کے باڈی گارڈ میں شامل تھے جاپان کی شکست کے بعد سوبھاش چندر بوس کے ہمراہ جس جہاز میں ٹوکیو جا رہے تھے اس میں آگ لگ گئی اور جہاز جل کر نامعلوم مقام پر گر گیا اس لئے کسی کی لاش کا آخر تک پتہ نہیں چلا، بعد کی خبروں سے معلوم ہوا کہ کرنل حبیب الرحمٰن خود جہاز میں سوبھاش چندر بوس کے ساتھ نہیں تھے وہ رخصت کرنے والوں میں تھے اور پاکستان میں دل کا دورہ پڑنے سے ۱۹۷۹ء میں انتقال ہوا۔

کرنل راشد علی۔

آزاد ہند فوج میں کرنل تھے اور سوبھاش چندر بوس کے باڈی گارڈ میں

شامل تھے اسی جہاز میں یہ بھی سوار تھے جس میں سوبھاش چندر بوس سفر کر رہے تھے، جہاز راستہ میں حادثہ کا شکار ہو گیا، لاش کا پتہ نہیں چل سکا۔

ایس، ایم اسحاق۔

آزاد ہند فوج میں کرنل تھے اور سوبھاش چندر بوس کے باڈی گارڈ میں تھے یہ بھی کرنل راشد علی کے ساتھ اسی جہاز میں ٹوکیو جا رہے تھے جس سے سوبھاش چندر بوس جا رہے تھے لیکن جہاز کے حادثے سے دوچار ہونے کی وجہ سے لاش کا پتہ نہیں چل سکا۔

باب (۸)

ایک ہی نعرہ، پاکستان پاکستان

مئی ۱۹۴۴ء میں ڈاکٹری رپورٹ کی بنیاد پر سب سے پہلے گاندھی جی جیل سے رہا کئے گئے وہ جانتے تھے کہ آزادی اب ہمارے حالات پر منحصر ہے، برطانوی حکومت زیادہ دیر تک ہندوستان کو غلام نہیں رکھ سکتی، اسلئے حصولِ آزادی کی راہ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ ہندو مسلم اختلاف ہے، اگر ہندو اور مسلمان کے درمیان مفاہمت ہوجاتی ہے. تو آزادی ہمارا قدم چومنے کیلئے تیار کھڑی ہے گاندھی جی نے ویول کانفرنس کی کارروائی سے اندازہ لگالیا تھا کہ مسٹر جناح نے اپنی ضد کے سامنے کسی ایک کی چلنے نہیں دی اور عملاً لیگ کے لئے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کا زہر سب کے حلق میں اتار دیا، ان حالات میں آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود مسٹر جناح کی ذات ہے، اس لئے مسٹر جناح سے مفاہمت کی گفتگو کے لئے انھوں نے پیش قدمی کی، اور گاندھی جی نے مسٹر جناح سے ۱۰ ستمبر ۱۹۴۴ء سے ۲۶ ستمبر تک گفتگو کی، اس گفتگو میں مسٹر جناح نے دو بنیادی مطالبے رکھے جس میں سے ایک تو ۸ اگست ۱۹۴۲ء کا رزولیشن ہے کہ آپ اس رزولیشن کو واپس لیں، دوسری بات یہ کہ کانگریس پاکستان کو تسلیم کرے، صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ، بنگال، آسام کو بحالتِ موجودہ مسلم اکثریت کے صوبے تسلیم کرے اور انکو پاکستانی علاقہ قرار دے اور یہ تسلیم کرے کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہے اور کانگریس ہندوؤں کی نمائندہ ہے، گاندھی جی نے مفاہمت کی دوسری راہوں پر بھی گفتگو کی لیکن پاکستان کے علاوہ اور کوئی دوسری راہ نہیں رہ گئی جس پر

غور کیا جائے ۔

مسلم لیگ میدانِ عمل میں

مسٹر جناح اور ارباب لیگ کو معلوم تھا کہ عنقریب حکومت ملک میں الکشن کرانے کا ارادہ رکھتی ہے اور انکو یہ بھی معلوم تھا کہ الکشن فرقہ وارانہ بنیاد پر ہوگا مسلمان صرف مسلم نمائندوں کو منتخب کریں گے ، اسلئے کانگریس کی طاقت تسلیم کرتے ہوئے بھی انکو کانگریس سے کوئی خوف نہیں تھا ، انھوں نے لیگ کی واحد نمائندگی کے دعوی کو عمل کی کسوٹی پر کھرا ثابت کرنے کے لئے ایک پلان بنایا ، اس کے لئے انکو صرف مسلمانوں میں کام کرنا تھا ، اگر مسلمانوں کی اکثریت لیگ کی ہم نوا الکشن میں ثابت ہو جاتی ہے تو پھر کوئی طاقت پاکستان کو حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی ہے لیکن سب سے خطرناک پہلو یہ تھا کہ صوبہ یوپی ہندوستان کا دل ہے ، اور یہاں مسلمان ۱۵ فی صد ہیں بہار میں مسلمان صرف ۷ فی صد ہیں ، سی پی میں اور بھی کم ہیں ، ان حالات میں اقلیتی صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں کو پاکستان کا ہم نوا بنانے کا کون سا منتر تلاش کیا جائے کیونکہ پاکستان ان صوبوں سے سیکڑوں میل دور بن رہا ہے جس سے اقلیتی صوبوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا ، بلکہ تقسیم کے ردِعمل کے طور پر تمام اقلیتی صوبوں کے مسلمان یرغمال بن جائیں گے ، ان کی حیثیت جنگی قیدی کی بن جائے گی ، لیکن مسلم لیگ کی پروپیگنڈہ مشنری نے ایسا منتر پھونکا کہ لوگ اس پہلو پر سوچ بھی نہیں سکے اور اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے اتنا جوش و خروش کا اظہار کیا جتنا ان علاقوں کے مسلمانوں نے نہیں کیا جو متوقع پاکستان کے علاقوں میں رہتے تھے ۔

مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

پاکستان کی تجویز ۱۹۴۰ء میں منظور ہوئی جو بعد میں مسلم لیگ کا نصب العین اور منزل بن گئی تجویز کی پبلسٹی کچھ اس انداز سے ہوئی کہ صرف پانچ سالوں کے اندر یہ تجویز ایک طاقتور تحریک کی شکل اختیار کر گئی ، اور جب ہندوستان میں سر اسٹیفورڈ کرپس مشن آیا اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد وزارتی مشن آیا اس وقت تک یہ تحریک اتنی طاقتور

ہو چکی تھی اور اتنی اہمیت اختیار کر چکی تھی کہ اس سے صرف نظر کرنا کسی کیلئے ممکن نہیں رہ گیا تھا، پروپیگنڈہ کا کمال یہ تھا کہ پاکستان کے لفظ کو ایک گونہ تقدس کا درجہ حاصل ہوگیا تھا اور اس کے تقدس کا تصور مسلمانوں کے دل و دماغ میں اس طرح پیوست ہوگیا تھا کہ وہ کسی ایسی تجویز کو سننے کے بھی روادار نہیں تھے، جس میں پاکستان کے تصور سے ہٹ کر بات کی گئی ہو، اس تجویز کا سب سے حیرتناک پہلو یہی تھا کہ جن مسلمانوں پر سب سے زبردست زد پڑنے والی تھی اور مستقبل میں ان پر قیامت ٹوٹنے والی تھی ان کے گھر تباہیوں اور بربادیوں کا سیلاب آنے والا تھا، انھیں لوگوں نے ان لوگوں سے زیادہ جوش و خروش کا اظہار کیا اور اس کی حمایت کی جو اسکیم سے بہرہ مند ہونے والے تھے، عام مسلمانوں نے اس تجویز کی تائید و حمایت میں جیسے محسوس ہوتا تھا کہ اپنا دماغی توازن کھو دیا ہے انھوں نے اس اسکیم کو مسلمانوں کا نہیں اسلام کا مسئلہ بنا دیا تھا، انتہا یہ تھی کہ کہا جاتا تھا کہ جو اس اسکیم کی حمایت میں ہے وہ مسلمان ہے اور جو اس اسکیم کی مخالفت کرتا ہے وہ اسلام اور مسلمان دونوں کا دشمن ہے، انکا نعرہ تھا:

مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

مذہبی رہنماؤں کی خوش فہمیاں

پاکستان کی حمایت کو ہمارے چند مخلص اور دیندار علماء نے تقدس کا درجہ دیدیا تھا، انھوں نے اپنے مدرسوں میں بیٹھ کر اس کے لئے شرعی دلائل کے وہ پہلو تراشے جن کا مستقبل سے کوئی تعلق نہیں تھا اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، انھوں نے پاکستان کی تائید و حمایت میں دلیل یہ دی کہ:

> "تمام ہندوستان کو اسلامی سلطنت بنانا بحالتِ موجودہ ممکن نہیں تو کم از کم ان صوبوں کو جہاں مسلم اکثریت ہے۔ "اسلامی سلطنت" بنالینا اور وہاں سلطنت۔ "اسلامی اصولوں" پر قائم کی جاسکے، لازم اور ضروری ہے، اور اس کی نظیر مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت ہے، مکہ مکرمہ میں اسلامی سلطنت اور نظامِ اسلامی قائم نہ ہوسکا تو مدینہ منورہ مرکز بنایا گیا،

اس مرکز سے اسلام کو جو ترقی ہوئی دنیا پر روشن اور ظاہر ہے، اسی طرح کیا عجیب ہے کہ پاکستان سے بھی اسلام کو ترقی حاصل ہو، غلبۂ امت کا ذریعہ غلبۂ اسلام کا زینہ ہے۔

(بیان مولانا ظفر احمد تھانوی ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۵ء حیاتِ محمد علی جناح ص ۴۵۲)

دینی ذہن و مزاج کے لوگوں کو سمجھایا گیا کہ:

"پاکستان ایک ابتدائی قدم ہے جو انجامِ کار اسلامی اصولوں کے مطابق احکم الحاکمین کی حکومتِ عادلہ کے قائم ہونے پر منتہی ہو سکتا ہے۔

(علامہ شبیر احمد عثمانی "عصرِ جدید" کلکتہ ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء حیاتِ محمد علی جناح ص ۴۵۶)

اسی طرح ایک اور بیان میں علامہ شبیر احمد عثمانی جو مسلم لیگ کی قائم کردہ جمعیۃ علماءِ اسلام کے صدر اور شیخ الاسلام تھے فرمایا کہ:

"اگر حصولِ پاکستان کیلئے میرے خون کی ضرورت ہو تو اس راہ میں اپنا خون دینا میں باعثِ عزت و افتخار سمجھوں گا، اور اس سے ہرگز دریغ نہ کروں گا اس ملک میں ملتِ اسلامیہ کا وجود و بقا اور مسلمانوں کی باعزت زندگی قیامِ پاکستان سے وابستہ ہے، میں اپنی زندگی کو کامیاب سمجھوں گا اگر اس مقصد کے حصول میں کام آئے۔

(حیاتِ محمد علی جناح ص ۴۵۸)

مزارات کے متولیوں، سجادہ نشینوں کے زاویوں اور گنبدوں سے آواز آئی کہ:

"حصولِ پاکستان کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں کہ صرف مسلم لیگ ہی میں شریک ہوں کیونکہ صرف مسلم لیگ ہی ایک ایسی جماعت ہے جو حرمتِ اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی اور آزادی کیلئے کوشاں ہے

(حوالۂ بالا ص ۴۶۰)

درگاہِ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے مقدس نعرہ بلند ہوا کہ:

"میں اپنے سلسلہ کی تمام خانقاہوں کے سجادگان سے اپنے جدِ امجد

حضرت خواجہ غریب نواز کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنی اپنی گدیوں کو چھوڑ کر اس نازک حالت میں اسلام کی خدمت کیلئے اور مسلم لیگ کے امید واروں کو کامیاب بنانے کے لئے کمر باندھ کر میدان میں آجائیں

(حیاتِ محمد علی جناح مؤلفہ رئیس احمد جعفری ص ۴۶۰)

یہ ذہن میں رہے کہ یہ الکشن کے زمانہ میں ووٹروں سے اپیل کے سلسلہ میں الفاظ کہے جارہے ہیں، اسی سلسلہ میں خواجہ حسن نظامی نے اپنی دراز زلفوں پر ہاتھ پھیرا اور مراقبہ سے سر اٹھایا اور الہامی انداز میں ارشاد فرمایا:

"میری چشتی برادری کے مسلمان ممبر اور میرے سب مرید اور نظامیہ خاندان کے سب متوسل مسلم لیگ کا ساتھ دیں، ہر مسلمان پر جو علماء و مشائخ کو مانتا ہو مسلم لیگ کا ساتھ دینا فرض ہوگیا ہے"

(حیاتِ محمد علی جناح ص ۴۶۱)

درگاہ بو علی قلندر سے نعرۂ قلندرانہ لگایا گیا:

"اس وقت مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے اور پاکستان مسلمانانِ ہند کا بہترین نصب العین ہے اس لئے اس کے حصول کیلئے جد وجہد کرنا ہر مسلمان کا اہم ترین فرض ہے"

پیر جماعت علی شاہ کو الہام ہوا کہ:

"اب دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کو نہیں ٹال سکتی، حکومت اور کانگریس کان کھول کر سن لے، اب مسلمان بیدار ہو چکا ہے اور اس نے اپنی منزلِ مقصود متعین کر لی ہے اور وہ پاکستان ہے میں سید ہوں، موت سے نہیں ڈرتا ہوں (حوالہ بالا ص ۴۶۲)

پاکستان میں اسلامی حکومت

پاکستان میں کیسی حکومت قائم ہوگی؟ اس سلسلہ میں مشہور مفسر قرآن مولانا عبد الماجد دریا آبادی مدیر صدق لکھنؤ نے اپنے اخبار صدق کی ۲۲ر جنوری ۱۹۴۶ء کی

اشاعت میں مخصوص انداز میں تحریر فرمایا؛

"ایک معاصر انگریزی اخبار لکھتا ہے " اسلامی حکومت " اس ایک لفظ میں نہ جانے کتنی دلربا کہانیاں چھپی ہوئی ہیں ؟ سیدھے سادے مسلمانوں کی نگاہیں اس کی چمک دمک سے خیرہ ہو جاتی ہیں، دل بے اختیار اس کی طرف بھاگتا ہے اور دماغ تھوڑی دیر کے لئے اس نام کی لذت سے سرشار ہو کر معطل ہو جاتا ہے، ذرا دیر کے بعد یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہاں سنی فقہ چلے گی یا شیعہ فقہ ؟ اور سنی فقہ ہو گی تو حنفی فقہ ہو گی یا حنبلی فقہ ؟ اس طرح کے بہت سے سوالات و الزامی جوابات، مثلاً یہ کہ سوراجی حکومت کس کے خیالات کے مطابق ہو گی، گاندھی جی کے ؟ پنڈت جواہر لال نہرو کے ؟ سوبھاش چندر بوس کے نظریات کے مطابق ؟ وقس علیٰ ہذا، اس سے قطع نظر کر لی جائے جب بھی پیش کردہ سوالوں کا جواب بہت ہی آسان ہے اسلامی حکومت اپنی بد سے بدتر شکل میں اور کسی بھی فرقہ کی فقہ کے مطابق سہی بہرحال کافرانہ حکومت سے بہتر و قابلِ ترجیح ہو گی، صحت کمزور سے کمزور سہی بہرحال بیماری کی ہم سطح تو نہیں ہو سکتی روشنی دھیمی سے دھیمی سہی بہرحال تاریکی سے تو غنیمت ہی رہے گی۔

بڑے سے بڑے محقق اور بال کی کھال نکالنے والے لوگ بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ پاکستان میں مسٹر جناح اسلامی حکومت قائم کریں گے اور وہاں کا دستور اسلامی دستور ہو گا اور فقہ اسلامی کا کوئی ماہر ہی بنائے گا، اور ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو یہی یقین دلایا گیا تھا، شاید مسٹر جناح کی دینداری، زہد و تقویٰ، خلوص وللہیت، اسلام سے بے پناہ اور والہانہ محبت، دین و مذہب کیلئے عظیم الشان قربانیاں دینے کی بنا پر یہ حسنِ ظن قائم کیا تھا، یہ تو بہرحال کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پاکستان جیسی مقدس اسلامی حکومت کا دستور ایک کافر اور وہ بھی ہریجن کافر

بنائے گا اور اسی پر اس اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی جائے گی۔

نیم حکیم خطرۂ جاں ہندوستان کے سجادہ نشین، مزارات کے متولیان، خانقاہوں میں عزلت گزیں پیرانِ عظام جنکی عظمت عوام کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی، ان کی دنیا الگ تھی، اور بہت محدود دنیا تھی سیاسیاتِ حاضرہ سے تو ان کا کوئی لگاؤ ہی نہیں تھا، اسلئے حکومتوں کے انقلاب میں کیا ہوتا ہے کسی قوم کی ایک چھوٹی سی غلطی کتنی قیامتوں کو اپنے دامن میں لے کر ظہور پذیر ہوتی ہے، انتقالِ اختیارات کے نازک اور پیچیدہ مسائل، تقسیمِ ملک اور اس کے نتائج وعواقب کے بارے میں ان کی معلومات کتنی ہوسکتی ہیں؟ کیا کہا جا سکتا ہے انھوں نے مسٹر جناح کی قیادت پر اعتماد کرکے الکشن کو کفر اور اسلام کا مسئلہ بنا دیا، کس نے انکو یہ یقین دلا دیا کہ آکسفورڈ اور کیمبرج سے پڑھ کر آنے والے پاکستان میں خلافت راشدہ قائم کریں گے، لیکن ان کے بیانات کا سیدھے سادے مسلمانوں پر یہ اثر پڑنا قدرتی اور لازمی تھا اور اثر پڑا اور اس کامیابی کی وجہ یہی تھی کہ لیگ نے اپنی سیاست کے لئے مذہب کو سپر بنا لیا تھا اور جو اہلِ علم لیگ کے ہم نوا تھے انھوں نے یہ ہوائی باتیں غلط فہمی میں مبتلا ہو کر عوام میں پھیلائیں کہ لیگ ایک اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے اور کچھ لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں، سیدھے سادے مسلمان کا دینی جذبہ وہیں جاگ جاتا تھا اور مخالفینِ پاکستان کو اسلام کا مخالف سمجھنے لگتا تھا، لیگ والوں نے یہی ذہن بنایا اور وہ کامیاب ہوگئے۔

تصویر کا دوسرا رخ پاکستان کے فضائل ومناقب میں جو کچھ کہا جاتا تھا وہ محلِ گفتگو نہیں تھا۔ بڑی خوشی کی بات ہوتی اگر وہ اپنے دلوں میں صحیح معنی میں یہ جذبہ رکھتے، لیکن نیشنلسٹ مسلمان دیکھ رہے تھے کہ وہ ایک طرف تو اسلامی حکومت قائم کرنے کی بات کرتے ہیں اور پاکستان میں اسلامی دستور اور قرآنی دستور نافذ کرنے کا یقین دلاتے ہیں دوسری طرف جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کے بارے میں وہی اسلامی جذبہ بدترین

کا فرانہ جذبہ بن جاتا ہے، اسی سے اندازہ ہوتا تھا کہ لیگ والوں کے سینوں میں مذہب اور اسلام کی کیا قدر و منزلت تھی؟ اور عام اُمتِ مسلمہ کے بارے میں ان کے جذبات کیا تھے؟ ایک طرف وہ پاکستان کی حمایت میں دین و مذہب کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار اور آئیڈیل کی بات کرتے ہیں اور پیغمبرانہ لب ولہجہ میں پاکستان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے اور دوسری طرف بڑے بڑے مدعیانِ رشد و ہدایت اور پاکستان میں حکومتِ الٰہیہ کی بات کرنے والوں کے نزدیک ہندوستان کے تین کروڑ مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو کی قیمت تو دور کی بات ہے، ان کے عقیدہ و ایمان کی بھی ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت اور کوئی اہمیت نہیں تھی، ایک طرف پاکستان میں خلافتِ راشدہ اور حکومتِ الٰہیہ کی داغ بیل ڈالنے کی بات کرتے تھے اور عوام سے وعدہ کرتے تھے اور دوسری طرف اسلامی ہند کے تین کروڑ مسلمانوں کے بارے میں انکا نقطۂ نگاہ یہ تھا:

"اب یہ بات تقریباً طے ہو چکی ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے گا، ایک حصہ مسلم اکثریت کو سپرد کیا جائے گا اور دوسرا حصہ غیر مسلم اکثریت کے زیرِ اثر ہوگا، پہلے حصہ میں ہم کوشش کریں گے کہ رائے عامہ کو ہموار کرکے اس دستور و قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں جسے ہم مسلمان خدائی قانون اور دستور مانتے ہیں، غیر مسلم حضرات وہاں ہماری مخالفت کرنے کے بجائے ہمیں کام کرنے کا موقع دیں اور دیکھیں کہ ایک بے دین قومی جمہوریت کے مقابلہ میں خدا پرستانہ جمہوری خلافت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت پر قائم ہوگی کہاں تک خود باشندگانِ پاکستان کے لئے اور کہاں تک پوری دنیا کیلئے رحمت و برکت ثابت ہوتی ہے؟

دوسرے حصہ میں آپ کی اکثریت ہوگی اور ہماری اقلیت ہوگی وہاں ہم آپ سے عرض کریں گے کہ خدارا دنیا کی بگڑی ہوئی قوموں

سے وہ نہ لیجئے جن کی وجہ سے وہ خود بھی خراب ہو رہی ہیں اور دنیا کو بھی خراب کر رہی ہیں، رام چندر جی، کرشن جی، مہاراج گرونانک اور دوسرے رشیوں، منیوں کی تعلیم اور سیرتوں کا جائزہ لیجئے، ویدوں پرانوں، شاستروں اور گرنتھوں کو دیکھئے اگر ان میں کوئی ہدایت آپ کو ملے تو ہم کہیں گے کہ آپ ہندوستان کی ریاست کا نظام اسی پر قائم کیجئے اور ہم سے وہی برتاؤ کیجئے جو آپ کا دین ہمارے لئے تجویز کرتا ہے اور ہم اس نظام کی مزاحمت نہیں کرینگے اسے کام کرنے کا موقعہ دیں گے۔

(ابوالاعلیٰ مودودی۔ جماعتِ اسلامی اور اسکی دعوت طبع ششم ص ۲۹-۳۰)

یہ تھا تحریکِ پاکستان کا پیشِ منظر و پسِ منظر، آٹھ کروڑ کے لئے قرآنی حکومت اور تین کروڑ کے لئے ہندوراج کا مشورہ گویا یہ تین کروڑ مسلمان مسلم لیگ کے غلام تھے جنکو ہندوستان کے ہندوؤں کے ہاتھوں آپ کو فروخت کرنے کا اختیار حاصل تھا، برملا کہدیا کہ مسلمانوں کے ساتھ آپ وہ برتاؤ کریں جو آپ کا مذہب ان کے بارے میں تجویز کرتا ہے یعنی ان کو شدھی کرتے ان کے آباؤاجداد کے ہندو دھرم پر قائم کردیں اور ستم یہ کہ یہی تین کروڑ مسلمان جن کا سودا کیا جارہا ہے سب سے زیادہ بلند آواز میں پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں، ؎

طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا!
اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا

غلط قیادت کا خطرناک انجام

آج تک کسی قوم نے کوئی بھی تحریک اس انداز پر نہیں چلائی کہ اسی قوم کی ایک بڑی تعداد کو خود اپنے ہاتھوں سے دہکتے ہوئے انگاروں میں جھونک دیا ہو، تین کروڑ کی آبادی جو حجاز کی آبادی سے زیادہ اور یورپ کے بہت سے ملکوں کی آبادی سے بڑی آبادی ہے، انکو یرغمال بنا کر چھوڑ دیا جائے اور ایسے حالات پیدا کر دیے

جائیں کہ جن لوگوں میں چھوڑا جائے ان کے سینوں میں ان مسلمانوں سے نفرت وعداوت کی تیز آگ دہکا دی جائے اور دشمن بنا دیا جائے اور پھر انہیں دشمنوں کو موقعہ دیا جائے کہ یہ تین کروڑ قربانی کی بھیڑیں تمہارے حوالے ہیں تم مستقل اور مسلسل ان پر اپنے خنجروں کی تیزی آزما سکتے ہو، ان کی عزت وآبرو، جان و مال، دین ومذہب، مساجد و مدارس، ان کی خانقاہیں اور اسلامی ادارے تمہارے ہاتھوں کا کھلونا ہیں چاہے محفوظ رکھو چاہے چکنا چور کر دو، ان کی جتنی قومی و ملی خصوصیات ہیں ان کو ایک ایک کر کے مٹا دو، ان پر سیاہی پھیر دو اور ان کو جانوروں سے بدتر زندگی گذارنے پر مجبور کر سکتے ہو، مگر ہم کو تعیش و تنعم کی فردوسِ بریں میں جانے کا موقعہ دو، یہ اسلامی کیا انسانی تاریخ میں، خودغرضی، قومی بے حمیتی، بے غیرتی کی انتہائی ذلیل اور بدترین مثال ہے۔

تحریکِ پاکستان کی مخالفت کیوں؟

مستقبل میں وجود پذیر ہونے والے ملک پاکستان کے خاکے میں جتنے رنگ بھرے جا رہے تھے وہ سب اپنی جگہ بہت ہی جاذبِ نظر، دلکش اور خوبصورت تھے ایک سچے اور پکے مسلمان، مومنِ کامل کے لئے ایسے ملک کی تعمیر اس کے ایمان کے لئے معراجِ کمال بن سکتی ہے، پاکستان کے بارے میں اس تحریک کو چلانے والے یہی کہتے بھی تھے، اسلامی حکومت، وہ بھی ٹھیک ٹھیک قرآنی حکومت؟ کون مسلمان اس کی مخالفت کی جرأت کر سکتا ہے؟ جو جرأت کرے گا، عوام اسکے ایمان کا فیصلہ کر دیں گے، لیکن اسکے باوجود تحریکِ پاکستان کی مخالفت ہوئی اور بھرپور مخالفت ہوئی ۱۹۴۵ء کا پورا سال اس کی تائید و مخالفت میں گذرتا رہا، ایک مسلمان مسلمان رہتے ہوئے کیسے اس کی مخالفت کر رہا تھا؟ اس کی مخالفت کی بنیاد کیا تھی؟ اسکے دلائل کیا تھے؟ وہ کیوں اس کو مجنوں کی بڑ اور دیوانے کا خواب کہہ رہے تھے؟ اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے۔

دہلی اور یوپی ہزاروں برس سے اسلامی تہذیب و تمدن کے مرکز رہے ہیں

مسلمانوں کے سارے آثارِ جاہ وجلال، شوکت و عظمت کی ساری نشانیاں، انھیں علاقوں میں ہیں، یہی وہ علاقے ہیں جہاں اسلامی تہذیب اپنی پوری رعنائیوں اور دل آویزیوں کے ساتھ جلوہ گر رہی ہے ان کے در و دیوار پر ہمارے آباؤ اجداد کے علمی، دینی، تہذیبی و مذہبی کارناموں کی داستانیں کندہ ہیں، ان کے چپے چپے پر ہمارے شاندار تمدن، ہماری بے مثال تہذیب کے نقش و نگار بکھرے پڑے ہوئے ہیں، یہی وہ علاقے ہیں جہاں سے علم وفن کا سورج طلوع ہوا اور اس کی روشنی سارے ہندوستان میں پھیلی، تاریخ کے پورے دور میں جتنی بھی دینی و اصلاحی اور علمی تحریکیں ہندوستان میں اُبھریں، پھیلیں بڑھیں اور مسلم معاشرہ پر اثر انداز ہوئیں وہ سب اسی سرزمین سے اُبھریں یہ علاقے دین و مذہب، اسلامی اخلاق و معاشرت کی تقسیم و ترویج کے لئے ہمیشہ مردم خیز اور زرخیز رہے، یہاں مسلمان اقلیت میں ضرور رہا لیکن جوہر قابل رہا، اس کے ایک ایک فرد کے علمی و عملی کمالات کی شہرت و افادیت کے لئے ہندوستان کی فضا تنگ ہو جاتی تھی، یہی علاقہ اکثریت کے علاقوں کے لئے قومی بیداری، مذہبی توانائیوں کے پیدا کرنے کا ہمیشہ سے مرکز رہا ہے، اس کے چپے چپے پر ہزاروں دینی و اسلامی مدارس و مکاتب، خانقاہیں اور زاویے، درگاہیں، اور عالی شان مساجد، اسلامی یونیورسٹیاں، اولیا و اقطاب کے قبے و مزارات، بڑے بڑے علماء و مشائخ، محدث، مفسر، فقیہ، مفتی، محقق، مورخ ہر دور میں رہے ہیں، اسکے قصبات اور گاؤں، مولویوں، حافظوں، قاریوں کے لئے انتہائی مردم خیز رہے ہیں، پورے ہندوستان پر اس علاقے کو دینی و مذہبی سیادت حاصل تھی، اور سارے ہندوستان کو اسی خطے نے دینی و مذہبی رہنمائی دی ہے، اگر کوئی تحریک مذہبی بنیاد پر چلائی جاسکتی تھی تو اس کے لیے ضروری تھا کہ مسلمان قوم کے اس اہم ترین علاقے کو ویران اور بنجر بنانے کی کوئی گنجائش، کوئی امکان باقی نہیں رہنا چاہئے تھا، لیکن پاکستان کی تجویز میں اس کا کوئی حل نہیں تھا، بلکہ اسلامی ہند کے جسم کی روح یوپی اور دہلی کا گلا گھوٹنے کا سب سے پہلے بندوبست تھا، یہیں کے مسلمانوں کو فروخت کیا

جا رہا تھا، اسلامی تہذیب و تمدن کے اسی شاہکار علاقے کو پاکستان کی قیمت میں چکایا جا رہا تھا، پاکستان کے نام پر اسی اسلامی مرکز کو قربانی کا بکرا بنایا جا رہا تھا، بانیِ پاکستان مسٹر محمد علی جناح نے ایک نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے ایک پریس کانفرنس میں غیر مبہم الفاظ میں کہا :

„ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں (اتر پردیش، دہلی، بہار، مدھیہ پردیش، بھوپال، حیدر آباد وغیرہ) ان کیلئے تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ غریب الوطن اور غیر ملکی کی طرح زندگی بسر کریں جن کا کوئی حق اور کوئی حصہ حکومت میں نہیں ہوگا۔
دوسرے یہ کہ وہ ہندو قومیت اختیار کرلیں اور ہندو ہو جائیں
تیسری شکل یہ ہے کہ وہ پاکستان ہجرت کر جائیں ہم وہاں انکے استقبال کے لئے تیار رہیں گے ”

نیشنلسٹ مسلمان اور ان کے رہنما اسی لئے پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے اور تقسیمِ ملک کے مخالف تھے اور وہ متحدہ ہندوستان کی آزادی کی بات کرتے تھے اور اپنی عزت و آبرو اور جان و مال کو خطرے میں ڈال کر مخالفت کر رہے تھے اور یہ مخالفت اسوقت تک پوری قوت سے جاری رہی جب تک ۱۹۴۵ء کا فیصلہ کن الکشن نہیں ہوگیا، جس نے پاکستان کے مطالبے کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دی۔

مخالفینِ پاکستان کیا کہتے تھے؟

تجویزِ پاکستان کی مخالفت کرنے والے پوری دیانتداری اور صداقت کے ساتھ ملک و وطن کی حیثیت سے بھی، ملّتِ اسلامیہ اور مسلمانوں کی حیثیت سے بھی پاکستان کو ایک تباہ کن تحریک سمجھتے تھے، اور نیشنلسٹ رہنما مسلمانوں کو اس سبز باغ سے دھوکا کھانے سے روکتے تھے، وہ دل سے چاہتے تھے کہ جذبات کی رو میں بہ کر صرف ایک ہی پہلو کو نہ دیکھا جائے بلکہ نقصان اور فائدہ دونوں پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کر کے فیصلہ کیا جائے کہ پاکستان سے جو فوائد متوقع ہیں اس کی مضرتیں اس سے کہیں زیادہ

تو نہیں ہیں، اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان یہ راہ اختیار کرے مخالفین پاکستان کے سامنے اس تحریک سے پیدا ہونے والے جو امکانی خطرات تھے وہی انکو اس تجویز اور تحریک کی حمایت سے روکتے تھے۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ مجوزہ پاکستان جن علاقوں تک محدود ہے ان علاقوں کے باہر بھی مسلمان ہیں اور ان کی تعداد تین کروڑ سے کم نہیں ہے اتنی بڑی تعداد کو یرغمال بنانے کی قیمت پر یہ سودا قطعاً مہنگا ہے، تین کروڑ مسلمانوں کی زندگی جہنم بن جائیگی مسلمانوں کا سب سے حساس، زرخیز اور اسلامی تہذیب وتمدن کا شاہکار علاقہ مسلمانوں کیلئے آتش کدہ بن جائے گا اور وہاں کا مسلمان آگ اور خون کے دریا میں ڈوب جائے گا دہلی اور اتر پردیش ہی نہیں پورے ملک میں پھیلے ہوئے یہ مسلمان اور ان کی آبادیاں بھڑکتے ہوئے شعلوں کی بھٹیاں بن جائیں گی، ہزاروں لاکھوں مسجدیں تباہ وبرباد ہو جائیں گی نہ مسلمانوں کا جان ومال محفوظ ہوگا نہ عزت وآبرو اور یہ ردِعمل اتنا یقینی ہے کہ معمولی عقل کا انسان بھی اس سے انکار نہیں کرسکتا، ہندوستان میں اسلامی تہذیب وثقافت کا عطر کھنچ کر ان علاقوں میں آ گیا ہے اس کی تباہی ایک عبرتناک تباہی ہوگی، ان مسلمانوں کی کوئی قیمت نہیں ہے، ان کی جان ومال عزت وآبرو ان کے مساجد ومدارس ان کی خانقاہوں اور درگاہوں کی اگر کوئی قیمت ہے تو پاکستان بن جانے کے بعد یہ تباہ وبرباد نہ ہوں اس کی کون گارنٹی دیتا ہے، اگر تجویز پاکستان میں ان کی حفاظت کے لئے ایک جملہ بھی ہو تو ہم پاکستان کی مخالفت سے زبان روک لیں گے۔

ہندوستان کی سیاست کا طوفانی دور

ہم ابتک آپ کو اس کشمکش سے روشناس کرا رہے تھے جو صرف مسلمانوں کے اندر جاری تھی، ابھی آزادی کی منزل تک پہونچنے کے لئے دو سال کی مدت درکار ہے۔

برطانیہ کی حکومت دوسری جنگِ عظیم سے فاتح بن کر نکلی ہے، اس کو اپنی فتح

کا غرور بھی ہے اور اپنی طاقت پر فخر و ناز بھی، اگر ہندوستان کی سیاسی سرگرمیوں میں اضمحلال آتا ہے یا کمی واقع ہوتی ہے تو انگریزوں کے ارادے بدل سکتے ہیں، غلامی کی مدت اور دراز ہوسکتی ہے اور اس سونے کی چڑیا کو مزید کچھ دنوں کیلئے اپنے قبضہ میں رکھنے کی تدبیریں کر سکتے ہیں، اسلئے ہندوستان میں مسلسل ایسی فضا بنائے رکھنا سیاستدانوں نے ضروری سمجھا جو ہر لمحہ حکومت کو یہ احساس پیدا کراتی رہے کہ ہندوستان کی سیاست کا کوہِ آتش فشاں کبھی بھی پھٹ سکتا ہے، اگر یہ خطرہ حکومت کے سر سے ٹل گیا تو آزادی ٹالی جاسکتی ہے۔ اور امیدوں کے سورج پر مایوسی کی کالی گھٹا چھا سکتی ہے۔

ایک طرف وائسرائے ہند لارڈ ویول ہندوستانی لیڈروں سے انتقالِ اختیارات کے مسئلہ پر مصروف گفت وشنید بھی ہیں دوسری طرف انگریزی عدالتوں میں ان مجاہدینِ آزادی کے خلاف مقدمات بھی چل رہے ہیں، جنھوں نے ملک کی آزادی کے لئے اپنی جانیں خطرے میں ڈالی تھیں اور ان کو تختۂ دار پر چڑھانے کے لئے حکومت عدالتوں میں مقدمات کا ڈرامہ کر رہی ہے۔

آزادی کیلئے مسلمانوں کے جذبات

یہ کتنی سچی حقیقت ہے کہ مسلمان ہندوستان کی آزادی کے لئے انتہائی مخلص تھا۔ اب جبکہ ہندوستان آزادی کی سرحد پر کھڑا ہے لیکن اس وقت بھی مسلمان کے جسم پر وہی لباس ہے جو پھانسی پر چڑھانے کے لئے جاتے ہوئے مجرم کو پہنایا جاتا ہے جس کو دیکھ کر ہی یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اب اس کو تختۂ دار پر چڑھایا جانے والا ہے۔

انگریزی عدالتوں میں آزاد ہند فوج کے بہادر افسروں پر مقدمات چل رہے تھے اور یہ حیرتناک انکشاف ہو رہا تھا کہ ایک مسلمان فوجی افسر آزاد ہند فوج کے مورچہ سے جذبۂ آزادیِ وطن سے سرشار ہو کر اپنے حقیقی بھائی سے آگ اور خون کی ہولی کھیلنے سے نہیں جھجکا کیونکہ وہ مادرِ وطن کو غلام بنانے والی حکومت کا سپاہی تھا۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی کی پوری تاریخ میں صرف ایک مسلمان ہی نے یہ مثال پیش کی کہ آزادی کی لڑائی میں خون کے رشتہ پر وطن کی آزادی کو ترجیح دی۔
جنرل شاہ نواز جو آزاد ہند فوج میں جنرل تھے جب انگریزی عدالت میں ان پر مقدمہ چل رہا تھا تو انھوں نے عدالت کے سامنے بیان دیتے ہوئے اس کا اظہار کیا کہ:

"میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ برطانیہ کا نظامِ حکومت ناانصافی پر مبنی ہے اور اس ناانصافی کو ختم کرنے کے لئے میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا فیصلہ کیا، اپنی زندگی، اپنا گھر بار، اپنا خاندان، اور اپنی خاندانی روایات، میں نے طے کر لیا کہ اگر میرا حقیقی بھائی بھی اس راستہ میں حائل ہوگا تو میں اس کے ساتھ بھی لڑوں گا اور یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۴۴ء میں جو لڑائیاں برپا ہوئیں ان میں ہم دونوں بھائی ایک دوسرے کے خلاف لڑتے رہے حتیٰ کہ وہ زخمی ہو گیا، چندن نامی پہاڑیوں میں میرے اور میرے بھائی کے درمیان دو ماہ تک روزانہ لڑائی ہوتی رہی۔
مختصر یہ کہ میرے سامنے سوال تھا کہ مجھے ملکِ معظم کے ساتھ وفادار رہنا چاہیئے یا اپنے وطن کے ساتھ؟ اور میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ مجھے اپنے وطن کے ساتھ اظہارِ وفاداری کرنا چاہیئے چنانچہ میں نے نیتاجی سوبھاش چندر بوس سے وعدہ کر لیا کہ میں اپنے عزیز وطن کے لئے جان تک قربان کر دوں گا۔

بحری بغاوت

آزاد ہند فوج کے افسران پر چلنے والے مقدمات پر پورے ملک کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں اور آزادی کی تڑپ رکھنے والے ہر دل میں ان سے ہمدردی اور محبت تھی اور بڑی بے چینی سے ان مقدمات کے فیصلہ کا انتظار کیا جا رہا تھا، مجاہدینِ آزادی پر انگریزی عدالتوں کے ان مقدمات پر غم و غصہ کی فضا مختلف طبقوں میں پیدا ہوتی جا رہی تھی، جنرل شاہنواز کے دل میں جو جذبہ کار فرما تھا

وہ جذبہ اب پورے ملک میں عام ہوچکا تھا اور اس کا اکثر مشاہدہ بھی ہوتا تھا، بمبئی میں بحری بیڑے کی بغاوت اسی جذبۂ آزادی سے سرشاری کے نتیجہ میں تھی، ان چلنے والے مقدمات کا ذکر انگریزوں کی ہندوستانی فوج میں بھی تھا، ان میں بھی غم وغصہ کے جذبات بڑھتے جارہے تھے، اتفاق سے بمبئی بحری بیڑے کو ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔

بمبئی کے بحری بیڑے میں انگریز افسران کے توہین آمیز رویہ کے خلاف بھوک ہڑتال شروع ہوگئی، یہی بھوک ہڑتال بعد میں بغاوت کی شکل اختیار کرگئی، بغاوت کا ایک لیڈر کرنل ایم اے خان ایک فوجی افسر تھا اس نے پورے ملک سے اپیل کی کہ ہماری مدد کی جائے۔

بمبئی کے بحری بیڑے کی بغاوت کی خبر جب کراچی کے بحری بیڑے میں پہونچی تو وہاں بھی یک بیک بغاوت پھوٹ پڑی ایک مسلمان نوجوان طالب علم انور حسین لاہوری جہاز کے ڈیک پر ہاتھ میں کمیونسٹ پارٹی کا سرخ جھنڈا لئے ہوئے چڑھ گیا اور پوری طاقت سے انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کیا، انگریزوں کے وفادار سپاہیوں میں سے کسی سپاہی نے انور حسین کو وہیں گولی ماردی اور اس حال میں وہ نوجوان آزادیِ وطن کیلئے شہید ہوگیا کہ پوری طاقت سے سرخ جھنڈا جو انقلاب اور آزادیِ وطن کی علامت تھا ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔

کرنل ایم اے خان کی پکار رائیگاں نہیں گئی پورے ملک نے انتہائی جوش وخروش کے ساتھ اس کی آواز پر لبیک کہا، مختلف شہروں میں بالخصوص عروس البلاد بمبئی میں شہریوں نے بحری بیڑے کی حمایت میں ایک عظیم الشان جلوس نکالا جلوس غم وغصہ سے بھرا ہوا تھا وہ تخریبی کارروائیوں پر اتر آیا، انگریزوں نے بحری بیڑے اور شہریوں کی دوطرفہ بغاوت کے فرد کرنے کے لئے اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کیں جس کی وجہ سے بڑی تعداد میں آزادی کے پروانوں نے شمعِ آزادی پر اپنی جانیں قربان کیں۔

مرنے والوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، فرقہ وارانہ منافرت ملک میں

جو بڑے پیمانے پر پھیلائی گئی تھی اس نے یہاں آکر دم توڑ دیا، ہندو مسلمانوں کی لاشیں اٹھا رہے تھے اور مسلمان ہندوؤں کی لاشوں کو لے جا رہے تھے۔

حکومت نے طاقت کے ذریعہ اس بغاوت کو فرو کرنا چاہا مگر وہ کامیاب نہ ہوسکی، کیونکہ آزادی کا نشہ اتنا چڑھ چکا تھا کہ جان کی قربانی اب بہت بڑا مسئلہ نہیں تھی، چونکہ ہائی کمان برطانوی اقتدار سے اختیارات کی جنگ میں نازک ترین دور سے گذر رہا تھا اسلئے مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس اور سردار پٹیل نے فوجیوں اور شہریوں سے اپیل کی کہ فی الحال وہ اپنی تحریک بند کر دیں، ملک ایک نازک مرحلہ سے گذر رہا ہے اور ہم پوری سنجیدگی سے مسئلہ کو حل کرنے میں لگے ہوئے ہیں ہم آپکے جذبات کی قدر دعزت کرتے ہیں اور احترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

یہ چند جملوں کی اس اپیل میں وہ جادو تھا کہ بغاوت، اٹھے ہوئے جھاگ کی طرح یک بیک بیٹھ گئی اور ختم ہوگئی، فضا میں امن وسکون کا خوشگوار سناٹا چھا گیا جیسے ابھی ابھی کوئی حادثہ ہوا ہی نہیں ہے، کانگریس عوام میں کتنی مقبول ہے؟ اس کے صدر کی آواز میں کتنی طاقت اور کتنی توانائیاں چھپی ہوئی ہیں؟ انگریزی حکومت کھلی ہوئی آنکھوں سے ان حقائق کو دیکھ رہی تھی، یہ منظر دیکھ کر کہ عوام ان کے اشاروں پر گردنیں بھی کٹوا سکتے ہیں اور غصہ میں بپھرے ہوئے ننگی تلوار کا وار کرنا چاہتے ہیں تو روک دینے پر اٹھا ہوا ہاتھ وہیں رک جاتا ہے، یہ الفاظ کی جادوگری، لب ولہجہ کی شعبدہ بازی نہیں، عملی جد وجہد اور مسلسل قربانیوں کی جادوگری تھی، یہ منظر دیکھ کر انگریزی حکومت کو ہندوستان میں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا، ان کی امنگیں مایوسیوں کے گھنے اندھیرے میں ڈوب گئیں۔

جرأتِ رندانہ کا ایک اور منظر

جنگِ عظیم کی فتح پر اظہارِ مسرّت اور ہندوستانیوں کے سامنے اپنی طاقت اور شوکت وعظمت کے مظاہرہ کے لئے دہلی میں انگریزی حکومت نے "جشنِ فتح" منایا، دس ہزار مسلح فوجیوں نے اس جشن میں حصہ لیا لیکن ہندوستانیوں میں آزادی کا جذبہ کتنا شدید

ہو چکا تھا؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ اتنی بڑی فوج اسلحہ سے لیس جلوس میں فوجی انداز سے مارچ کر رہی ہے، یہ منظر ایک مرعوب کن منظر تھا مگر مجاہدینِ آزادی نے مرعوبیت کبھی جانی نہیں، طاقت کے مظاہرہ سے ان میں کبھی پست ہمتی آئی نہیں، خوف زدہ ہونا کبھی سیکھا نہیں، آزادی کے چند دیوانوں نے عین جلوس کے وقت ٹاؤن ہال میں آگ لگادی۔ جہاں جلسۂ تہنیت کے لئے پنڈال سجایا گیا تھا، اب وہاں سوائے آگ اور دھواں کے کچھ نہیں تھا، جلسہ گاہ، پنڈال، اسٹیج کے ساتھ پوری عمارت جل کر خاکستر ہوگئی، پولیس نے بے تحاشا مجمع پر گولیاں جھونک دیں، جسکے نتیجہ میں موقع پر ایک درجن کے قریب شمعِ آزادی کے پروانوں کی لاشیں خاک پر پڑی ہوئی تھیں۔

شمعِ آزادی کے پروانے

سنہ ۱۹۴۶ء

وزیر محمد۔

وزیر محمد سنہ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے، ۵۵ سال کی عمر تھی، شہریانِ بمبئی کی طرف سے بحری بیڑے کی بغاوت کی حمایت میں ہونے والے مظاہرہ میں حصہ لیا اور جلوس میں شریک ہوئے اور جب جلوس "ہندو ماتا سنیما" کے سامنے پہونچا تو پولیس نے فائرنگ شروع کر دی، اسی فائرنگ میں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

تاج محمد فضل محمد۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے، ۱۶ سال کے نوجوان تھے۔ بحریہ کی بغاوت کی ہمدردی میں نکلنے والے جلوس اور مظاہرہ میں شریک ہوئے اور ۲۲ر فروری سنہ ۱۹۴۶ء کو سالویشن آرمی بمبئی کے دفتر کے سامنے پولیس نے گولی چلائی اور وہیں شہید ہو گئے۔

عبدالعلی دین محمد۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے ۱۸ سال عمر تھی برطانوی بحری فوج میں ملازم تھے فروری سنہ ۱۹۴۶ء میں بمبئی میں بحری فوج کی بغاوت میں بھرپور حصہ لیا اور عوام کے ساتھ پرجوش مظاہرہ میں شریک رہے ناگ پاڑہ۔ بمبئی میں برطانوی فوج کی گولی سے ۲۲ر فروری سنہ ۱۹۴۶ء کو زخمی ہوئے اور ۲۳ر فروری سنہ ۱۹۴۶ء کو انتقال کیا۔

عبدالعزیز۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے، گھریلو ملازم تھے، بحری فوج کی بغاوت سے ہمدردی میں بمبئی میں۔ جو مظاہرہ ہوا اس کے جلوس میں شرکت کی انگریزی فوج نے جلوس پر

گولی چلائی اور پولیس کی گولی سے ۲۲ فروری ۱۹۴۶ء کو شہید ہوئے۔

عبدالعزیز عبدالرزاق۔

۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے، بحری فوج کی بغاوت کی حمایت میں ہونے والے مظاہرہ میں شریک ہوئے اور ۲۲ فروری ۱۹۴۶ء کو انور مارکیٹ بمبئی میں گولی لگی، زخمی حالت میں اٹھا کر گھر لائے گئے مگر زخم گہرا تھا تیسرے دن ۲۴ فروری ۱۹۴۶ء کو جان جاں آفریں کو سپرد کر دی۔

عبدالعزیز عبدالرحمٰن۔

۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے، ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تھے بمبئی میں بحری بغاوت کی حمایت میں ہونے والے مظاہرہ میں شریک ہوئے اور جلوس میں حصہ لیا ۲۲ فروری ۱۹۴۶ء کو ڈاکٹر اسٹریٹ بمبئی میں پولیس کی گولی سے زخمی ہوئے اور اسی دن انتقال کیا۔

عبدالغنی۔

۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے، ۴۵ سال کی عمر تھی، بحری فوج کی بغاوت میں سرگرم حصہ لیا اور ۲۲ فروری ۱۹۴۶ء کو پولیس فائرنگ میں گولی لگی اور موقعہ پر انتقال کیا۔

عبدالکریم۔

۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے، بحری فوج کی بغاوت کی حمایت میں ہونے والے مظاہرہ و جلوس میں شرکت کی انور مارکیٹ بمبئی میں ۲۲ فروری ۱۹۴۶ء کو پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

عبدالستار محمد عمر۔

۱۹۲۴ء میں بمبئی میں پیدا ہوئے بحری بغاوت کی ہمدردی و حمایت میں نکلنے والے جلوس میں شریک ہوئے اور ۲۲ فروری ۱۹۴۶ء کو پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

عبداللہ عبدالقادر۔

۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے، ۲۵ سالہ جوان تھے، بحری فوج میں ملازم تھے

اپنے ساتھیوں کے ساتھ بغاوت میں حصہ لیا اور ۲۲ ر فروری ۱۹۴۶ء کو بمبئی فورٹ میں پولیس کی گولی سے گھائل ہوئے اور اسی دن اسپتال میں انتقال کیا۔

محمد حسین آدم جی۔

۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام علاءالدین آدم جی تھا۔ بحری بغاوت کی حمایت میں نکلنے والے جلوس میں حصہ لیا اور ۲۲ ر فروری ۱۹۴۶ء کو فورٹ بمبئی میں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

علی محمد۔

۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے، ۳۰ سال کی عمر تھی، بحری فوج کے باغیوں کی حمایت میں ہونیوالے مظاہرہ میں پیش پیش تھے، دادر کے قریب پولیس کی گولی سے شہید ہوئے

انوار حسین۔

یہ لاہور کالج کے اسٹوڈنٹ تھے، کراچی میں "بہادر جہاز" پر بغاوت کا جھنڈا لہرایا ۲۳ ر فروری ۱۹۴۶ء کو ہاتھ میں جھنڈا لئے جہاز کے ڈیک پر تھے کہ پولیس کی گولی لگی اور وہیں شمع آزادی پر پروانہ وار نثار ہو گئے۔

اصغر اسمٰعیل۔

۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئے، بحری فوج کی حمایت کے سلسلہ میں نکلنے والے جلوس میں شریک رہے اور اسٹیچو بھائیکلہ بمبئی میں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

اصغر میاں نواسی۔

۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے، بحری فوج کی بغاوت کی حمایت میں نکلنے والے جلوس میں شامل ہوئے اور جب جلوس جے جے اسپتال بمبئی کے پاس پہونچا تو پولیس نے فائرنگ کی اور وہیں پولیس کی گولی سے شہید ہوگئے۔

عزیز عرف چھوٹو۔

۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے، بمبئی میں بغاوت کی حمایت میں نکلنے والے جلوس اور مظاہرے میں شریک رہے اور ۲۳ ر فروری ۱۹۴۶ء کو پولیس کی گولی سے شہید ہوگئے۔

دلاور عبدالملک ۔

دلاور عبدالملک کے والد کا نام دلاور مجاہد تھا، بمبئی کے ایک کالج میں پڑھتے تھے، بحری بغاوت کی حمایت میں جو جلوس نکلا اس میں شریک تھے پولیس کی گولی سے زخمی ہو کر انتقال کیا

فداعلی قیام علی ۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے، بحری بغاوت کی حمایت میں ہونے والے مظاہرہ اور جلوس میں شرکت کی اور جے جے ہسپتال کے پاس پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

غلام حسین علی محمد۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے، ۳۰ سال کی عمر تھی، بحریہ کے باغیوں کی حمایت میں نکلنے والے جلوس اور مظاہرہ میں شریک رہے اور پولیس کی گولی سے ۲۲ر فروری سنہ ۱۹۴۶ء کو شہید ہوئے۔

ابراہیم یوسف ۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے ۳۶ سال کی عمر تھی فوجی بغاوت کی حمایت میں ہونیوالے مظاہرہ میں شریک ہوئے اور پولیس کی گولی سے ۲۲ر فروری سنہ ۱۹۴۶ء کو شہید ہوئے۔

اسمٰعیل حسین ۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ بحری بیڑے کی بمبئی میں بغاوت ہوئی اس کی حمایت میں شہریوں نے جلوس نکالا ۔ اس جلوس میں شرکت کی اور ۲۲ر فروری سنہ ۱۹۴۶ء کو پولیس کی گولی سے شہید ہو گئے۔

اسمٰعیل رحمت اللہ ۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے، ۳۵ سال عمر تھی، فوجی باغیوں کی حمایت میں شہریوں کے جلوس میں شریک ہوئے میریل بنک عبدالرحمٰن اسٹریٹ بمبئی کے پاس پولیس نے فائرنگ کی یہیں پولیس کی گولی سے جاں بحق ہوئے۔

خدابخش پیارے ۔

سنہ ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوئے، بحریہ کی بغاوت کی حمایت میں نکلنے والے جلوس میں

شریک رہے اور ۲۲ ر فروری ۱۹۴۶ء کو پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

منظور احمد۔

۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے، ۳۰ سال عمر تھی، فوجی بغاوت کی حمایت میں ہونے والے مظاہرہ میں حصہ لیا اور ۲۲ ر فروری ۱۹۴۶ء کو پولیس کی گولی سے شدید طور پر زخمی ہوئے ہسپتال لے جائے گئے مگر اسی دن جان جاں آفریں کو سپرد کر دی۔

محمد ابوبکر۔

۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے، ۱۸ سال کے نوجوان تھے، بحری بغاوت کی حمایت میں ہونے والے مظاہرہ میں شریک رہے پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

محمد عزیز۔

۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے، ۳۵ سال عمر تھی، بحری فوجی بغاوت کی حمایت میں ہونے والے مظاہرہ میں شرکت کی اور پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

محمد حسین۔

۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام ملا غلام علی تھا، بمبئی کے مظاہرہ میں حصہ لیا اور ۲۲ ر فروری ۱۹۴۶ء کو جے جے ہسپتال کے پاس پولیس کی گولی سے شہید ہوئے

محمد حسین سید حسین۔

۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے ۱۸ سال عمر تھی، بحریہ کی بغاوت کے سلسلہ میں نکلنے والے جلوس میں شریک ہوئے اور ۲۲ ر فروری ۱۹۴۶ء کو پولیس کی گولی سے شہید ہوئے

غلام شیخ محی الدین۔

۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے، بحری بیڑے کی بغاوت کی حمایت میں ہونے والے مظاہرہ اور جلوس میں شرکت کی اور ۲۲ ر فروری ۱۹۴۶ء کو پریل بمبئی میں پولیس کی گولی سے مارے گئے۔

محمد سمیع۔

۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے. بحری بغاوت کی حمایت میں بمبئی کے شہریوں کے

جلوس میں شریک رہے اور ۲۲ر فروری ۱۹۴۶ء کو پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

مولا بخش عبدالعزیز۔

۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے، فوجی باغیوں کی حمایت میں بمبئی میں جلوس نکالا گیا اس میں شرکت کی اور ۲۲ر فروری ۱۹۴۶ء کو کامتھی پورہ میں پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔

ذکی الدین سلیمان جی۔

بحری بیڑے کی بغاوت کی حمایت میں شہریانِ بمبئی کی طرف سے ہونے والے مظاہرہ اور جلوس میں شرکت کی اور ۲۲ر فروری ۱۹۴۶ء کو پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔
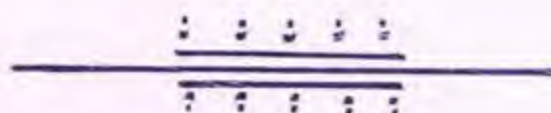
باب (۹)

آزادی کی منزل قریب آگئی

۱۹۴۵ء کے نصفِ آخر میں ہندوستان کی سیاست نے آندھی اور طوفان بن کر پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، عالیشان محلوں سے لے کر جھونپڑوں تک، راجوں اور مہاراجوں، نوابوں اور جاگیرداروں کے قلعوں سے لے کر کسانوں اور مزدوروں کی چوپالوں تک ایک ہی تذکرہ تھا، آزادی اور آزادی، ایک نئے انقلاب کی آمد آمد کا شور اور ہنگامہ، ملک میں ایک عجیب طرح کا خلفشار پھیلا ہوا تھا، ہر دل اُمید و بیم، یاس و قنوطیت کے مشترک اور ملے جلے جذبات کے ساتھ حالات کا مشاہدہ کر رہا تھا، واقعات کی تیز رفتاری بتا رہی تھی کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے، نا اُمیدی کی گہری اور کالی گھٹا چھٹنے والی ہے اور آزادی کا مہرِ درخشاں مطلعِ اُمید پر اپنی ساری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہونے والا ہے، حالات بنتے اور بگڑتے رہے برطانوی حکومت کا بدلا ہوا طرزِ عمل اُمید و یقین کی نئی فضا پیدا کر رہا تھا کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ حکومت کہہ رہی ہے۔ ع

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں

لیگ کی بار بار رخنہ اندازیوں سے حالات بن بن کر بگڑ جاتے تھے، منزل قریب آتے آتے یک بیک نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی تھی، اُمید کی ایک تیز کرن نمودار ہوتی تھی پھر یک بیک نا اُمیدی اور مایوسی کا کہرا پوری فضا پر چھا جاتا تھا، پاکستان کے جنون نے سمجھوتہ کی راہ میں اکثر روڑے اٹکائے۔

عوام اب ایسا محسوس کرنے لگے تھے جیسے عروسِ آزادی آگے پیچھے یہیں کہیں

قریب ہی چھپی ہوئی ہے، آنکھ مچولی کھیل رہی ہے، تصور کے ہاتھوں نے کئی بار اس کا گریبان پکڑنا چاہا، لیکن وہ ایک چھلاوہ کی طرح ہاتھوں کی دسترس سے باہر ہوگئی، ایسا سمجھا جارہا تھا کہ وہ ہمارے جذبۂ صادق اور ہماری قوتِ عمل کا امتحان لے رہی ہے، اور ادھر ہندوستان کے عوام نے تہیہ کررکھا تھا کہ وہ اس امتحان میں کامیاب ہوکر رہیں گے، ناکامی کی کوئی وجہ نہیں۔

لارڈ ویول وائسرائے ہند کی پہلی شملہ کانفرنس صرف ایک مسلم نشست کے مسئلہ کو لے کر ناکام ہوگئی تھی، لیکن بین الاقوامی حالات اور خود ہندوستان کے اندر جذبۂ آزادی کے کوہِ آتش فشاں نے وہ صورتِ حال بنادی تھی کہ برطانوی حکومت، آزادی کو بہت دیر تک ملتوی نہیں کرسکتی تھی، ہندوستان کی خوش قسمتی تھی کہ اسی دوران برطانوی پارلیمنٹ میں بھی انقلاب آگیا، ۲۵ برسوں کی جدوجہد کے بعد لیبر پارٹی نے چرچل کی کنزرویٹیو پارٹی کو شکست دے کر زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی، مسٹر ایٹلی جواب برطانیہ کے وزیرِ اعظم ہوئے بہت پہلے سے ہندوستان کے مسائل میں دلچسپی لے رہے تھے۔

لارڈ ویول وائسرائے ہند شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد لیبر گورنمنٹ سے صلاح ومشورہ کے لئے دوبارہ اگست ۱۹۴۵ء میں لندن گئے، ملکِ معظم نے نئی پارلیمنٹ کا افتتاح کرتے ہوئے اپنے سلسلۂ تقریر میں ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری دینے کا ذکر کیا تھا، لارڈ ویول، وزیرِ اعظم مسٹر ایٹلی اور وزیرِ ہند لارڈ پیتھک لارنس اور دوسرے وزراء سے صلاح ومشورہ کے بعد ۱۶ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ہندوستان واپس آئے، انھوں نے آتے ہی آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر نشر کی، جس میں انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات جلد از جلد کرائے جائیں گے۔

نئے حالات نئی سرگرمیاں

وائسرائے کے اس اعلان کے بعد تمام سیاسی پارٹیاں سرگرمِ عمل ہوگئیں اور پورے

ملک میں جلسوں اور جلوسوں کا سیلاب آگیا اور فلک شگاف نعروں کی دھوم مچ گئی ہر چھوٹی بڑی آبادی میں پارٹیوں کے الکشن دفاتر کھل گئے الکشن اور پروپیگنڈہ کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔

یہ الکشن درحقیقت ہندوستان میں آزادی کا پہلا زینہ تھا اور یہی الکشن آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والا تھا، یہ الکشن کسوٹی تھا مسلم لیگ کے دعویٰ واحد نمائندگی کا اور کانگریس کے اس دعویٰ کا کہ وہ ہندوستان کے ہر فرقہ کی نمائندہ جماعت ہے، الکشن فرقہ وارانہ بنیاد پر تھا، مسلمانوں کو صرف مسلم اُمیدواروں کو منتخب کرنا تھا، اس طرح براہِ راست مقابلہ مسلم لیگ اور نیشنلسٹ جماعتوں میں جمیعۃ علمار کے درمیان ہوگیا، اگر مسلم لیگ اس الکشن کے میدان سے سرخ رو ہو کر نکلتی ہے تو کوئی طاقت اس کو پاکستان حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی اسلئے مسلم لیگ نے اپنی ساری طاقت اور اپنے سارے حربے اس الکشن میں استعمال کئے۔

پاکستان: ہاں یا نہیں؟

یہ الکشن درحقیقت صرف ایک سوال پر تھا کہ پاکستان بنایا جائے یا نہ بنایا جائے۔ اگرچہ بہ ظاہر ایسا نہیں تھا، کیونکہ الکشن میں کانگریس کے ہندو امیدواروں کا کوئی حریف نہیں تھا، کچھ مقامات پر رام راجیہ پریشد اور مہا سبھا نے اپنے امیدوار کھڑے کئے لیکن سب کی ضمانتیں ضبط ہوگئیں اور ایک اُمیدوار بھی نہیں کامیاب ہوا، بہت سے مقامات پر کانگریس کے اُمیدوار بلا مقابلہ منتخب ہوگئے۔

اصل معرکہ مسلم اُمیدواروں کا مسلم سیٹوں پر تھا اور یہی معرکہ فیصلہ کن تھا جمیعۃ علمار کے رہنما پاکستان کو مجموعی طور پر مسلمانوں کے لئے مضرت رساں اور لاتعداد مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے اور ہر قیمت پر مسلمانوں کو اس طلسم سامری سے نکالنے کی کوشش کرتے تھے، دوسری طرف مسلم لیگ کے لیڈران اور اس کے ساتھ جو چند علمار تھے انھوں نے پاکستان کو ایک پر تقدس عقیدہ کی شکل میں پیش کیا تھا اور اس کو مکہ و مدینہ کی طرح عظمت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جانے

کے لئے جد وجہد کرتے تھے، ان کے نزدیک ہر مرض کی دوا پاکستان تھا۔
مسلم لیگ نے اپنے الکشن کے پروپیگنڈہ کی بنیاد دو باتوں پر خصوصیت سے رکھی تھی، ایک یہ کہ کانگریس صرف ہندوؤں کی جماعت ہے اس لئے وہ پاکستان کی مخالفت کرتی ہے، ہندوستان کا کوئی ہندو نہیں چاہتا کہ یہاں مسلمانوں کی کوئی اسلامی حکومت ہو، ہندوستان کے ہندوؤں نے گویا مسلمانوں کو چیلنج کر دیا ہے کہ وہ کسی قیمت پر پاکستان نہیں بننے دیں گے، دوسری بات یہ کہ جو مسلمان کانگریس میں ہیں یا کانگریس کی حمایت کرتے ہیں ان کا کانگریس میں کوئی وزن نہیں وہ کانگریس کے خیمہ بردار ہیں اور ہندوؤں کے اشاروں پر ناچنے والی طوائف ہیں اور یہ ہندوؤں کے زرخرید غلام ہیں۔ (اخبار مدینہ بجنور ۱۳ اپریل ۱۹۴۶ء بحوالہ علمار حق ج ۲ ص ۲۸۵ - ۲۸۶)
وہ لوگ ذاتی مفاد اور ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے پاکستان کی مخالفت کرتے ہیں اسلام اور مسلمانوں کی حکومت کی مخالفت وہی کرسکتا ہے جس کے اندر ایمان کا جوہر نہیں ہے، ورنہ کون بدبخت مسلمان ہے جو ایک اسلامی حکومت کے قیام کی مخالفت کرے۔

نیشنلسٹ مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ

نیشنلسٹ مسلمان آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے قومی، مذہبی، تہذیبی، لسانی، اقتصادی وسماجی تحفظات کو پیشِ نظر رکھتے تھے، وہ پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے دکھ درد اور ان کے مسائل کو سمجھتے تھے، وہ تین کروڑ مسلمانوں کی لاشوں پر پاکستان کی تعمیر کر کے جدید تعلیم یافتہ افراد اور جاگیرداروں، زمینداروں کے لئے شیش محل تیار کرنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتے تھے، ان کی نگاہ میں ہندوستان میں بسنے والے ایک ایک مسلمان کی جان ومال، عزت وآبرو، دین وایمان کی قدر وقیمت تھی وہ ہر ایک کا تحفظ چاہتے تھے، وہ خود غرضی کی سیاست سے بہت بلند تھے، وہ اسلام کے پھیلے ہوئے وسیع دائرے کو پورب پچھم کے چھوٹے سے رقبے میں سمٹنا پسند نہیں

کرتے تھے وہ اپنے اسلاف کے خون پسینہ سے تعمیر کئے ہوئے دینی مدارس، مساجد، خانقاہوں اور اولیاء اللہ کی درگاہوں اور مزارات کو اصطبل اور جانوروں کا باڑہ بنائے جانے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہ تھے اسی لئے پاکستان کے نام کو جو تقدس کا مقام دیا جارہا تھا اسے فریبِ نظر ہی نہیں فریبِ عقل، دیوانگی اور پاگل پن سمجھتے تھے، کہ ایک چھوٹے سے علاقے میں مسلمانوں کو امن وسکون دیکر کروڑوں مسلمانوں کو غیر معین مدت تک کے لئے عذاب میں مبتلا کرنے کو دانشمندی کے خلاف سمجھتے تھے، اس لئے وہ مسلمانوں کو نہایت دردمندی اور دلسوزی سے تحریکِ پاکستان کے جلو میں آنے والی تباہیوں اور بربادیوں کو انگلی رکھ رکھ کر بتاتے تھے، دکھاتے تھے اور سمجھاتے تھے، لیکن مسلم لیگ سے وابستہ علماء نے لفظِ پاکستان کو دین ومذہب کے مقدس لبادے میں پیپٹ کر ان پڑھ عوام کے سامنے پیش کیا تھا اور جو عظمت وتقدس پاکستان کیلئے ان کے ذہن نشین کر دیا تھا وہ دل کے درد کے ساتھ کہی ہوئی ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دیتے تھے اور علماء ومشائخ کی طرف سے جو مسلسل بدگمانیاں پھیلائی جارہی تھیں اس کی وجہ سے کوئی نیشنلسٹ علماء کی باتوں پر کان نہیں دھرتا تھا، "پاکستان زندہ باد" کے ایک نعرے میں ساری حقیقت وصداقت کے آہنی قلعہ کو زمیں بوس کر دیا جاتا تھا،

علماء کے خلاف محاذ آرائی

اس الکشن نے عوام کی کایا پلٹ دی تھی، اندازِ فکر اور سوچنے کا ڈھنگ بدل گیا تھا، علماء ومشائخ کا عوام سے سیدھا رابطہ تھا، عوام کے دلوں پر ان کے احترام کی گرفت بہت مضبوط تھی لیکن پروپیگنڈے نے علماء ومشائخ کے وقار کو مجروح ہی نہیں کیا بلکہ عام مسلمانوں کے دلوں میں ان کی طرف سے نفرت وعداوت کا جذبہ پیدا کر دیا گیا، ان کا ادب واحترام تو دور کی بات تھی ان کے ساتھ انسانیت اور اخلاق وشرافت کا سلوک کرنا بھی مسلم لیگ والوں نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔ پاکستان کے سحر نے کچھ اس طرح عوام کو مسحور کر رکھا تھا کہ وہ دیوانوں کی طرح ان کی پگڑیاں اچھالتے تھے، سید پور میں مولانا حسین احمد مدنی کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی، علی گڈھ میں مولانا ابوالکلام آزاد پر حملہ کیا گیا، کلکتہ میں مولانا

عبدالرزاق پر چاقو سے وار کیا گیا، مولانا محمد قاسم شاہجہاںپوری اور مولانا اسمٰعیل سنبھلی کو ایک مسجد میں گھیر کر قتل کرنے کی کوشش کی گئی، مولانا حفظ الرحمٰن کو لاہور، جالندھر کے اسٹیشنوں پر زدوکوب کرنے اور پتھراؤ کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی۔ مولانا سید محمد نصیر صاحب کو چاقو مارا گیا جس کی وجہ سے ساری زندگی کے لئے ان کا ایک ہاتھ بیکار ہو گیا ۱۹۴۵ء کا یہ الکشن جو استصوابِ رائے کے لئے ہو رہا تھا اسی ماحول اور اسی طرح کی فضا میں ہو رہا تھا۔

نیشنلسٹوں کا متحدہ محاذ

لیگ کا مطالبہ پاکستان تھا اور قوم پرور مسلمان اسے اقلیتی صوبوں کے لئے تباہی و بربادی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے الیکشن میں مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کے لئے متحدہ محاذ بنایا، ملک میں اس وقت کل ہند پیمانے کی جماعت جمعیۃ علماء تھی، دوسری قوم پرور تنظیمیں علاقائی تھیں اس لئے متحدہ محاذ کی داعی جمعیۃ بنی جمعیۃ علماء سیاسی میدان میں ۱۹۱۹ء سے کام کر رہی تھی، اس کے رہنماؤں کی عظیم الشان خدمات تھیں، جمعیۃ علماء کی طرف سے جن جماعتوں کے نام دعوتنامے جاری کئے گئے ان کے نام درج ذیل ہیں، مجلسِ احرارِ اسلام جو ۱۹۲۹ء میں قائم ہوئی، انجمن وطن بلوچستان جو ۱۹۳۲ء میں بنی، آل انڈیا مومن کانفرنس جو ۱۹۲۵ء میں قائم ہوئی، پرجا کرشک پارٹی بنگال جس کا قیام ۱۹۳۴ء میں ہوا تھا، خدائی خدمتگار جس کا قیام ۱۹۲۴ء میں عمل میں آیا تھا مسلم مجلس خواجہ عبدالمجید کی قائم کردہ جو ۱۹۴۰ء میں قائم ہوئی تھی، انڈی پنڈنٹ پارٹی بہار جس کو ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نے قائم کیا تھا ان تمام پارٹیوں کے سربراہوں کے نام دعوتنامے جاری کر دیئے گئے اور دہلی میں میٹنگ ہوئی جس میں مندرجہ ذیل تجویز منظور کر کے اس کی نقل اس وقت کے وائسرائے لارڈ ویول کو بھیجی گئی:

"یہ جلسہ یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہے کہ مسلم لیگ ملک میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت نہیں ہے، اس کے علاوہ آزادی پسند

اور ملک کے حقیقی مفاد کی داعی اور اس کے لئے کام کرنے والی
دوسری جماعتیں بھی ہیں جن کی اپنے وطن کے لئے قربانیاں تمام
ملک کے سامنے ہیں ۔

ان جماعتوں نے مل کر اپنا ایک مسلم پارلیمنٹری بورڈ بنایا، اور اسی متحدہ محاذ سے مسلم لیگ کا مقابلہ کیا، اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ لیگ کی طاقت ان تمام پارٹیوں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ تھی، ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی اکثریت لیگ کے سبز ہلالی پرچم کے سائے میں جا چکی تھی، مزید ستم یہ کہ لیگ کی پروپیگنڈہ مشنری نے غنڈہ گردی کا وطیرہ اختیار کر رکھا تھا، جس نے نیشنلسٹ لیڈروں کا چلنا پھرنا دشوار کر رکھا تھا، جگہ جگہ ان لیڈروں کے خلاف مظاہرے کئے جاتے، انتہائی بداخلاق کا برتاؤ کیا جاتا اور غیر شریفانہ طرزِ عمل اختیار کیا جاتا تھا۔

ہندوستان کے انتہائی محترم علماء اور رہنماؤں کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا تھا انتہائی دلخراش، گھناؤنا اور انسانیت کے لحاظ سے اتنا گرا ہوا تھا کہ قلم اس کی تفصیل لکھنے سے بھی معذور ہے، قوم پرور مسلمانوں کے جلسوں پر خشت باری، شہر شہر، قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں غنڈہ گردی جاری تھی، لیگی رضاکاروں نے جنکو "مسلم نیشنل گارڈ" کہا جاتا تھا وہ اودھم مچا رکھی تھی کہ نیشنلسٹ مسلمانوں کا سفر کرنا مشکل تھا، میں اگرچہ ان حالات کا عینی شاہد ہوں مگر جو واقعات ہو رہے تھے اس کی صحیح تصویر کشی میرے لئے مشکل ہے۔ اس اعتراف میں کوئی جھجک نہیں کہ لیگ ہر جگہ حاوی تھی اس کی مخالفت کرنے والے ہر جگہ سہمے ہوئے تھے، اگر کسی نے ترکی بہ ترکی جواب دینے کی کوشش کی تو اس کو اس کا انتہائی تلخ نتیجہ بھگتنا پڑتا تھا۔

اس طرح کے ماحول میں مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا الکشن ہوا اور نتیجہ کا اعلان توقع کے عین مطابق تھا۔

نوشتۂ تقدیر

ہندوستان کے مسلمانوں کی قسمت کا ستارہ گردش میں آ چکا تھا، دلوں پر ناعاقبت اندیشی کا پردہ پڑ چکا تھا اور وہ

دوست اور دشمن کی تمیز سے عاری ہو چکے تھے، سورج کی طرح روشن صداقت چھپ گئی، کھرے سونے کے بجائے قلعی چڑھے ہوئے پیتل کو قبول کرنے پر ضد کرتے رہے، الکشن کا وہی نتیجہ ہوا جو ہوا کے رخ نے ایک سال پہلے ہی بتا دیا تھا، مسلم لیگ مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندہ جماعت ثابت ہوگئی، ۸۴ فی صدی نشستیں مسلم لیگ کو ملیں اور ۱۶ فی صد نشستیں قوم پرور جماعتوں کے حصہ میں آئیں، الکشن میں کامیابی پاکستان کے مقدمہ کا سب سے مضبوط ثبوت بن گئی، اور اب کوئی طاقت ملک کی تقسیم کو نہیں روک سکتی تھی، ہندوستان کے مسلمانوں کا مقدر پھوٹ گیا، اس نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری، زخم کاری لگ چکا اب وہ اس کے درد وکرب سے نسلاً بعد نسلٍ کراہتا رہے، تڑپتا رہے بلبلے چیخے اس کا علاج اب اس کے اختیار سے باہر ہو چکا ہے۔

تیز رفتار سیاسی تبدیلیاں

اب ملک کے سامنے نئی راہیں اور نئی منزلیں تھیں، الکشن کی سرگرمیاں ابھی ملک میں کہیں کہیں جاری تھیں اور کئی علاقوں میں انتخابات باقی تھے کہ وزیرِاعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی نے اپنی تقریریں ہندوستان کے متعلق بہت اُمید افزا باتیں کہیں، انھوں نے لندن پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کے بارے میں کہا کہ:

> " اب ہندوستان میں آزادی کا جذبہ عام ہو چکا ہے اور اب ہر شخص اور ہر جماعت آزادی کا مطالبہ کرنے لگی ہے، پولیس اور فوج میں بھی وطنیت کا احساس بڑھتا جارہا ہے، اسلئے اب زیادہ دنوں ہندوستان کو غلام نہیں بنایا جاسکتا، اب وقت آگیا ہے کہ ہم سنجیدگی کے ساتھ ہندوستان کے مسئلہ پر غور کریں اور اس کا صحیح حل تلاش کریں "

اور پھر انھوں نے عملی اقدامات کا بھی آغاز کر دیا، آزادی طلب کرنے والے لیڈروں سے انتقالِ اختیارات کی ذمہ دارانہ گفتگو کے لئے ایک وزارتی مشن ہندوستان بھیجا جس میں وزیرِ ہند لارڈ پیتھک لارنس، سر اسٹیفورڈ کرپس، اور جنرل الگزینڈر شامل تھے، یہ مشن ۲۲ مارچ ۱۹۴۶ء کو کراچی پہونچا، یکم اپریل ۱۹۴۶ء سے مشن نے ہندوستان کے لیڈروں سے ملاقاتیں

شروع کردیں، ہندوستانی لیڈروں سے ملاقاتوں اور گفتگوؤں سے حالات کا صحیح جائزہ لینے اور ہرایک کا آئیڈیا سمجھ کر وفد نے اپنی سفارشات پریس کو دیدیں، انھیں سفارشات کی بنیاد پر ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو انٹریم گورنمنٹ (عبوری حکومت) کا قیام عمل میں آیا، جو ایک سال تک رہی جس کے تمام ارکان ہندوستانی تھے۔

نظریۂ پاکستان ناقابلِ قبول

۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن نے جو سفارشات شائع کی تھیں ان میں پاکستان کے نظریہ کو ہرطرح ناقابلِ قبول اور مضرت رساں کہکر رد کردیا گیا تھا، اس لئے مسلم لیگ کو انٹریم گورنمنٹ میں شرکت سے ابتداءً انکار رہا، لیکن لیگ ہائی کمان میں ردوقدح کے بعد وزارتی مشن کی سفارشات کو تسلیم کرتے ہوئے تین ہفتے بعد ۶ جون ۱۹۴۶ء کو نمائندہ اسمبلی میں شرکت منظور کرلی اور عبوری حکومت میں شامل ہوگئی وائسرائے نے ۱۲ اگست ۱۹۴۶ء کو صدرِ کانگریس پنڈت جواہرلال نہرو کو عبوری حکومت بنانے کی دعوت دی، ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو قلمدانِ وزارت تقسیم کردیئے گئے اور نامزد ارکان کو سپرد کردیئے گئے، تین ہفتے کی ذہنی کشمکش کے بعد مسلم لیگ نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو عبوری حکومت میں شمولیت اختیار کی۔

فرقہ واریت کا زہر پھیلایا گیا

وزارتی مشن کے پاکستان کے تسلیم کرنے سے انکار سے لیگ کے لیڈروں میں سخت برہمی پیدا ہوئی اور اپنے غم وغصہ کے اظہار کے لئے مسلم لیگ نے ۲۹ جون ۱۹۴۶ء کو بمبئی میں ڈائرکٹ ایکشن (راست اقدام) کی تجویز پاس کی تاکہ ملک میں ایسے حالات پیدا کردیئے جائیں کہ حکومت نظریۂ پاکستان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوجائے ڈائرکٹ ایکشن کو کامیاب بنانے کے لئے مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف نعرۂ جہاد دے کر خوب ورغلایا گیا اور جذبات کو خوب بھڑکایا گیا۔

بنگال میں مسلم لیگ کی حکومت تھی، سید حسن سہروردی وزیرِ اعلیٰ تھے، انھوں نے کلکتہ کے مسلمانوں کو بھڑکا کر ایک زبردست اور ہولناک فساد کرادیا

جس میں ایک روایت کے مطابق تیس چالیس ہزار لیکن محتاط روایت کے مطابق تقریباً چار ہزار آدمی صرف کلکتہ شہر میں مارے گئے، قتل ہونے والوں میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، اور دو ارب روپے کی جائداد مسلمانوں کی تباہ ہوئی، مسلم لیگ نے دانستہ طور پر فساد کرایا تھا اور اجتماعی حملہ کا طریقہ ایجاد کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام اسی طریقہ پر چل پڑے، اور پھر ہندوؤں نے یہی طریقہ اختیار کر لیا اور مشرقی ہندوستان میں انتقام در انتقام کا چکر چل پڑا، کلکتہ کے بعد نواکھالی (بنگال) میں بھی لیگ نے بلوہ کرا دیا جس کے نتیجہ میں وہاں کی ۵ فیصدی مسلم آبادی کو تباہ و برباد کرا دیا، بہت سے دیہات اور گاؤں ایک دم تباہ و برباد کر دیئے گئے قتل و غارت گری، زنا، اغوا، آتش زنی وہ کون سا پاپ تھا جو لیگ کے مجاہدین نے نہیں کیا پھر یہ چکر چل پڑا، ہندوؤں نے اس سال دیوالی نہیں منائی اور ملک میں جہاں موقعہ ملا ہندوؤں نے مسلمانوں سے اپنے ہندو بھائیوں کا انتقام لینا شروع کر دیا، اس طرح اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کی زندگی اجیرن ہوگئی۔

فسادات کا ردِ عمل یہ ردِ عمل مسلم لیگ کے ایک پروگرام "ڈائریکٹ ایکشن" کا ہوا یہ پروگرام اسلئے چلایا گیا تھا کہ وزارتی مشن نے نظریۂ پاکستان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا ان فسادات سے یہ ثابت کرنا تھا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان اکٹھا نہیں رہ سکتے اس لئے ملک کی تقسیم بہت ضروری ہے ان فسادات نے ہندوستان کے ۳۵ کروڑ ہندوؤں اور سکھوں کے ذہن میں ہندوستان کے سارے مسلمانوں کی طرف سے شدید نفرت اور غصہ بھر دیا تھا، اور اس نفرت اور غصہ کا بھرپور اظہار اس وقت ہوا جب مسلم لیگ کے رہنما ہندوستان میں یہ آگ لگا کر پاکستان جا چکے تھے اور تین کروڑ مسلمانوں کو اپنی دہکائی ہوئی آگ میں غیر معین مدت تک جلنے کیلئے چھوڑ چکے تھے۔

آزادی کی پہلی قسط ہندوستان میں ہندوستانیوں کی عارضی حکومت قائم ہو چکی، پنڈت جواہر لال نہرو صدرِ کانگریس

اس کے وزیرِ اعظم بنائے گئے اور سردار پٹیل وزیرِ داخلہ اور وزیرِ مالیات نواب زادہ لیاقت علی خاں ، ۹ ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو مجلسِ دستور ساز ہند کی رسمِ افتتاح ادا کی گئی اس افتتاحی اجلاس میں مسلمانوں کی نمایاں شخصیتوں میں مولانا ابوالکلام آزاد ، خان عبدالغفار خان (وفات ۲۲ ر جنوری ۱۹۸۸ء) مسٹر آصف علی بیرسٹر دہلی اور رفیع احمد قدوائی رونق افروز تھے اور دسمبر ۱۹۴۶ء کو ڈاکٹر راجندر پرشاد کو بالاتفاق دستور ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا تمام صوبوں میں منتخب شدہ نمائندوں پر مشتمل حکومتیں قائم ہو چکی تھیں ، اب وائسرائے ہند لارڈ ویول کی جگہ ایڈمرل وائیکاونٹ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہند بنکر دہلی آئے۔

تدبیر پر تقدیر غالب ہو گئی

نوے سالوں کی آزادی کی جد وجہد ، بے انتہا قربانیوں اور لامحدود جاں نثاریوں کے باوجود ہندوستان کا مسلمان بدقسمت نکلا ، آزادی کی منزل قریب آتے ہی پانسہ پلٹ گیا مخلص مجاہدینِ آزادی کے ہاتھوں سے عنانِ قیادت نکل کر غلط قیادت کے ہاتھوں میں چلی گئی اور ملک تقسیم کا شکار ہو گیا اور اس تقسیم کے سارے مصائب بھی اُسے جھیلنے پڑے ، ہم نے خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہیوں کو دعوت دی ، کروڑوں افراد خانماں برباد ہوئے ، ہزاروں ہزار مسلمانوں کی بوٹیاں کاٹ کر پھینک دی گئیں بے شمار عفت مآب پردہ نشین خواتین اغوا کی گئیں ، ان کا دامنِ عصمت تار تار ہوا اور پوری زندگی غیر مسلم بن کر زندگی گذاری لاکھوں افراد کے آبا و اجداد کی ڈیوڑھیاں چھُٹ گئیں اور وطن سے بے وطن ہوئے اور مطلوبہ پاکستان میں جاکر بھی مہاجر کہلائے اور وہ محبت ، وہ سکون ، وہ اپنائیت نصیب نہ ہو سکی جو ہر شخص کو اپنے وطن میں ملتی ہے۔

تقسیم کا حشر ، پاکستان ، بنگلہ دیش ، بہاری مسلمان ، ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمان ہر ایک کو پیشِ نظر کر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کسی قوم کی سیاسی زندگی میں ایک قدم بھی غلط اٹھ جاتا ہے تو پوری قوم کو کتنا عذاب بھگتنا پڑتا ہے ، شاید پاکستان کا نعرہ لگانے والے مخلص رہنما زندہ ہوتے تو انھیں یہی کہنا

پڑتا کہ پاکستان کا مطالبہ ایک زبردست سیاسی غلطی تھی مگر اب اس ذکر سے کیا حاصل؟

سفینہ اپنا کنارے جب آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

تقسیمِ ملک کے لئے راہ ہموار ہو رہی ہے

اب ہم سیاسی جد وجہد کے جن لمحات کا ذکر کر رہے ہیں، یہی وہ لمحے ہیں جب مسلمانوں کے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے، لندن میں صلاح ومشورہ یہ چل رہا تھا، عبوری حکومت کے دوران اور اس سے قبل ہولناک قسم کے ہندوستان گیر ہندو مسلم فسادات کا جولا متناہی سلسلہ چلا اس نے مدبرینِ برطانیہ کو تقسیمِ ہند کے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کیا اور ہمارا نوشتۂ تقدیر مشاہدہ کی آنکھوں کے سامنے آ گیا، لندن سے ہماری قسمت کا فیصلہ آیا جس میں کہا گیا کہ:

" بڑی بڑی سیاسی جماعتوں نے بار بار اپنی خواہش پر زور دیا ہے کہ ہندوستان میں اختیارات جلد سے جلد منتقل کر دیئے جائیں، ملکِ معظم کی حکومت کو ان کی اس خواہش سے پوری پوری ہمدردی ہے اور وہ جون ۱۹۴۸ء کی تاریخ کو قریب تر لانے پر بھی راضی ہیں تاکہ ہندوستان میں حکومت یا حکومتیں قائم کر کے انھیں کسی قریبی تاریخ پر اختیارات سونپ دیئے جائیں، ملکِ معظم کی حکومت کا ارادہ ہے کہ پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا جائے تاکہ اس اعلان کے نتیجہ میں جو فیصلے ہوں اقتدار کو درجۂ نو آبادیات کی بنا پر ایک یا دو جانشین حکومتوں کو اسی سال منتقل کر دیا جائے۔

اس کے بعد ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے آل انڈیا ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے یہ بیان کیا کہ:

یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اتنے بڑے رقبوں کو جن کی اکثریت ایک

فرقہ کی ہے ان کی مرضی کے خلاف ایسی حکومت کے تحت رہنے پر مجبور
کیا جائے جس میں دوسرے فرقہ کو اکثریت حاصل ہے جبر کا تنہا بدل
تقسیم ہے اور صرف تقسیم ملک "

تقسیم کا فیصلہ

۳؍جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہند نے ملک کی تقسیم کا اعلان کیا اور اس کو تسلیم کرلیا، اس کی تائید مسٹر جناح، پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار بلدیو سنگھ نے کی ۱۴؍جون ۱۹۴۷ء کو کانسٹی ٹیوشن ہاؤس نئی دہلی میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور مسٹر ولبھ پنت وزیرِ اعلیٰ اترپردیش نے کمیٹی کے سامنے تقسیمِ ہند کی تجویز پیش کی اور کانگریس کی اصول شکنی پر مہرِ تصدیق ثبت کردی۔

کانگریس نے ہمیشہ متحدہ قومیت کا نعرہ لگایا اور متحدہ ہندوستان کی آزادی کی علمبردار رہی لیکن اسی کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں تقسیم ہند کی تجویز پیش ہوتی ہے اس سے اُس کا پچاس سالہ تاریخی کردار ملیا میٹ ہوگیا، کانگریس انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں ضرور کامیاب ہوگئی لیکن اگر با اصول جماعت کی کامیابی کا دارومدار اس کے اصولوں کی کامیابی پر رکھا جائے تو یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کانگریس ناکام ہوگئی اور مسلم لیگ کے مقابلے میں شکست کھاگئی اگر وہ اپنے اصولوں پر مضبوطی سے جمی رہتی تو ممکن تھا کہ غلامی کی مدت کچھ اور دراز ہوجاتی اور آزادی کی منزل تک پہونچنے میں مزید کچھ اور مصائب جھیلنے پڑتے لیکن آزادی ہندوستان کو مل کر رہتی اور اپنے اصولوں کے مطابق ملتی، پنڈت ولبھ پنت نے جب تجویز پیش کی تو اس کی تائید میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جو بات کہی وہ اعترافِ شکست کے سوا اور کچھ نہیں، آپ نے فرمایا کہ:

"حالات نے ہر دماغ کو مجبور کردیا ہے کہ جو حل بھی موجودہ الجھاؤ کو ختم
کرسکتا ہو اس کو تسلیم کرے، کانگریس کے سامنے یہ سوال نہیں تھا
کہ کون سا منصوبہ منظور کیا جائے، بلکہ سوال یہ تھا کہ گومگو اور غیر اطمینانی

کی موجودہ تباہ کن حالت باقی رہے یا سب سے پہلی فرصت میں اسکو ختم کر دیا جائے، کانگریس متحدہ ہندوستان کے نظریہ سے جدا نہیں ہوئی، لیکن وہ حقِ خود ارادیت کو بھی تسلیم کر چکی ہے جو علاقے یونین میں شامل نہ ہونا چاہیں انھیں مجبور کرنے کے خلاف ہے "

تجویز منظور کر لی گئی

ورکنگ کمیٹی میں کسی ممبر نے اس تجویز کی مخالفت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا البتہ ایک کمزور مگر عزم و یقین کی بھرپور قوت کے ساتھ آواز ابھری جو نیشنلسٹ مسلمانوں کے قابلِ احترام مجاہد کی تھی جس کو قوم احترام کی وجہ سے مجاہدِ ملت کہتی تھی وہ تھے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی انھوں نے اس تجویز کی مخالفت میں ایک مختصر مگر انتہائی گرم تقریر کی آپنے فرمایا کہ:

" حالات کے جس دباؤ اور جن الجھنوں کے باعث آج ہندوستان کی تقسیم کو منظور کر لینے کا مشورہ دیا جارہا ہے، میں اپنے لیڈروں کے پورے احترام کے ساتھ کہوں گا کہ ہندوستان کی تقسیم کا نتیجہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہوگا اور آج اگر کانگریس کے اسٹیج پر تقسیمِ ہند کی اسکیم منظور کر لی گئی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم آج اپنی پوری تاریخ اور ہمیشہ کیلئے اپنے یقین و اذعان پر خود اپنے ہاتھ سے خطِ تنسیخ کھینچ کر اٹھیں گے اور دو قومی نظریہ کے سامنے سرینڈر ہو جائیں گے "

جب پورا ہاؤس ایک تجویز پر متفق ہو چکا ہو، پھر اس کو رد کرا دینا ممکن نہ تھا اس لئے مولانا حفظ الرحمٰن کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی، مخالفت کی اور کوئی دوسری آواز ہاؤس میں نہیں اٹھی، چھ سو ارکانِ ورکنگ کمیٹی میں کسی کو بھی اپنے اصولوں کی شکست کی آواز نہیں سنائی دی، اتنی بڑی تعداد کے مقابلہ میں ایک آواز کیا وزن رکھتی ہے لیکن اس ایک آواز نے اصول پرستی کی آبرو رکھ لی اور انھوں نے کھری سچائی اس ماحول میں بھی پیش کر دی جس کی تائید میں ایک آواز بھی نہیں تھی اسلئے انکی جماعت

جمعیۃ علماء کو یہ اطمینان ضرور ہے کہ وہ اس تباہ کن اور خوں ریز تقسیم کی ہر طرح کی ذمہ داری سے محفوظ رہی ۔

ہندوستان نے آزادی جیت لی

۱۸ ر جولائی ۱۹۴۷ء کو لندن سے ایک نامہ نگار نے ہندوستان خبر بھیجی کہ آج برطانیہ کے حساب سے ٹھیک دس بج کر چالیس منٹ پر برطانوی دارالامراء کے رائل کمیشن نے تزک واحتشام اور شاہی رسوم کے ساتھ جس پر ولیم فاتح کے زمانے سے عملدرآمد ہوتا آرہا ہے ہندوستان کی آزادی پر شاہی منظوری کا اعلان کیا ۔

اس سے پہلے ۱۰ ر جولائی ۱۹۴۷ء کو وزیرِ اعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی نے اعلان کیا تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے گورنر جنرل ہوں گے اور مسٹر جناح پاکستان کے، اس طرح ہندوستان اور پاکستان دو عظیم الشان نوآبادیاں وجود میں آگئیں ۔

کارواں اپنی منزل پر پہنچ گیا

نوے سال کی طویل مسافت طے کرتے ہوئے کاروانِ آزادی ۱۵ ر اگست ۱۹۴۷ء کو ۱۴ - ۱۵ ر اگست کی درمیانی رات کے بارہ بجے اپنی منزل پہ پہونچ گیا، جب پورا ہندوستان محوِ خواب تھا تو ہندوستان کا مقدر جاگ گیا اور ہندوستانی وقت کے مطابق ٹھیک ۱۲ بارہ بجے آل انڈیا ریڈیو سے ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہو گیا ۔

اسیر ادروی
جامعہ اسلامیہ بنارس

۱ - رُول آف انڈین مسلمس ان دی فریڈم مومیمنٹ — شانتی مے رائے صدر شعبۂ قانون سٹی کالج کلکتہ

۲ - دی ادر سائڈ آف دی ماڈل — سرایڈورڈ ٹامسن

۳ - انڈین مسلمس — سرولیم ہنٹر

۴ - رپورٹ پولٹیکل اینڈ سیکرٹ ڈیپارٹمنٹ انڈیا آفس لندن — بحوالہ تحریکِ شیخ الہند (اردو ترجمہ)

۵ - اسبابِ بغاوت ہند — سرسید احمد خان

۶ - تواریخِ عجیب عرف کالاپانی — مولانا جعفر احمد تھانیسری

۷ - سرگذشتِ مجاہدین جلد چہارم — مولانا غلام رسول مہر

۸ - علماء ہند کا شاندار ماضی — مولانا سید محمد میاں

۹ - تاریخِ آزاد ہند فوج — اسرار احمد آزاد

۱۰ - مسلمانوں کا روشن مستقبل — طفیل احمد منگلوری

۱۱ - حیاتِ محمد علی جناح — رئیس احمد جعفری

۱۲ - نقشِ حیات — مولانا حسین احمد مدنی

۱۳ - سیرت سید احمد شہید — مولانا ابوالحسن علی ندوی

۱۴ - پسِ دیوارِ زنداں — شورش کشمیری

۱۵ - سیرت محمد علی — رئیس احمد جعفری

۱۶ - جماعتِ اسلامی اور اسکی دعوت — ابوالاعلیٰ مودودی
۱۷ - مسٹر جناح کی تقریریں — شائع کردہ ادارہ اشاعتِ اُردو حیدرآباد
۱۸ - اسیرِ مالٹا — مولانا سید محمد میاں
۱۹ - علمارِ حق — "
۲۰ - تحریکِ پاکستان پر ایک نظر — مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
۲۱ - پاکستان کیا ہے ؟ — شائع کردہ الجمعیۃ بکڈپو دہلی
۲۲ - تاریخ جمعیۃ علمار ہند — " "
۲۳ - ایسٹ انڈیا کمپنی کے باغی علمار — مفتی انتظام اللہ شہابی
۲۴ - اخبارات و رسائل، ذاتی تجربات و مشاہدات

چند اهم کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
المعجم الوسیط عربی سے عربی لغت	۳۵۰/-	خلافت راشدہ کا عہد زرّیں	۶۵/-
القاموس الاصطلاحی اردو عربی	۸۰/-	خطبات جمعہ وعیدین	۱۶/-
القاموس الاصطلاحی عربی اردو	۹۰/-	دار العلوم دیوبند احیاء اسلام کی عظیم تحریک	۱۳۰/-
القاموس الجدید اردو عربی	۲۰۰/-	دبستان دیوبند کی علمی خدمات	۴۵/-
القاموس الجدید عربی اردو	۱۷۵/-	رواۃ صحابہ	۲۵/-
القراۃ الواضحہ جز اول	۲۰/-	سیرت رسول اعظمؐ	۵۵/-
القراۃ الواضحہ جز دوم	۲۵/-	ماسونیت کیا ہے؟	۳۰/-
القراۃ الواضحہ جز سوم	۳۰/-	حضورؐ نے فرمایا	۱۵/-
شرح القراۃ الواضحہ جز اول	۱۶/-	عظمت اسلام	۶۰/-
شرح القراۃ الواضحہ جز دوم	۲۰/-	صداقت اسلام	۳۵/-
شرح القراۃ الواضحہ جز سوم	۳۰/-	صبر واستقامت کے پیکر	۵۰/-
نفحۃ الادب	۲۵/-	مآثر شیخ الاسلام	۱۴۰/-
شرح نفحۃ الادب	۳۰/-	تاریخ طبری کا تحقیقی جائزہ	۳۵/-
اسلامی آداب	۳۰/-	اخلاق نبویؐ واقعات کے آئینہ میں	۵۰/-
انسانیت کا پیغام	۲۵/-	تفسیروں میں اسرائیلی روایات	۲۵/-
جواہر المعارف اول	۱۵۰/-	تحریک آزادی اور مسلمان	۹۰/-
جواہر المعارف دوم	زیر طبع	تقلید کی شرعی حیثیت	۴۵/-
خدا کا انعام	۲۵/-	شادی اور شریعت	۶۵/-
شرعی نماز	۳۰/-	امام اعظم ابوحنیفہؒ کے حیرت انگیز واقعات	۶۵/-
علمائے احناف کے حیرت انگیز واقعات	۶۵/-		
عبرت کی نگاہ	۱۴/-	اکابر کے مجرب عملیات	۱۲/-
فرد کی اصلاح	۳۰/-	انقلاب توحید	۲۵/-
القاموس الوحید دو جلد	۸۵۰/-	احکام طہارت	۱۲/-
مفتاح الحدیث	۳۵/-	فن اسماء الرجال	۴۵/-
مقالات عثمانی	۱۱۰/-	اسلام کا مکمل نظام طلاق	۵۵/-
سنتوں کی خوشبو	۱۲/-	اسلام اور جدت پسندی	۳۵/-

کتب خانہ حسینیہ دیوبند 247554 یوپی

PRINT ART Delhi Ph. & Fax.: 23634222

Rs 200.00